urdukutabkhanapk.blogspot
سفر نصیب
urdukutabkhanapk.blogspot
مختار مسعود
اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

مختار مسعود

انتساب

تارِ نفَس اور خطِ جادہ

کے نام،

وُہ تارِ نفَس جسے چھیڑا تو اُسے ہم آواز پایا

اور

وُہ خطِ جادہ جس پر چلا تو اُسے ہم سفر پایا۔

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

دیباچہ

سفر اور حضر کی تفریق غلط ، جادہ و منزل کی تقسیم بیکار ، مُسافر اور مقیم کا فرق محض فریب ۔ راہ خود سفر میں ہے ، منزل خود مقصود کی تلاش میں ہے ، سکون بھی ایک مُسافر ہے ۔ بہت سے مُسافر ایک دُوسرے پر سوار بہ یک وقت مختلف سمتوں میں سرگرمِ سفر ہیں ۔ ایک سفر سے دُوسرا سفر یُوں پیوست ہے جیسے ایک روشنی دُوسری روشنی سے مل کر روشن تر ۔

اس کتاب کے دو حصّے ہیں اور ہر حصّہ میں دو مضمون ہیں ، ایک سفری داستان اور ایک شخصی خاکہ ۔ داستان جادہ ہے اور خاکہ سنگِ میل ۔ اس رعایت سے یہ کتاب ایک نوع کا سفرنامہ ہے ۔ ہر عمل سفر ہے اور ہر اعمال نامہ ایک سفرنامہ ہے ۔ ایک روز اُس سفرنامہ کو برسرِعام پڑھ کر یہ طے کیا جائے گا ۔

سفر نصیب ! نصیبِ تو منزلیست کہ نیست

۲۲ ، کوپر روڈ ۔ لاہور
۳۰ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ
۹ نومبر ۱۹۸۰ء

مختار مسعود

فہرس

حصّہ اوّل

برف کدہ اور پس انداز

حصّہ دوم

طرفہ تماشا اور زادِ سفر

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

برف کدہ

یہ ایک ایسے سفر کی داستان ہے کہ جب منزل آئی تو مسافر سواری سے نیچے اترے ہی نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لمحہ بھر کے لیے وہاں رکے بھی نہیں۔ چلتے چلتے کسی نے منزل پر نگاہِ غلط انداز ڈالی اور کسی نے نظر انداز کیا۔ نظر بھر کر دیکھنے والے بھی گو دو چار سہی اس قافلہ میں شامل تھے۔ دور دراز اور دشوار گذار منزل کے گرد چکر لگایا اور سب اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گئے۔ رکتے کیسے اور اُترتے کہاں۔ سفر ہوائی تھا اور منزل برف کدۂ قراقرم کی سب سے اُونچی چوٹی تھی۔ ہوائی سفر میں ہاتھ باگ پر اور پاؤں رکاب میں رکھنے کی شرط نہ مسافروں کے لیے ہوتی ہے اور نہ ان کے خیالات کے لیے۔ سو دونوں محوِ پرواز تھے، فرق سمت اور رفتار کا تھا۔ اس روز طیارہ نے ایک ہزار میل کا سفر ایک دائرہ کی صورت میں کیا، تخیّل کے سفر کا دائرہ البتہ ملکوں اور برسوں پر محیط تھا۔

ایک در بند ہو تو سو کھل جاتے ہیں۔ یہ بات ہوائی سفر پر بالکل صادق آتی ہے۔ اُدھر سیڑھی ہٹی اور دروازہ بند ہوا اِدھر راہی زمین کا رہتا ہے نہ آسمان کا۔ زمین سے فاصلہ بڑھتا چلا جاتا ہے اور آسمان سے کم ہونے میں نہیں آتا۔ ذرا سی دیر

میں اُڑان اتنی اُونچی ہو جاتی ہے کہ چار سُو ایک بے نشان خلا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ غور سے دیکھیں تو اس خلا میں دروازے ہی دروازے ہیں اور سیڑھیاں ہی سیڑھیاں جس دروازے پر چاہیں دستک دیں اور جس دُنیا میں چاہیں داخل ہو جائیں جس سیڑھی پر چاہیں چڑھ جائیں اور جس تارے پر چاہیں جا اتریں۔ ایک روز مسافر جلال و جمال کے دروازے سے داخل ہوا اور سیڑھی اسے ایک برفانی اور نورانی چوٹی پر لے گئی۔ دور تک پھیلے ہوئے سلسلہ کوہ کی برف سے پٹی ہوئی خوبصورت وادیوں اور ڈھکی ہوئی بارُعب چوٹیوں کو ہوائی جہاز کے دریچے سے پہلی بار دیکھا تو پتہ چلا کہ گمراہی میں بے ذوقی اور کفر میں کم نظری کو کتنا دخل ہے۔ اتنے خوش منظر اور پائدار برف کدے کے ہوتے ہوئے لوگ کیوں کر آتش پرست ہو گئے۔ آگ میں وُہ کیا بات ہے جو برف میں نہیں۔ اُس میں حدّت اس میں شدّت، وہ طلائی یہ نقرئی، وہ دُھواں دُھواں یہ اُجلی اور بے داغ۔ اور دونوں معمولات زندگی کے لیے درکار اور کارآمد۔ ایک جنگ میں آتشِ انتقام بھڑکائی جاتی ہے اور دوسری سرد جنگ کہلاتی ہے۔ شعر کا ایک مصرع اگر آتشِ شوق کے ذکر سے شروع ہو تو دوسرا آہِ سرد پر ختم ہوتا ہے۔ رزم ہو کہ بزم اگر آگ لازم ہے تو یخ ملزوم۔

واقعات میں خیالات کی تونگری کہاں اور شعور میں شوق کی ثروت کہاں۔ واقعہ یک زمانی ہوتا ہے، سو رات گئی بات گئی۔ خیال پر کوئی ایسی بندش نہیں۔ جب چاہا اور جہاں چاہا بات دُہرالی، تذکرِ مکرر کا مزہ لیا اور رات پھر سے سجالی۔ کچھ ایسا فرق شعور اور شوق میں بھی ہوتا ہے۔ جو شے وہاں غائب وہ یہاں موجُود اور ارزاں، جو بات وہاں محال وہ یہاں ممکن اور آسان۔ یہی وجہ ہے کہ برف کدہ

کا وہ سفر جو مسافر نے صرف ایک بار کیا تھا شوق نے خیال کے وسیلہ سے اسے بار بار طے کیا ہے۔ آج پھر وہ از سرِ نو اس سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔

اِس سفر کا انتظام سرکاری ہے اور نام ہوائی سفاری ہے۔ پہاڑوں کا یہ طائرانہ سفر اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کے سلسلہ میں آتے ہوئے بیرونی صحافیوں کے اس طائفہ کے لیے ہے جو کام ختم کر کے واپس جا چکا ہے۔ نشستیں فاضل ہیں اور انہیں پُر کرنے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ میلہ کا منظر ہے۔ طرح طرح کے لوگ حتّٰی کہ طرحدار لوگ بھی اِس بھیڑ میں شامل ہیں۔ سفر سے پہلے جو چہل ہوتی ہے وہ معمول سے بڑھی ہوئی ہے کیونکہ بلاوے والے عام مہمانوں میں بن بلائے خاص مہمانوں کی کھیپ شامل ہو گئی ہے اور اِن دونوں کی تعداد کل نشستوں سے کچھ زیادہ ہے۔ واقفِ حال یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ نشستیں جن پر بیٹھ کر اس سفر کا لُطف لیا جا سکتا ہے تھوڑی سی ہیں، باقی محض خانہ پری ہے۔ جہاز کی چار وسطی قطاریں اس قسم کی نظارگی کے لیے ناکارہ ہیں۔ دو تہائی نشستیں جو دونوں جانب دریچوں کے ساتھ ہیں ان کی نصف بھی اس رعایت سے نامناسب ہیں کہ جہاز کے انجن اور شہپر نگاہ کا راستہ روک لیتے ہیں۔ لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ جسے موزوں دریچہ سے لگ کر بیٹھنے کا موقع ملے گا وہ کم نگاہی کا شکار نہیں ہو گا۔ دلوں کا حال خدا جانتا ہے مگر نظارۂ کوہ کے لیے جمع ہونے والے اِن معزز مہمانوں میں بہت سے چہرے میدانوں کی طرح سپاٹ ہیں۔ مسافر کو اس ہجوم میں اب تک صرف ایک چہرہ ایسا نظر آیا ہے جس کی شہرت اور اس سفر کی نوعیّت دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک کوہ پیما کا چہرہ ہے جو اس سفر کے مبصّر ہیں۔ ان کا رواں تبصرہ

پرُجوش ہوگا کیونکہ یہ دو سلسلوں پر بڑے انہماک سے گفتگو کرتے ہیں، ایک سلسلہ بیعت اور دوسرا سلسلۂ قراقرم۔ اعلان ہوا، انتظار کی گھڑی ختم ہوئی۔ لوگ ہوائی جہاز کی طرف روانہ ہوتے۔ جہاز میں سب سے پہلے ایک خوش نوا شاعر داخل ہوئے۔ دوسرے مسافر انہیں دور سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ انتظار گاہ میں جب ہر ایک کی ٹکٹکی شیشہ کی دیوار کے پار جہاز پر بندھی ہوئی تھی اس وقت یہ تجاہل شاعرانہ کے ساتھ اُدھر پشت کیے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں محکمہ سیاحت کے سربراہ کی چشم و ابرو پر لگی رہیں جن کی جنبش پر روانگی کا دار و مدار تھا۔ یہ اشارہ پاتے ہی جہاز کی طرف یوں گنگناتے ہوئے روانہ ہو گئے گویا فکرِ سخن میں غلطاں ہوں۔ جب تک باضابطہ اعلان ہوا وہ دوسرے مسافروں سے بہت آگے نکل گئے۔ کوئی بڑھ کر ان کی اچکن کا دامن نہ تھام سکا جو ہوا میں بحرِ طویل کی طرح لہرا رہا تھا۔ سیاست ہو کہ سفر، اقتدار کی مسند ہو کہ جہاز کی نشست یا کرسی کے حصول کے اصول یکساں ہوتے ہیں۔ جہاز میں داخل ہو کر بھی مسافروں کو چین نہ آیا۔ کوئی آگے یا پیچھے بیٹھنے کے فوائد بیان کر رہا ہے اور کوئی دائیں اور بائیں بازو کی بحث میں اُلجھا ہوا ہے۔ وہاں پیش و پس، یہاں چنیں و چناں۔ بعض مسافر محرموں کے ساتھ بیٹھنا چاہتے اور بعض نامحرموں کے ساتھ۔ ادھر دوستی کا دعوےٰ اور کشش، ادھر ہوس کا جواب دعویٰ اور بہکاوے۔ سب متذبذب نظر آتے ہیں۔ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر تذبذب لاحق نہ ہوتا تو ہر شخص خدائی کا دعوےٰ کر بیٹھتا۔ بیچارگی بشریت کی پہچان ٹھہری اور بے نیازی مشیّت کا خاصہ۔

خدا خدا کر کے جہاز روانہ ہوا۔ پرواز ابھی بہت نیچی ہے۔ سگریٹ نوشی سے پرہیز اور حفاظتی بند باندھنے کے برقی اشارے ابھی روشن ہیں۔ اطمینان کا سانس

بھی نہیں لیا، کسی سے بات بھی نہیں پوچھی کہ اعلان کی رو سے اس سفر کا پہلا قابل دید مقام آ گیا ہے۔ مسافر نے دریچہ سے جھانکا، اسے منظر اور پس منظر دونوں نظر آئے۔ یہ نیچے ذرا سا نیچے، تربیلا بند ہے جو تکمیل کے آخری مراحل میں ہے اور پیچھے، بہت سالوں پیچھے، دوسری جنگ عظیم ہے جو ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔

یہ ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کی بات ہے، ہٹلر کے جرمنی نے ملکہ ولہلمینہ کے ہالینڈ پر حملہ کیا۔ پانچ دن میں ہالینڈ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ان دنوں ہٹلر کی فوجیں ملک پر ملک فتح کیے جا رہی تھیں۔ میدان جنگ میں ہر کامیابی ان کے لیے نئے اعزاز اور نئے علاقے اور نئے دشمن ہمراہ لا رہی تھی۔ ملکہ تو انگلستان چلی گئیں اور تحریک مزاحمت کے کارکن زیر زمین چلے گئے۔ جیتنے والوں نے ہالینڈ کا انتظام آرتھر وان سیس انکوارٹ کے سپرد کیا۔ انہیں ہاری ہوئی قوموں پر بالجبر حکومت کرنے کا وسیع تجربہ تھا کیونکہ آسٹریا کی شکست کے وقت یہ ہٹلر کے معاون تھے اور پولینڈ کی شکست کے بعد وہاں کے نائب گورنر جنرل۔ آرتھر نے اپنا کام بڑی نرمی اور فریب سے شروع کیا اور اپنے پیرہ جماتا اور جال پھیلاتا چلا گیا یہاں تک کہ چند ہفتوں میں انتہائی سخت گیری اور شکنجہ گری تک پہنچ گیا۔ تحریک مزاحمت کو اس سختی سے بڑا نقصان پہنچا اور بڑی تقویت ملی۔ جانوں کا نقصان ہمیشہ تحریکوں کے لیے زندگی کا پیغام ہوتا ہے۔ شہید قلب تاریخ است۔ عام فہم بات ہے جو سب کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ایک نوشتۂ دیوار ہے جسے سب پڑھ لیتے ہیں۔ مگر تاریخ کے ہر موڑ پر حقیقت خود پسند نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ تحریر موڑ کے ایک طرف ہوتی ہے اور صاحب اقتدار دوسری طرف۔ آرتھر کا انجام جو ہوا سو ہوا مگر جن دنوں ہالینڈ پر اس

کی حکومت تھی، وہاں ہزاروں لوگ مارے گئے اور لاکھوں پکڑے گئے۔ جو ولندیزی قیدی بیگار کیمپوں میں بھیجے گئے صرف ان کی تعداد دو لاکھ تھی۔ ان قیدیوں میں معاشیات کا ایک نوجوان پروفیسر بھی شامل تھا جس کا نام ڈاکٹر پیٹر لیفٹنک تھا۔ بیگار کیمپ میں ہر طرح کی مشکل اور مشقت تھی۔ جگہ تنگ، کھانا ایک وقت، کپڑے وہی جو تن پر ہوں، سونا خاک پر، موسم سخت اور صیاد اس سے کہیں زیادہ دُرشت۔ کیمپ میں سزا اکثر ملتی تھی اور انعام کے لیے غداری کی شرط تھی۔ بیگار کیمپ کا کوئی مستقل ٹھکانہ بھی نہ تھا، آج یہاں تو کل وہاں۔ جہاں ضرورت پڑی وہاں یہ مصیبت کے مارے ہانک کر لے جائے جاتے۔ مسلسل ایک سفر جس میں قیدی سامان اٹھا کر پیدل چلتے اور دھول پھانکتے، محافظ سوار ہوتے اور دھول اڑاتے۔ ڈاکٹر لیفٹنک کے ساتھ ان کے بہت سے دوست اس قید میں شریک تھے۔ جرم ایک مگر قید میں رہنے کا انداز مختلف۔ یہ ہم عمر قیدی دوست صبح اٹھتے تو اس خوف کے ساتھ کہ یہ ان کی زندگی کا آخری دن ہے اور رات سوتے تو یہ آس لگائے ہوئے کہ جنگ راتوں رات ختم ہو جائے گی۔ دنیا کے حقائق اور زندگی کے حوصلہ بخش معمولات سے ان کا تعلق کٹ گیا۔ ان کے اعصاب پر صرف ایک ہی خیال سوار تھا کہ یہ قید کب ختم ہو گی۔ اعصاب کتنے برس اس سوار کو اٹھائے رکھتے، ان کی ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر لیفٹنک کے بیشتر دوست نڈھال ہو کر مر گئے، کچھ سزا کے طور پر مارے گئے، چند بچے تو وہ پہیہ والی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ ڈاکٹر لیفٹنک نے بیگاری بنتے ہی صورت حال پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جنگ طویل اور صبر آزما ہو گی، اسے ختم ہونے میں کئی سال لگیں گے۔ موت ہو کہ رہائی وہ خود چل کر میرے پاس آئیگی،

مجھے اس کے انتظار میں روز و شب کا حساب رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں جینا اور جیتنا چاہتا ہوں۔ مجھے حوصلہ درکار ہے اور وہ بھی صرف ایک بات کا، وقت کاٹنے کا حوصلہ۔ پھر کئی برس تک ڈاکٹر لیفتنک نازی فوج کی بیگار میں مختلف محاذوں پر خندہ پیشانی سے خندقیں کھودتے رہے۔ ان کو کپڑے کا ایک تھیلہ اور ٹین کا ایک ڈبہ رکھنے کی اجازت مل گئی۔ اعتبار بڑھا تو لوازمات میں کاغذ اور پنسل کا اضافہ ہو گیا۔ اس اضافہ کے بل بوتہ پر وہ معاشیات کی ایک کتاب لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ ورق ورق لکھ کر ٹین کے ڈبہ میں ڈالتے رہے۔ ڈبہ کے بھرنے میں چار سال لگے، اور اس کے بھرتے ہی جنگ ختم ہو گئی۔ کتاب چھپی اور نصاب میں داخل ہو گئی۔ مصنّف کابینہ میں شامل ہو کر وزیرِ خزانہ ہو گئے۔

واشنگٹن میں ایک رات ڈاکٹر پیٹر لیفتنک کے گھر دعوت تھی۔ وہ ان دنوں عالمی بنک سے وابستہ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے ٹھنڈے اور سنجیدہ آدمی شمار ہوتے تھے۔ اس رات انہوں نے مسافر کو ساتھ بٹھایا اور عمرِ رفتہ کو آواز دی۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کے ان تمام تجربات کو ہمراہ لے کر آ گئی جو صرف ایک گرم جوش اور حساس آدمی کے حصے میں آتے ہیں۔ مسافر کو تعجب ہوا کہ سال بھر کی سرکاری شناسائی کے دوران اسے کبھی اس شخص کا سراغ بھی نہ ملا جو اس رات کھانے پر نظر آیا۔ ڈاکٹر لیفتنک عالمی بنک کے ایک خصوصی جائزہ وفد کے قائد تھے جو دریائے سندھ پر بند باندھنے کے سلسلہ میں پاکستانی اصرار کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ بلحاظِ عہدہ مسافر بھی اس بحث میں شریک ہو گیا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور بہت سفر کیا۔ راہ میں کئی دلچسپ مقام اور اشخاص آئے۔ سکردو، چیلاس،

یو بجی اور کوٹ کاتی۔ ڈاکٹر لیفٹننٹ، سادو، وہگل، اور رائٹ۔ اجلاس جا بجا ہوئے۔ واشنگٹن، نیویارک، بوسٹن، لندن، لاہور اور تربیلا۔ وہی تربیلا جس پر اس وقت ہوائی سفاری پرواز کر رہی ہے۔ وہی تربیلا جس نام کے غلط تلفظ نے لندن کے ایک اجلاس میں اس طالب علم کی تسکین کا سامان مہیا کیا جو غیروں کے نامانوس ناموں کے صحیح تلفظ اور ہجے اور بدیسی تلمیحات اور تمثیلات کو یاد کرنے کی کوشش میں بچپن کی کئی معصوم خوشیاں قربان کر چکا تھا۔ اب وہ غیر ملکی مزاح کو بھی تھوڑا بہت سمجھ لیتا ہے اور گاہے غیر ملکی تلفظ پر بھی ہنس لیتا ہے تاکہ اسکول میں کھوئی ہوئی ہنسی کی تلافی کر سکے۔

ہوائی جہاز نے ایک طرف جھک کر تربیلا کا چکر لگایا۔ یہ مٹی کا لمبا چوڑا اور اونچا بند ہے۔ ایک ذرا سے حصہ میں خلا ہے جسے اب پُر کر رہے ہیں۔ یہ بند کی تعمیر کا آخری مرحلہ ہے۔ چند سال ہوئے دریا کے دائیں کنارے ایک چھوٹا سا بند بنایا تھا جس میں کئی دروازے تھے۔ پہلے دریا کا رخ موڑ کر اسے ان دروازوں سے گذارا۔ پھر دریا کا پاٹ خالی ملا تو اس پر بڑا سا بند باندھ دیا اور پہاڑیوں میں لمبی لمبی سرنگیں کھود ڈالیں۔ اس کے بعد چھوٹے بند پر اتنی مٹی ڈالی کہ وہ اس کے نیچے دفن ہو گیا۔ ابھی اور مٹی ڈالیں گے یہاں تک کہ اس کی سطح بڑے بند کے برابر ہو جائے گی۔ پانی کا رُخ ذرا دائیں جانب سرکا دیا ہے جہاں دو پیاسی سرنگوں کے دہانے اوک لگائے دریائے سندھ کو غٹاغٹ پی رہے ہیں۔ کبھی دریا یہاں سے دیوانوں کی طرح گذرتا تھا منہ میں کف اور گریبان لیر لیر۔ اب جنون کو افاقہ ہے۔ ایک پُرسکون چھوٹی سی جھیل بن گئی ہے۔ دریا اسی جھیل کے پنگھوڑے میں پڑا سو رہا ہے۔ تربیلا تک یہ الھڑ دھارا بلا روک ٹوک چلا آیا مگر یہاں بند نے اس کا راستہ روک کر اسے کفایت اور کفالت کی نئی راہ پر ڈال دیا

ہے۔ اب اسے لہر لہر کے لیے جواب دینا ہوگا اور قطرہ قطرہ کا حساب رکھنا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان سے وقت کے دھارے اور اس کے لمحہ لمحہ کا حساب مانگا جائیگا۔ دریا اور زندگی دونوں پر بند باندھنا پڑتا ہے تاکہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند درکار ہے اور پیکرِ خاکی کو ضبط کا مضبوط بند۔ بلوچستان میں بہت سے پہاڑی ندی نالے ہیں جو چڑھتے تو بڑے زور شور سے ہیں مگر صرف ذرا سی دیر کے لیے اور تھوڑی دور تک۔ پٹ تک پہنچتے پہنچتے وُہ اتنے رقبہ پر پھیل جاتے ہیں کہ سارا زور ٹوٹ جاتا ہے اور وُہ میدان پار کرنے سے پہلے ہی خُشک ہو جاتے ہیں۔ مسافر نے بہت سی باصلاحیت جوانیوں کو بلوچستان کے نالوں کی طرح چڑھتے اور سُوکھتے دیکھا ہے۔ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا اصول دولت، دریا اور جوانی تینوں پر بلا استثنا عائد ہوتا ہے۔

ہوائی جہاز نے دوسری طرف جھک کر تربیلا کا چکر لگایا۔ تصویر کا نیا رُخ سامنے آیا۔ پہاڑوں کی بلندیوں سے اترا ہوا برف کا پانی اتنی دور آ کر اس جھیل میں جمع ہو رہا ہے۔ یہاں سے وہ ایک اور طویل سفر پر روانہ ہو جائے گا۔ جھیل اِن دنوں پایاب ہے۔ کل یہ بھر جائے گی۔ پھر رابطہ نہروں کے باریک بُنے ہوئے جال اور زیر زمین آبی ذخیروں کے پیچیدہ نظام کی بدولت اس جھیل کا پانی دور دراز کے خشک علاقوں کو سیراب کرے گا۔ وہاں نئی فصلیں اور نئی نسلیں پیدا ہونگیں۔ فرد اور معاشرہ دونوں بدل جائیں گے۔ خانہ بدوش کاندھے سے گھر اتار کر زمین پر رکھ دے گا۔ سادگی کی جگہ پرکاری لے گی۔ مویشیوں کی جگہ مشینیں نظر آئیں گی۔ کیچڑ نچوڑ کر پینے والے گھاٹ گھاٹ کے مشروبات پیئیں گے۔ اُلٹی کھال کی دیسی جوتی کی نسل در نسل کھلی رہنے والی دکان

بند ہو جائے گی، درِ فتنہ باز ہوگا، عداوتیں اور عدالتیں بڑھ جائیں گی، خشک زمین سیراب ہو کر ستر پوش ہو گی، انسان خوشحال ہو کر عریاں ہو گا۔ اسباب و انجام کا نظام آبپاشی کے نظام سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ فرد، معاشرہ اور ملک کٹھ پتلی کی طرح اسباب کے دھاگوں سے بندھے ہوتے ہیں۔ کچھ دھاگے اتنے باریک ہیں کہ نظر نہیں آتے، کچھ اتنے گنجلک ہیں کہ دُوسرا سرا نہیں ملتا۔

مسافر نے تربیلا کی پایاب جھیل پر ایک نظر ڈالی۔ آنے والی برسات میں یہ بھر جائے گی۔ تعمیراتی سامان کا ملبہ اور ناکارہ مشینوں کے ڈھانچے پانی کی زد میں آنے والے ہیں۔ اُجاڑ کھیت، خالی گھر اور سنسان بستیاں سب جھیل کی نذر ہو جائیں گی۔ کچی پکی سڑکوں کا جال جو تعمیر کے دوران بنا تھا اب تہہ میں بیٹھنے والا ہے۔ کل بہت سی یادیں جو اس وادی اور اس بند سے وابستہ ہیں ایک بڑی اور گہری جھیل میں ڈوب جائیں گی۔ ڈوبتے کو بچانا فرض ہے اور مسافر ایک چھوٹی سی عمارت کے سلسلے میں یہ فرض پورا کرنا چاہتا ہے۔ جھیل کی سطح اس عمارت کی چھت سے بلند ہو چکی ہے۔ نظریں پانی کی بے نشاں سطح پر اس مقام کو ڈھونڈ رہی ہیں جہاں کبھی ایک ڈاک بنگلہ ہوا کرتا تھا۔ دس برس ہوئے مسافر اس عمارت میں دو چار دن ٹھہرا تھا۔ وہ چھوٹا سا بنگلہ جنگل میں یوں کھڑا تھا جیسے ایک خوشنما کھلونا جسے کوئی بچہ دریا کے کنارے بھُول آیا ہو۔ سفید عمارت جس کے برآمدہ کی محرابیں سفید رنگ کی جالی سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ دور سے عمارت ایسے لگتی جیسے کسی کاٹیج کی فریم کی ہوئی تصویر وادی میں آویزاں ہو۔ تین چھوٹے چھوٹے کمرے، فرش پر کم قیمت اور سادہ قالین۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ کا ایک صوفہ بھی تھا، اس پر بیٹھتے ہی آدمی ماضی کی وسیع اور نرم آغوش میں گم ہو جاتا۔ جہاں سے اب ملک بھر میں بجلی

فراہم کی جائے گی وہاں ان دنوں چراغ شام کی لو اٹھانے کے لیے مٹی کا تیل استعمال کرتے تھے۔ سہ پہر کو صاحب لوگ کے لیے باغ میں آرام کرسیاں لگ جاتیں اور ملازم دودھیا شیشہ کی چمنیوں سے دھوئیں کی کالک چھڑانے میں مصروف ہو جاتے۔ وادی کا سارا حُسن اس ڈاک بنگلہ کے پائیں باغ میں اُمڈ آیا تھا۔ عمارت کی کرسی باغ سے گز بھر اونچی تھی مگر دریا کی سطح باغ کے بالکل برابر تھی۔ باغ اور دریا کی حد بندی پھولوں سے لدی پھندی کیاریوں نے کی ہوئی تھی۔ سبزہ پر بیٹھ کر دیکھا تو سطح آب پر پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغرب کی نماز پڑھی تو یوں لگا جیسے سجدہ آبِ رواں پر کیا ہو۔

جھک کر جھیل کے دو چکر لگانے کے بعد ہوائی جہاز نے رُخ سیدھا کیا اور شمالی پہاڑیوں کی طرف اڑنے لگا۔ دریا کے اس پار چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا بے ترتیب سلسلہ ہے۔ ان کے وسط میں ایک بہت بڑا میدان نظر آ رہا ہے۔ پہاڑیاں سبز اور سیاہ ہیں لیکن میدان سفید اور خاکستری۔ پہاڑیوں پر جھاڑیاں اور جھنڈ ہیں لیکن میدان گنجا اور ننگا۔ پہاڑیاں پرانی ہیں اور میدان نیا۔ یہاں اس میدان کی موجودگی بالکل اوپری لگتی ہے۔ آخر پہاڑیاں اس جگہ پہنچ کر یکایک چار یا پانچ میل پرے کیوں ہٹ گیئں، جیسے کسی نے ہاتھ کے ایک اشارے سے انہیں بزم یار سے اُٹھا دیا ہو۔ اس میدان میں مختلف گہرائیوں کے چوکور قطعے بنے ہوئے ہیں۔ پہلی نظر میں یوں لگا جیسے کسی نے کروشیے سے بُنی ہوئی چادر دھو کر پہاڑیوں کے درمیان سوکھنے کے لیے پھیلا دی ہے۔ جہاز اُونچا ہوا، منظر اور تشبیہہ بدل گئی۔ دوسری نظر میں یوں لگا جیسے کسی نے شالامار بنانے کے لیے زمین کو درجہ بدرجہ تراشا ہو۔ یہ نامکمل شالامار بھی خوبصورت لگا۔ ایک ایک کر کے اس کے مختلف طبقے نظر سے اُوجھل ہو گئے۔ جیسے

وہ پہاڑیاں جو کل تک اس میدان میں جمی کھڑی تھیں اور یکے بعد دیگرے اس ملبہ میں گم ہو گئیں جس سے تربیلا بند کی تعمیر ہوئی ہے۔ جہاز آگے نکل گیا ہے اور میدان پیچھے رہ گیا ہے۔ منظر ہر لحہ بدلتا رہتا ہے۔ کل اس میدان کی صورت بھی نہ پہچانی جائے گی۔ کل اس نشیبی قطعہ پر قبضہ جمانے کے لیے مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ اس مقابلہ میں ہوا اور پانی، مٹی اور سبزہ، جانور اور انسان سب حصّہ لیں گے۔ پہلے اس میں بارش کا پانی جمع ہوگا، کہیں دلدل بنے گی اور کہیں تالاب۔ سائبیریا سے مرغابیاں آئیں گی اور کسی نہ معلوم جگہ سے مچھلیاں اور مینڈک۔ جو رقبہ کھڑے پانی کی مار سے بچ رہا اس میں سبزہ اپنے پیر جمائے گا۔ نرم خود رو سبزہ کے تعاقب میں سخت جان جھاڑیاں اور خودسر درخت آئینگے۔ جنگل گھنا ہوا تو درندہ پناہ لینے اور آدمی لکڑی لینے کے لئے آنکلے گا۔ ہوا اور پانی دوسری پہاڑیوں کی مٹی ڈھو کر یہاں ڈالتے رہیں گے اور ایک نہ ایک دن اسی نشیب پر فراز کا قبضہ ہوگا۔ زمین کو ایک حالت پر قرار نہیں۔ اس کا نقشہ ہر دم بدلتا رہتا ہے۔ منظر کبھی ایک جگہ قیام نہیں کرتا، اس کی زندگی بس ایک جھلک تک ہے۔ اس کے بعد دوسرا منظر اس کی جگہ لے لیتا ہے اور تیسرا تعاقب میں ہوتا ہے۔ مناظر میں تسلسل ہوتا ہے تکرار نہیں ہوتی۔ ہر منظر جدید اور جدا ہوتا ہے۔ سمندر کی سطح لحہ بھر کے لیے بھی یکساں نہیں رہتی۔ صحرا میں ہر روز ایک نیا ریگزار جنم لیتا ہے۔ جہاں آج پہاڑ نظر آتے ہیں وہاں کبھی سمندر رہا کرتا تھا۔ آج جو پہاڑ میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں کل وُہ روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے۔

اس وقت ہوائی سفاری کا بوئنگ سات سو سات بھی روئی کے گالے کی مانند بادلوں میں اُڑ رہا ہے۔

تربیلا کو پیچھے چھوڑے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ ہوائی جہاز سلسلہ کوہ کی کوہان کو پار کر کے ایک وادی میں جا نکلا۔ آج یوں چشم زدن میں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ فاصلہ کے بارے میں مسافر کے سارے خیالات ناقص اور فرسودہ تھے۔ فاصلہ قدموں میں نہیں ذہن میں ہوتا ہے۔ یہ محض ایک حجاب کا نام ہے، اٹھ گیا تو ساری مسافت فوراً کٹ جاتی ہے۔ مسافر جب پہلی بار اس وادی میں داخل ہوا تو اسے سفر میں پورے دو دن لگے تھے اور دو جگہ رک کر داخلہ کا اجازت نامہ دکھانا پڑا تھا۔ یہ وادیٔ سوات ہے۔ ان دنوں گمنام اور بہت خوبصورت تھی۔ آج مشہور اور پامال ہے۔ شہرت کا ایک نقصان وہ ہوتی ہے کہ جس خوبی کی وجہ سے حاصل ہو اُسی کے زوال کا باعث بن جاتی ہے۔

سوات ایک دیسی ریاست تھی۔ اس لیے صرف ایک تنگ اور کچّا راستہ اندر داخل ہوتا اور اسے بھی پھاٹک لگا کر سرِ شام لنڈاخی پر بند کر دیتے۔ بحرین پر وہ کچی شاہراہ ختم ہو جاتی اور اس کے بعد پگڈنڈیوں کی صورت راستہ کی جڑیں پہاڑوں میں جا بجا پیوست ہو جاتیں۔ سیدو اور منگورا دو علیحدہ گاؤں تھے جن میں ایک خراب خستہ مسافر لاری کے در آنے سے رونق آ جاتی۔ نئے زمانہ کے قدیم آثار میں وہ ٹیلیفون شامل تھا جس کی تار درختوں پر پڑی جھولتی رہتی محض ایک یادداشت کے طور پر کہ اس ریاست کا ایک والی بھی ہے۔ یوں کہنے کو ریاست میں بادشاہ صاحب بھی تھے اور ولی عہد بہادر بھی۔ وہ کس نی پرسد کے دن تھے۔ ٹھکیلوں پر کوئی روک ٹوک نہ تھی، نہ حکمرانوں کے لیے اور نہ فطرت کے لیے۔ گرمیوں میں دریا وادی کو گھیر لیتا اور سردیوں

میں وادی دریا کو دبوچ لیتی۔ آدمی ان دونوں کے کھیل میں ابھی حائل نہ ہوا تھا۔ وسطی وادی اس کے ہاتھوں سے محفوظ تھی، بغلی وادیوں تک اس کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ پانی کا راستہ کسی نے روکا نہ تھا۔ اس پر پل بھی صرف دو چار ہوں گے اور وہ بھی چرچراتی لکڑی کے۔ مشک پر سوار ہو کر پار جانے والے نظر آجاتے تھے۔ لکڑیاں اونٹوں پر لادی جاتی تھیں اس لیے جنگل گھنا تھا۔ جنگل میں پشمی جانوروں کے گھنے ریوڑ ہوا کرتے تھے۔ ایک گود میں اپنا بچہ اور دوسری میں بکری کا بچہ لے کر سفر کرنے والے چرواہے مل جاتے تھے۔ نئے آدمی کو دیکھ کر عورتیں ٹھٹھک جاتیں اور جانور بدک جاتے۔ پن چکیوں کے پتھر کی رگڑ سے نکلنے والی یک سری آواز گرتے بہتے پانی کے جل ترنگی شور میں دب جاتی۔ دن بڑے آرام سے چڑھتا اور سہج سے ڈوب جاتا۔ رات کی خامشی میں ایک انجانی خوشبو اور خوشی شامل ہوتی۔ مسافر اور شریکِ سفر نے باہمی زندگی کا آغاز اسی دل آرام وادی سے کیا تھا۔

سوات اب بالکل بدل گیا ہے۔ سیدو اور منگورا مل کر ایک شہر بن گئے ہیں۔ لکڑی کی جگہ کنکریٹ کے پل بن گئے ہیں۔ سڑکیں پختہ ہو گئی ہیں اور ایک سڑک سیدھی چین تک چلی جاتی ہے۔ بجلی بھی آگئی ہے اور کارخانے بھی لگ گئے ہیں۔ بیشتر کارخانے ریشمی کرگھوں کے ہیں مگر چینی کی مٹی صاف کرنے کا کارخانہ بھی موجود ہے۔ مسافر جو اس سرکاری کارخانہ کے قیام کے سلسلہ میں جاپان تک گیا تھا اس نے مقدور بھر کوشش کی کہ شاہ ڈھیری میں اس تعمیر سے وادی کے حسن میں فرق نہ آنے پائے۔ اُدھر بہت سے اہلِ غرض اِس کام میں جتے ہوئے تھے کہ وادی کے ہر غیر معمولی منظر کو ایک عام منظر میں بدل کر دم لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کالام اور

گبرال اب پہچانے نہیں جاتے۔ کالام چاروں طرف سے اُونچے اور چوڑے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک تنگ اور گہری وادی ہے۔ جس میں اوشو اور اترور آکر ملتے ہیں۔ مغرب کی جانب جو پہاڑ واقع ہے اس میں نصف مربع میل کی ایک قدرتی مچان سی بنی ہوئی ہے جس کی انوکھی ساخت اس منظر کا خاصہ ہے۔ اس سپاٹ مچان پر پہاڑ سے پشت لگائے سبز رنگ کا لکڑی کا صرف ایک کیبن ہوا کرتا تھا، اس میں بیٹھ کر کوہ فلک سیر کی ساڑھے انیس ہزار فٹ بلند برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی کا نظارہ بڑا دلفریب لگتا تھا۔ یہ چٹان قدر دانوں کی نظر میں ہوتی تو اس کی تصویر ڈاک کے ٹکٹوں پر چھاپی جاتی۔ لیکن کالام میں کسی نے اس سطح مُرتفع کو قطعات میں تقسیم کیا اور ان کی نیلامی بول دی۔ اب وہاں نجی، سرکاری اور تجارتی عمارتیں بن گئی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک بدوضع اور بدرنگ، ساری کی ساری بے محل اور بے موقع۔ خوش منظری کا تقاضہ یہ ہے کہ فطرت کو مگن رہنے دو، اسے مت چھیڑو۔ بس منظر کے قطر پر کہیں باہر کی جانب ایک جگہ ٹک دیکھ کر دل شاد کرنے والوں کے لیے بنا دو۔ گمراہی کا مطالبہ کہ موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ جلد از جلد منظر کے اندر بے دھڑک بے وضو جوتے پہنے داخل ہو جاؤ۔ تقاضے ہار جاتے ہیں اور مطالبے جیت جاتے ہیں۔ حرص اور بے ذوقی جگہ جگہ اپنی یادگاریں بنا لیتی ہے۔

ایک دن مسافر اور محبوب حسن گبرال کی ننھی منی وادی میں جا نکلے۔ ستمبر کے آخری دن تھے اور گبرال میں دو موسم اترے ہوئے تھے۔ دھوپ میں بہار اور چھاؤں میں سرما۔ ہمراہی کی طبیعت شروع سے دھوپ چھاؤں رہی ہے، وہ مچل گئے کہ برف سے ذرا نیچے جو نالہ بہہ رہا ہے اس میں غسل کیا جائے۔ مسافر نے انہیں یاد

دلایا کہ ایک بار گرمیوں میں وہ دونوں بلا اجازت جنگل کے راستہ کاکس بازار (مشرقی پاکستان) سے اراکان (برما) گئے تھے۔ واپسی میں مشرقی پاکستان کے ایک گمنام دریا کو تیر کر پار کرنے کا پروگرام بنایا۔ مسافر نے دریا میں چھلانگ لگا دی اور وہ ٹھنڈ کے ڈر سے اس کشتی میں سوار ہو گئے جو جیپ کو پار لے جا رہی تھی۔ کہنے لگے بات موسم کی نہیں وقت کی ہوا کرتی ہے۔ کبھی گرمیوں میں سردی لگتی ہے اور کبھی سردیوں میں گرمی۔ مسافر نے کہا میں بھی وقت کی بات کر رہا ہوں۔ جب سے میں نے بچپن میں سنا اور پڑھا کہ بابر نے راہ میں آنے والے ہر دریا کو تیر کر پار کیا تھا اس دن سے جو خواہش دل میں مچل رہی تھی وہ نوجوانی کی صورت مشرقی پاکستان کے دریا میں کود پڑی اس بات کو گذرے ہوتے کئی سال ہو چکے ہیں۔ اب وقت خلاف ہے۔ موسم اور مقام بھی ساتھ نہیں دیں گے۔ یہ دَور بابری خواہشات پورا کرنے کے لیے نامناسب ہے۔ سننے والے من موجی نے بات ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی۔ نہانے کے سارے لوازمات غیر حاضر تھے۔ عمر، موسم، کپڑے اور تولیہ۔ صرف آبِ رواں موجود تھا اور اس میں شمشیر کی تیزی تھی۔ کوٹ پتلون درخت کے نیچے اتار کر رکھ دیئے اور باریک زیر جامہ پہنے دونوں پانی میں اتر گئے۔ نالے میں کودتے ہوئے ان میں سے ایک نے گنگنایا ع بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔ آدھا مصرعہ ادا ہوا تھا، آدھا دھڑ پانی سے باہر تھا کہ مصرعہ اور صاحبِ مصرعہ دونوں سکتہ کا شکار ہو گئے۔

مسافر کو گیرال اتنا بھایا کہ وہ بار بار وہاں آتا جاتا رہا۔ وہ پچھلے دنوں بھی گیا لیکن اب دیر تک وہاں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس مرتبہ دو گھرانے بل کر شام کو گیرال پہنچے۔ یعنی وادی کی اس حدِ آخر پر ان کا قیام اس مدت سے بھی کم

ہو گا جو مسافر نے اس کے برفیلے چشموں میں نہاتے گذاری تھی۔ ہو کا عالم اور "ڈرونا سناٹا" کہہ رہا تھا کہ چند دن پہلے دو سیاح اسی راہ میں لُوٹے اور مارے گئے ہیں۔ کسی واقفِ حال سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے اس نے جواب دیا، پہلے ریاست چھوٹی سی تھی اس لیے ہر چھوٹی بات پر اس کی نظر رہتی تھی۔ اب حکومت بڑی ہے سو اسے بڑی باتوں سے کہاں فرصت کہ چھوٹی ضرورتیں پوری کر سکے۔ مسافر کو اس کی فراست اور فرہنگ پر تعجب ہوا۔ وہ دورِ بے اماں میں جان کی حفاظت کو چھوٹی ضرورتوں کی فہرست میں شامل کرتا ہے مسافر نے کہا، معلوم ہوتا ہے تم ریاست کے ادغام اور صوبائی انتظامیہ کے حق میں نہیں۔ جواب ملا کونسی ریاست اور کیسی انتظامیہ۔ سیاسیات کے سبق کو نظر انداز کیجئے۔ سادہ سی بات یہ ہے کہ حکومت نزدیک سے کی جائے تو جمہوریت، دور سے کی جائے تو بادشاہت۔ خلق کے لیے ہو تو خلافت، خدا کے لیے ہو تو نیابت۔

وادی کے درمیان سے گذرنے اور اسے دو پھانک کرنے والی سڑک پر ایک موڑ فتح پور کے نزدیک آتا ہے۔ اس سے ایک چھوٹی سڑک نکلتی ہے جو گوشۂ کہسار میں جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ پہاڑ وہاں پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں اور ان کی تنگ آغوش میں بمشکل اتنی جگہ ہے کہ ڈھلوان کو تراش کر ایک کمرہ ڈال لیں اور اتنے ہی رقبہ میں ایک کھیت پھیلا دیں۔ یہ تنگ ڈھلوان آباد ہے۔ اس میں ایک قطعہ پر ڈاک بنگلہ بنا ہوا ہے دوسرے پر مسجد اور تیسرے پر دکانیں۔ مذہب، سیاست اور تجارت کی درجہ بندی کی ہوئی ہے۔ مسجد میں حاضری کے لیے تاجر کو اپنی سطح سے بلند ہونا پڑتا ہے اور اقتدار کو کرسی سے اتر کر نیچے آنا پڑتا ہے۔ اس بنگلہ میں اخروٹ کے درخت کے نیچے ایک ساتھی اخبار پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اخبار یہاں دو دن بعد

پہنچتا ہے اور اس میں وہی پرانی چار سرخیاں لگی ہوئی تھیں۔ حاکم کا قصیدہ، قوم کا مرثیہ، ٹریفک کا حادثہ اور پولیس کا چھاپا۔ یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر۔ مسافر نے اخبار ان کے ہاتھ سے چھین لیا تاکہ وہ چشمہ کی سیر کے لیے ہمراہ چلیں۔ اس کی نظر ایک خبر پر پڑی۔ لکھا تھا کہ شمال مغربی سلسلہ کوہ میں کسی مقام پر پولیس نے ایک کامیاب چھاپے میں جو ناجائز مالِ تجارت پکڑا ہے اس کی مالیت پانچ ملین روپیہ سے زاید ہے۔ ملزم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

سیر سے واپس آئے تو بنگلے کے باہر ایک پرانی مگر لمبی سی موٹر کھڑی تھی۔ اخروٹ کے درخت کے نیچے دری بچھا کر چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ شلوار قمیض سب کی میلی، پستول اور بندوقیں سب کی دیسی، سفر کی تھکن اور مٹی سب کے چہروں پر۔ درمیان میں اکہرے بدن کا جوان بیٹھا گا رہا تھا۔ وہ تان لگاتا تو بائیں ہاتھ کو کان پر رکھ لیتا۔ دایاں ہاتھ مستقل تکیہ کے نیچے رکھا رہا۔ ایک ہمراہی رباب لیکر بالمقابل بیٹھا ہوا تھا۔ گانے والا اور ربابی یوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے جیسے پلک جھپکی تو سانپ ڈس لے گا۔ دو چار ساتھی ہم دے رہے تھے۔ دو ایک نے موٹر سے دیگچہ نکال اینٹوں کے عارضی چولھے پر چڑھا دیا اور جنگل کی لکڑی سلگا کر اسے گرم کرنے لگے۔ ایک اکڑوں بیٹھا دیر تک چلم کو پھونکیں مارتا رہا۔ جب گانے والا ذرا دیر کو رکا تو اس کے ایک ساتھی نے کہا، آج تمہارے گانے میں بڑا سوز ہے۔ جوان گائیک کھسیانا ہو گیا۔ مسافر نے اس طائفہ کے ایک فرد سے گانے کا مطلب پوچھا۔ اس نے پہلے مطلب بتایا پھر مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ ساری کہانی سنا دی۔ تکیہ کے نیچے کوئی ہاتھ نہ تھا، صرف ایک کٹے ہوئے ہاتھ کا پہنچا

رکھا تھا۔ یہ شخص سر ہتھیلی پر لیے کئی غیر قانونی کام کرتا ہے۔ سر ابھی تک سلامت ہے اور ہتھیلی غائب۔ مقابلہ ہوا گولی لگی اور ہاتھ کاٹنا پڑا۔ ہاتھ کی صفائی اس کا پیشہ ہے۔ قطع ید کی سزا اسے قدرت نے دی ہے۔ قانون کی گرفت سے وہ آزاد ہے بلکہ قانون اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ چند دن ہوئے اس کے کاروبار پر چھاپا پڑا۔ یہ اس گوشہ کہسار میں دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آیا ہے۔ اسے رونا گمشدہ دولت کا نہیں بلکہ چھاپے سے خراب ہو جانے والی ساکھ کا ہے۔ ہمراز نے مسافر کو اس کا نام بھی بتایا جسے مسافر نے آسانی سے بھلا دیا۔ عام سا نام تھا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں ہر شخص خان ہے ہر دوسرا شخص گل ہے اور ہر تیسرا شخص گل خاں ہے۔ وہ تیسرا شخص تھا' پہلے دو کا مرکب آزاد منش اور دل آویز۔

میاں دم میں خاں گل کا گانا سنے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر بیگ صاحب سے سوات ہوٹل میں ملے ہوئے بیس برس گذر چکے ہیں۔ یہ ہوٹل نیا نیا کھلا تھا۔ والی صاحب نے کسی عزیز کو ریاست بدر کیا اور جب وہ بے گھر ہو گیا تو اس کے گھر میں سرکاری ہوٹل کھول دیا۔ شملہ کا ایک بیرا اپنی لمبی مونچھوں کی بدولت ترقی پا کر اس ہوٹل کا مینجر بن گیا۔ ہوٹل کم خرچ اور کم نشین تھا۔ بیگ صاحب نے اس میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ ہر روز صبح سویرے اپنی جیپ میں چند مزدوروں اور کدالوں کے ساتھ نکل جاتے اور شام کے وقت کنکر پتھر سے بھری ٹوکریوں کے ہمراہ واپس آتے۔ وہ معدنیات کی تلاش میں تھے اور ان کا پختہ خیال تھا کہ وادی میں جا بجا ہیرے جواہرات دفن ہیں۔ ہوٹل میں تفریح کے لیے ٹھہرے ہوئے لوگ بیگ صاحب کے خاکی کپڑوں موٹے جوتوں الجھے بالوں اور

کھٹارہ جیپ کو تفریح کا سامان سمجھتے تھے۔ مسافر نے ایک دن ان سے اتفاق رائے کے طور پر یہ نظریہ پیش کیا کہ دریائے سوات کی شفاف تہہ میں بیٹھے ہوئے پتھر خنک پانی میں سالہا سال مسلسل غسل کرتے رہے تو یقیناً موتی بن جائیں گے۔ بیگ صاحب سنجیدہ سائنس دان تھے اور اس قسم کی شاعری کے بالکل خلاف۔ جل کر بولے یہ پتھر جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں گھستے گھستے محض ریت کے ذرے بن جائیں گے۔ میں تو ان اصلی قیمتی پتھروں کی تلاش کر رہا ہوں جنہیں لعل اور زمرّد کہتے ہیں مسافر نے حساب برابر کرنے کی غرض سے کہا، شوق سے تلاش کیجئے مگر یاد رہے کہ جس دن آپ نے قیمتی پتھر دریافت کیے وہ ریاست میں آپ کا آخری دن ہوگا اس روز آپ اس ہوٹل کی عمارت کے اصل مالک کی طرح یہاں سے رخصت کر دیئے جائیں گے۔ بیگ صاحب خاک شناس بھی تھے اور حق شناس بھی۔ کہنے لگے اس اندیشہ سے مجھے اتفاق ہے۔ چند برس گذرے ہوں گے کہ سوات کی زمرّد کی کانوں کی شہرت دور دور تک جا پہنچی۔ سیدو میں جہاں ایک کچا کوٹھا ہوا کرتا تھا وہاں ایک بڑی رہائشی عمارت پر زمرّد محل کی مرمریں تختی لگ گئی۔ بیگ صاحب اور ان کی جیپ دونوں لاپتہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ریاست بھی عدم پتہ ہو گئی۔ اس کی گمشدگی میں بھی زمرّد کی کانوں کا دخل تھا۔ مسافر کو حکم ملا کہ اس کا ادارہ زمرّد کی کانوں کو اپنی تحویل میں لے لے۔ مسافر نے جان کی امان چاہی اور صاف انکار کر دیا۔ کوئلوں کی دلالی میں صرف منہ کالا ہوتا ہے، قیمتی پتھروں کی کان کنی میں جان کنی کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔

مسافر ایک بار موسم خریف کے آخری دنوں میں وادی سوات

میں داخل ہوا۔ ایک پہاڑی موڑ کاٹتے ہوئے ہوا کا جھونکا موٹر کی کھڑکی سے در آیا۔ یہ عام کہستانی جھونکوں سے بہت مختلف تھا۔ اس جھونکے میں ہوا برائے نام تھی اور وہ بھی کسی کی ناز برداری اور بار برداری میں مصروف تھی۔ یہ خالص خوشبو کا جھونکا تھا اس میں ہوا کی شرح دس فیصد سے بھی کم ہو گی۔ موٹر روک کر مسافروں نے لمبے لمبے سانس لیے۔ ہر سانس میں دھان کے کھیتوں کی سوندھی سوندھی باس کے ساتھ خود رو جنگلی پھولوں کی مہکار اور ساون میں نہائے ہوئے درختوں کے جسم سے پھوٹنے والی مشک بھی شامل تھی۔ پوری وادی ایک گندھی خانہ بنی ہوئی تھی۔ موٹر پہاڑی ڈھلوان سے وادی میں کیا اتری کہ اس کے مسافر خوشبو میں اترتے چلے گئے۔

مسافر نے زندگی کی سب سے معطر سانسیں لنکا کی ایک پہاڑی پر لی ہیں۔ جزیرے کے وسط میں آدم چوٹی کے سایے تلے ایک پہاڑی مقام پیرادانیہ ہے جہاں ایک نباتاتی ذخیرہ ہے۔ سو سال پہلے کسی خوش مذاق نے بل کھاتے دریا کے کنارے تنگ وادی کا یہ لہریا قطعہ ہرے بھرے ذخیرے کے لیے منتخب کیا تھا۔ اس ذخیرہ کو دیکھنے کے لیے علم اور حسن کے رسیا بڑی دور دور سے آتے ہیں۔ اپنی اپنی بساط کے مطابق کسی کو اس ذخیرہ سے خبر ملتی ہے اور کسی کو آگہی۔ اس ذخیرہ میں ایک مہکتا ہوا قطعہ ہے۔ اس کی طرف رخ کریں تو خوشبو استقبال کیلئے بہت آگے تک آجاتی ہے اور وہاں سے رخصت ہوں تو دور تک تعاقب کرتی ہے۔ اس قطعہ میں ہر شجر سایہ دار ہو یا نہ ہو خوشبودار ضرور ہے حتیٰ کہ جھاڑیاں اور پودے بھی ختن کے ہرنوں کی ڈار کی طرح پرے باندھے ہوئے ہیں خوشبو اس

قطعہ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جگہ جگہ سے پھوٹ رہی ہے پھولوں سے بھرے ہوئے باغ میں خوشش رنگی بہت ہوتی ہے اور خوشبو کم کم۔ اس قطعہ میں پھول کم تھے اور خوشبو بہت زیادہ۔ گائیڈ نے کہا، خوشبو اِس درخت کے پھل میں ہے اور اُس کے بیج میں، اس کے پتوں میں ہے اور اس کی کلیوں میں۔ اس کے چھلکے میں ہے اور اس کی چھال میں۔ پھر ایک درخت کے پاس جاکر چاقو سے زمین کریدی اور ننگی جڑ میں اسے کھبو دیا۔ گائیڈ کے پیچھے پرا باندھ کر چلنے والے سیاحوں نے حیران اور یک زباں ہو کر کہا، اور خوشبو اس درخت کی جڑ میں ہے۔ یہ مسافر نے بڑھ کر اس جڑ کا ننھا سا ٹکڑا ہاتھ سے توڑنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اس کے ہاتھوں میں جڑ سے لپٹی ہوئی مٹی لگ گئی جسے اس نے رومال سے پونچھ لیا۔ رومال ہوٹل کی سٹیم لانڈری سے واپس آیا تو یوں لگا جیسے کسی نے ابھی ابھی نہا کر کوئی شوخ اور پیچھے پڑ جانے والی خوشبو لگائی ہو۔

گائیڈ اپنے فرائض کی ادائیگی کے انہماک میں یہ بھول گیا کہ کچھ واجبات مسافروں کے بھی ہوتے ہیں۔ سطح پر رہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ بعض مقامات ڈوبنے کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ لوگ خاموشی اور تنہائی کی تلاش میں تھے مگر گائیڈ ان کو جمع کر کے اپنا از بر سبق بآواز بلند فر فر سنانے پر مصر تھا۔ وہ علم میں اضافہ کرنا چاہتا تھا مگر ایسا علم جو غیر ضروری تفصیل ہو اور لطف کو کرکرا کر دے آخر کس کام کا۔ اس قطعہ میں ادق نباتاتی اصطلاحیں دہرانا یہاں تک کہ پودوں کے عام فہم نام بتانا بھی اسی قسم کی بے مزہ محنت تھی۔ یہ لکڑی عود ہے وہ گوند لوبان۔ یہ پھل فلفل ہے اور وہ بیج جائفل۔ یہ پتہ ساج ہے اور وہ تیج پات۔ یہ کلی الائچی ہے اور

وہ پوتھی لونگ - یہ چھال دار چینی ہے اور وہ جڑ ہلدی - یہ دھنیا ہے اور وہ بادیان
یہ زیرہ ہے وہ الائچی - بہت سی خوشبوئیں اس قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں جنہیں عرف
عام میں گرم مصالحہ کہتے ہیں ان کے نام سن کر افسوس ہوا کہ دوزخ شکم کے ایندھن
اور رسوئی کی چتا کی آگ میں کیسی کیسی خوشبو جلنے کے کام آ رہی ہے مسافر کو گائیڈ
سے جو خطرہ تھا سو پورا ہوا - گائیڈ کہہ رہا تھا، نیا آدمی فطرت سے دور ہوتا جا رہا
ہے اس کی تمام خوشیاں اس کی خوشبوؤں کی طرح مصنوعی ہیں - اب اس میں
اتنی ہمت کہاں کہ جنگل میں گھوڑے کی زین میں کسا بندھا ہرنوں کی ڈار کا سرپٹ
پیچھا کرے تا کہ لہو کی وہ ایک بوند حاصل ہو جسے مشک اذفر کہتے ہیں - اس میں
تو اب اتنا صبر بھی نہیں رہا کہ ایک ایکڑ کاشتہ رقبہ پر گلاب سینچے اور سال بھر
میں جو ایک ٹن پنکھڑیوں کی یافت ہو اس میں سے صرف سولہ اونس روح گلاب
مقطر کرے - آج کے مصروف آدمی کو صرف اتنی مہلت ملتی ہے کہ وہ کسی ہوائی اڈہ
کی ڈیوٹی فری شاپ سے پرفیوم خرید لے - یہ جانے بغیر کہ وہ سراسر نقلی ہے اور جو
ذرا سے خالص اجزا اس میں شامل ہیں وہ وہیل مچھلی کی رطوبت ہے یا بلی کے غدود
یہ علم کیمیا کا کمال ہے کہ ربڑ مصنوعی، گوشت مصنوعی اور خوشبو مصنوعی - کیا ان
مصنوعات کے استعمال کرنے والے کی اصلیت زیادہ دنوں تک برقرار رہ سکتی ہے -

ذخیرہ میں چار سو خوشبو کا جال پھیلا تھا - مہک کا ہر حلقہ دوسرے
حلقہ سے مختلف تھا لیکن خوشبوئیں آپس میں یوں گڈ مڈ ہو رہی تھیں جیسے جال الجھ گیا ہو -
شامہ کا امتحان تھا بلکہ شامت تھی - پہلے سب خوشبوئیں مل کر دامن دل کو کھینچتیں
کہ جا ایں جاست اور پھر ہر خوشبو اسے اپنی اپنی طرف کھینچ کر تار تار کر دیتی - مسافر

بے اختیار ہر خوشبو کے ساتھ تھوڑی دور تک گیا مگر وہ راستہ میں اس کا ہاتھ دوسری خوشبو کے ہاتھ میں دے کر خود گم ہوگئی۔ جاتے ہوئے کہہ گئی، تمہاری طرف جو ہاتھ بڑھاتا ہے تم اس پر بیعت کر لیتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں اب تک راستہ نہیں ملا۔

مسافر نے خوشبو کی تتلیوں کا پیچھا چھوڑ دیا اور اس قطعہ کے کنارے پر اُگے ہوئے ایک بڑے سے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے پہلے پروفیسر امام یاد آئے اور پھر منگولیا کے مندوب۔ جب مسافر کولمبو سے کانڈی کے لیے روانہ ہونے لگا تو پاکستانی سفیر اپنے ایک دوست کو ہمراہ لے آئے۔ یہ صاحب بھی کبھی پاکستان کی خارجہ ملازمت سے وابستہ تھے مگر محکمانہ پاک سازی کے سلسلہ میں کسی نے اس ہفت زبان کو اس لیے فارغ کر دیا کہ اُس کا مزاج معلمانہ تھا۔ پاکستان سے فارغ خطی ملی تو وہ کولمبو میں پروفیسری اور کانڈی میں دامادی پر فائز ہو گئے۔ پروفیسر امام نے بتایا کہ مقامی روایت کے مطابق حضرت آدمؑ جب جنت سے نکالے اور زمین پر بھیجے گئے تو پہلی بار لنکا کے وسطی پہاڑی سلسلہ کی اس چوٹی پر اترے جو ان کے نام نامی سے موسوم ہے۔ جنت سے نکلنے کا غم ان کی آنکھوں سے بہہ نکلا۔ ان آنسوؤں سے جزیرے کا جتنا حصہ تر ہو گیا وہاں اگنے والی ہر شے میں خوشبو بسی ہوتی ہے۔ یہ بات بہت پرانی ہے اس لیے تاریخ میں نہیں لکھی۔ تاریخ میں تو یہ لکھا ہے کہ جب لنکا کے گرم مصالحوں پر ولندیزی اجارہ داری مکمل ہو گئی تو اس کا مقابلہ کرنے کے لیے چوبیس انگلیسی دکانداروں نے ایک کمپنی بنائی جس کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی تھا۔ یہ کمپنی گرم مصالحہ کی تجارت سے آگے بڑھ کر انسانوں اور ملکوں کی تجارت میں مصروف ہو گئی۔ ابوالبشر کے آنسوؤں میں بشر کے وہ آنسو بھی شامل ہو گئے جو ۱۹۰ برس تک برعظیم کے غلاموں

کی آنکھوں سے بہتے رہے۔

کولمبو کے ایک ہوٹل کی خصوصی طعام گاہ میں ایرانی وفد نے چند مہمانوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ کھانے میں دیر گھنٹوں کے حساب سے ہو گئی۔ موسم پر سیر حاصل تبصرہ کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ چرب زبان تمام تیار شدہ لطیفے دہرا چکے تھے۔ حتیٰ کہ پینے والے بھی تنگ آ گئے۔ ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے مہمان اونگھنے لگے۔ گفتگو صرف ہوں ہاں تک محدود رہ گئی۔ بالآخر سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر کسی نے ترنگ میں آ کر تجویز پیش کی کہ ہر شخص اپنے اپنے ملک میں چوری چھپے تیار ہونے والی نشہ آور چیزوں کی تفصیل سنائے تاکہ دوسرے اس لذت اور سرور میں بالواسطہ شریک ہو سکیں۔ سب نے اس امید پر کہ اس تبادلہ علم کا ایک دور ختم ہونے تک شاید کھانا چنا جائے اس تجویز پر صاد کیا۔ طرح طرح کی معلومات حاصل ہوئیں، بہت سی ناقابل یقین دو چار ناقابل بیان۔ بالآخر منگولیا کے مندوب کی باری آئی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شرارت جھلک رہی تھی۔ اس نے کہا، حضرات میرا ملک پسماندہ ریگ زار ہے۔ تعلیم کم ہے۔ لوگ کیمیا میں بالکل کورے ہیں، اتنا علم بھی نہیں رکھتے کہ نشہ آور مشروبات اور مصنوعی خوشبوئیں تیار کر سکیں۔ ناچار ہم لوگ سادہ پانی پی کر جھوم اٹھتے ہیں اور تازہ پھول سونگھ کر مست ہو رہتے ہیں، پسماندہ جو ٹھہرے۔

گائیڈ کی آواز پر مسافر چونک اٹھا۔ کپڑے جھاڑے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جس درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اس پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ گھنا اور تن آور، زندہ اور محکم۔ درخت کے قدموں میں ایک سیاہ آہنی تختی لگی تھی جس پر سفید روغن سے لکھا تھا کہ اس درخت کی عمر ایک سو برس ہے۔ مسافر کو اس خیال سے سہارا ملا کہ کم از کم ایک زندہ صدی

اس کی پشتیباں ہے۔

ہوائی سفاری کے جہاز کے دریچہ سے لگا مسافر نیچے ایک وادی کی جھلک دیکھ کر اسں ہم زاد کو یاد کرنے لگا جو مہکتی سانسوں کی تلاش میں کبھی سوات کی وادی میں جا نکلتا ہے کبھی آدم پہاڑ کی چوٹی پر۔ یادوں کا جال پھیلا ہے۔ ایک حلقہ دوسرے حلقہ میں پیوست ہے جیسے جال الجھ گیا ہو۔

(۳)

ہوائی سفاری کا جہاز اب دریائے کنہار پر اتر رہا ہے۔ جس وادی سے ابھی گذر کر آئے ہیں وہ کشادہ اور کاشتہ تھی۔ جو وادی نیچے نظر آ رہی ہے یہ طویل اور تنگ ہے۔ کھیت کم ہیں اور جنگل گھنا ہے۔ وہاں پہاڑ چھوٹے اور سڈول تھے یہاں بڑے اور بھدے ہیں۔ اُس وادی کی بڑی سڑک سیدھی اور کھلی تھی۔ وہ ٹھنڈی سڑک یوں بچھی تھی جیسے گرم صحن میں دروازے سے مسقف تک چٹائی بچھا کر نمازیوں کی قدمبوسی کے لیے ایک روش بنا لیتے ہیں۔ یہ سڑک سراسر ناہموار ہے، کبھی اوپر کبھی نیچے، کبھی ادھر کبھی ادھر۔ پہاڑوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ یہ سڑک بے سمت اور بے ہوش آوارہ گرد کی مانند ہر قدم پر لہراتی ہے اور ہر دو چار قدم پر یکایک مڑ جاتی ہے۔ جہاں سڑک کو ستانے کے لیے ذرا سی جگہ مل جائے وہاں لوگ چھوٹی سی بستی ڈال لیتے ہیں۔

مسافر اسں سڑک سے آشنا ہے۔ اس نے ایک بار چھٹی لے کر بہت سے ہمراہیوں کے ساتھ اس کی قدمی پیمائش کی تھی۔ وہ اس کے ہر زاویے سے واقف ہے۔ گاہے یہ سڑک درزی کے فیتہ کی طرح گول چکر لگا کر پہاڑوں کی جسامت ناپنے لگتی ہے اور گاہے سر کے بل یوں نیچے آتی ہے جیسے قامت ناپ رہی ہو۔ کبھی یہ پتنگ کی ڈور لگتی ہے۔

پتنگ بابو سر پر کٹ گئی ہے اور اس کی ڈور بالا کوٹ تک زمین پر پڑی ہے۔ سیّاح اس ڈور کو لوٹنے کے لیے آ نکلتے ہیں۔

مسافر کو اس لمحہ دو راہیں یاد آ رہی ہیں۔ ایک سڑک اور ایک پگڈنڈی۔

بس ایک ساحلی مقام سے سامنے نظر آنے والی چوٹی کی طرف جا رہی تھی۔ وہ چوٹی مشرقی یورپ کے اس حصہ میں واقع ہے جو پہلے خلافت عثمانیہ میں شامل تھا پھر آزاد ملک مانٹی نیگرو بنا اور اب یوگوسلاویہ کا ایک صوبہ ہے۔ مانٹی نیگرو یعنی کوہ سیاہ اسی چوٹی کا نام ہے۔ بس آرام دہ تھی اور سڑک نئی اور ہموار۔ سفر بے تکان کٹ رہا تھا۔ سڑک میں کوئی خاص بات نہ تھی، کہیں بل اور چڑھائی کہیں پیچ اور اترائی جو عام طور پر ان پہاڑی سڑکوں کا وطیرہ ہے۔ آدھے راستہ میں بس رک گئی۔ مہماندار نے مسافروں سے کہا کہ نیچے اتر کر منظر سے لطف اندوز ہوں۔ اس سے بہتر مناظر ہم بغیر رکے پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اگر اس طرح کے سارے مناظر دیکھنے ہیں تو بس کے بجائے پیدل سفر کرنا چاہیئے۔ یہ ان چند مسافروں کی رائے تھی جو بس میں بیٹھے رہے۔ میزبانوں کا دل رکھنے کو چند مسافر فرض کفایہ کے طور پر نیچے اتر گئے۔ مہماندار نے ایک جانب اشارہ کیا اور اس کی وضاحت کرنے لگا۔ نیچے اترنے والے سب حیران ہو گئے۔ پھر یکایک یوگنڈا کے نمائندے نے زور زور سے انگریزی میں گانا شروع کیا، میری محبت بے انتہا ہے بے انتہا۔ بس میں بیٹھے ہوتے مسافر ہڑبڑا کر نیچے اتر آئے۔ دیکھا کہ بات منظر کی نہیں سڑک کی ہو رہی ہے۔ نیچے سڑک کا ایک دس میل کا ٹکڑا تھا جس میں دو موڑ ایک سیدھ میں اور ایک ان کے درمیان تھا۔ غور سے دیکھا تو وہ لاطینی خوشخطی کا شاہکار نظر آیا۔ جس بلندی سے کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے وہاں سے پورا لفظ **M** دکھائی دے رہا تھا۔ ساری نوک پلک درست۔ کسی نے

چار سطری خوشخطی کی کاپی پر جی نب سے لکھا ہوا تھا۔ سیاہی البتہ تار کول کی تھی اور لفظ اتنا بڑا تھا کہ پڑھنے کے بجائے چلنے پھرنے کے کام آ رہا تھا۔ ساحل، وادی اور پہاڑیوں میں وہ لفظ اس خوشنمائی سے جڑا ہوا تھا گویا انہی کا حصہ ہو اور آدمی کی کارستانی ہونے کے بجائے خود قدرت کا کارنامہ ہو۔ سب نے داد دی۔ کسی نے کہا کہ یہ حرف مانٹ نیگرو نامی ملک اور چوٹی کا پہلا حرف ہے اس لیے حکومت نے اتنی توجہ اور بنانے والے نے اتنی عرقریزی سے کام لیا۔ مہماندار نے ہنس کر کہا، ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل یہ سڑک ایک حرفِ راز اور ایک نقشِ الفت ہے۔ نقشہ بنانے والے نے اپنی محبوبہ کے نام کا پہلا حرف اس طرح لکھ کر اس وادی کو سڑک کی باہوں میں لے لیا ہے جہاں وہ رہا کرتی تھی۔ باقی سفر کے دوران بس میں یوگنڈا کے نمائندے کا گانا مسلسل جاری رہا۔ دوسرے ساتھی بھی گاہ بگاہ اس میں آواز ملاتے۔ سب جادۂ محبت کے مسافر بن گئے۔

مسافر کو جو پگڈنڈی یاد آ رہی ہے وہ سر راہے اتفاقاً نظر آئی تھی۔ مسافر ایک وسیع خوشنما علاقہ میں جا نکلا۔ وقت کم تھا اور حسن زیادہ۔ اس نے طے کیا کہ منہ اندھیرے نکل پڑے اور پھر جہاں تک دن کی روشنی ساتھ دے وہ سفر کرتا چلا جائے۔ واپسی کے لیے ساری رات پڑی ہے۔ لہٰذا وہ ایک صبح موٹر میں نکلا اور دوسری دوپہر واپس کمرے میں پہنچا۔ اس نے چوبیس گھنٹے میں چھ سو میل کا سفر بحر ایڈریاٹیک کے کنارے کیا تھا۔ خوبصورت مناظر کے ساتھ ساتھ موٹر ایک نئی شاہراہ پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ سڑک کے ایک کنارے طویل پہاڑی سلسلہ تھا اور دوسرے کنارے سمندر کا ایک طویل ساحل۔ ساری مسافت پہاڑیوں اور سمندر کے درمیان تھی۔ سڑک کہستانی بھی تھی اور ساحلی بھی۔ ابھی پہاڑ سے بغلگیر تو ابھی سمندر کی آغوش میں، کبھی کوہکن تو کبھی غوطہ زن۔ منظر کے حسن میں

سمندر اور پہاڑ کے ساتھ آسمان اور سورج کا اشتراک شامل تھا۔ دلفریبی کے سارے سامان جمع تھے۔ چٹانیں اور لہریں، برف اور جھاگ، ہریالی اور نیلاہٹ، روشن منظر اور اس کا پانی میں عکس۔ موڑ میں دائیں بائیں دیکھنے سے جی سیر نہ ہوا تو مڑ مڑ کر گریزاں نظاروں اور گذراں زاویوں کو دیکھتے رہے۔ اتنے محو تھے کہ دوپہر کے کھانے کی یاد سہ پہر کے آخری حصہ میں آئی۔ اس وقت موٹر بڑی تنگ راہ سے گذر رہی تھی۔ پتھریلے پہاڑی حصہ نے سڑک کو صرف ذرا سی جگہ دینا گوارہ کی تھی۔ سیاحوں کے ٹھہرنے کے لیے جتنی جگہ درکار ہے وہ یہاں موجود نہ تھی اس لیے سڑک کا یہ حصہ سنسان تھا۔ ہمراہی نے ایک موڑ پر موٹر آہستہ کی اور دوسرے موڑ پر روک لی۔ وہاں سڑک کے اُس کنارے جدھر گہری گھاٹی تھی دو تین موٹریں کھڑی کرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ لکڑی کی مچان پر ایک چھوٹا سا ریستوران بنا ہوا تھا۔ لکڑی کی چھت اور دیواروں پر رنگ، کھڑکیوں میں پردے، باہر کیچڑ صاف کرنے کا کھونٹا، اندر ہیٹ لٹکانے کی کھونٹی۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو سامنے بارہ سنگھا کا سر دیوار میں لگا ہوا تھا اور اس میں شیشے کی دو ابلتی آنکھیں جڑی ہوئی تھیں۔ اس سر کے نیچے ایک الماری میں طرح طرح کی بوتلیں اور گلاس رکھے ہوئے تھے۔ عمارت کا وہ حصہ جو گھاٹی اور سمندر کی طرف تھا سارا شیشے کا تھا۔ سلیقہ دیکھ کر تھکن مٹ گئی، خوشبو سونگھ کر بھوک چمک اٹھی۔ کھانے کے بعد مسافر نے اس ریستوران کے مالک کو خوش مذاقی کی داد دی۔ مالک نے کہا 'آپ نے اس عمارت کا بہترین نظارہ تو ابھی دیکھا ہی نہیں۔ وہ شیشے کی دیوار تک لے گیا اور ایک پٹ کھولا۔ وہاں لکڑی کے جالے کی طرح ایک پتلی سی سیڑھی تھی جو آدھی منزل کے فاصلہ تک نیچے اترتی جہاں بیئے کے گھونسلہ کی طرح ایک بالکنی جھول رہی تھی۔ یہ جھولا عین

گھاٹی کے اوپر تھا جس کے دائیں بائیں سرنگوں ڈھلوانیں تھیں اور نیچے سمندر کا پانی اور ساحل کی ریت۔ ہوا میں شراب کی تاثیر تھی۔ ہٹے کے اس گھونسلے سے بیس پچیس فٹ نیچے ایک چٹان تھی جہاں سے ایک پگڈنڈی سیدھی سر کے بل نیچے کی طرف جاتی اور دو ہزار فٹ دور ساحل کو چھو لیتی۔ اس ڈھلوان پر تو کسی کے چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پھر یہ پگڈنڈی کیسے بن گئی۔ مسافر نے اس سوال کو ٹالنا چاہا۔ خوبصورتی اگر معما بن کر سامنے آئے تو اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ اسے بچہ کی حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھنا چاہیئے۔ وہ نظر کیا جو معمہ کے حل پر تو پڑے مگر اس کے حسن تک نہ پہنچ سکے۔ اتنے میں جھولا ڈولنے لگا۔ ایک مہمان ریستوران سے نکلے اور سیڑھی اتر کر بالکنی میں آگئے۔ ان کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ انہوں نے آخری گھونٹ بالکنی پر کھڑے ہو کر پیا، پھر ایک نعرہ مستانہ لگایا اور بوتل کو پورے زور سے سامنے نظر آنے والی چٹان پر دے مارا۔ بوتل ایک جوابی نعرہ کے ساتھ چور چور ہو گئی اور شیشے کے ٹکڑے سسکیاں لیتے ڈھلوان پر لڑھکنے لگے۔ پھر سسکیوں کی آواز دب گئی اور وہ کرچیں پگڈنڈی میں گم ہو گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو چار مہمان اور آئے اور اسی طرح ان کی خالی یا ادھ بھری بوتلیں چٹان سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئیں۔ اس جھولے پر نہ جانے کتنے مہمان جھومے ہونگے اور اس چٹان پر نہ جانے کتنی بوتلوں نے سر پٹکا ہو گا تب جا کر اس پہاڑی کی مانگ میں کرچوں کی یہ افشاں بھری ہو گی۔ دھوپ کرچوں پر پڑ رہی تھی۔ شیشہ کی پگڈنڈی جگمگا رہی تھی۔ سورج ایک کرن اس ڈھلوان پر رکھ کر بھول گیا تھا۔ ایک مہمان اور آئے، ایک نعرہ اور لگا، ایک چھناکا اور ہوا، پگڈنڈی پر شیشہ کی ایک تہہ اور چڑھی۔

جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن   سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

مسافر وہاں سے رخصت ہوا۔ وہ اس پگڈنڈی میں شیشہ ئے کے بہت سے ٹکڑوں کے بجائے شیشہ دل کے صرف ایک ٹکڑے کا اضافہ کر سکا۔ جب اس نے مچان، بیئے کے گھونسلہ، کھائی، نیلے آسمان اور اس سے زیادہ نیلے سمندر میں گھری ہوئی شیشے کی اس پگڈنڈی پر آخری نظر ڈالی تو وہی شیشہ دل کا ٹکڑا سب سے الگ اور درخشاں نظر آیا۔

جہاز اب سیف الملوک پر اڑ رہا ہے۔ اس جھیل سے چھ میل کے فاصلہ پر دریائے کنہار کے کنارے مسافر نے ایک بار دس پندرہ دن کے لیے ڈیرہ ڈالا تھا۔ دو تین ناغے ہوتے، ان کو چھوڑ کر ہر روز پہلا یا تیسرا پہر اس جھیل کے کنارے گذرا۔ راستہ میں ایک گلیشیر کا ٹکڑا ملتا۔ اس پر ہر مرتبہ سوکھے کنکر اور تازہ شاخیں بچھائی جاتیں تب کہیں جیپ پار ہوتی۔ جتنی دیر اس اہتمام میں لگتی اس اثنا میں بچے برف میں ایڑیاں جماتے چھڑی کی نوک کا سہارا لیتے اس پر چڑھنے کی سعی کرتے۔ دیکھنے میں وہ چڑھائی آسان لگتی۔ نظر تو چشم زدن میں اس کی چوٹی کو آرام سے چھو آتی۔ مگر اس پر قدم رکھتے ہی ترکی تمام ہو جاتی، اور ذرا سا اوپر جانے کے بعد چڑھنا ناممکن اور اترنا دشوار ہو جاتا نیچے آ کر سب اپنے کارنامے بیان کرتے کہ آج فلاں نے کل کے مقابلہ میں یا فلاں کے مقابلہ میں زیادہ فاصلہ طے کیا۔ ان دعووں کی کاٹ کی جاتی، ایک دوسرے کو جھٹلایا جاتا، شور مچ جاتا یہاں تک کہ جھیل کے نزدیک اس موڑ تک پہنچ جاتے جو ہر بار ساری سیر کا مزہ پیشگی رکھوا لیتا۔ جیپ وہاں جا کر رک جاتی اور دو تین بار ذرا سی جگہ میں آگے پیچھے کرنے کے بعد اس کے دو پچھلے پہیے آدھے ہوا میں ہوتے اور موڑ کٹ جاتا۔ اس کوشش کے دوران اگر پتھر پہیوں کے نیچے رکھتے تو آگے پیچھے کرنے کی جگہ نہ رہتی اور اگر نہ رکھتے تو پیچھے گر جانے کا خطرہ تھا لہٰذا چاروں پہیوں کے ساتھ

رضا کار پتھر ہاتھ میں اٹھائے ایسے ساتھ چلتے جیسے رکابدار ہوں۔ اسس موڑ پر جو چڑھائی تھی اس پر پیدل چلنے والے بھی کہیں کہیں زمین پر ہاتھ ٹیک کر چوپاؤں کی طرح چڑھتے جیپ جو پہاڑی بکری کی نسل کا بے جان چوپایہ ہے ہر بار اسس موڑ اور اس چڑھائی سے جیت جاتی۔ اسس مرحلہ کے دو منٹ بعد سیف الملوک جھیل آجاتی۔ سڑک جس طرف سے داخل ہوتی وہ اسس منظر کا صدر دروازہ ہے۔ دوسری طرف دو پہاڑیوں کے پٹ آکر ملتے ہیں اور برف نے ان پر قفل ڈالا ہوا ہے۔ مسافر نے اسس جھیل میں کشتی رانی کی، پیدل اسس کا چکر لگایا، دلدل میں لت پت ہوا، آس پاس کی پہاڑیوں پر چڑھ کر اسے ہر زاویے سے دیکھا اور پھر جا کر اسس نتیجہ پر پہنچا کہ اس منظر کا لطف لینے کے لئے اسس حصہ میں کہیں ڈھلوان پر لیٹ جانا چاہیئے جس پر صدر دروازہ کھلتا ہے۔ وہ سوکھی گھاس پر لیٹ جاتا۔ جھیل بھی اس کے پہلو میں آکر لیٹ جاتی۔

مسافر نے منظر کو ہر رخ سے دیکھنے اور اپنا زاویہ منتخب کرنے کی پہلی کوشش نوجوانی کے دنوں میں اپنے اولیں طویل بیرونی سفر کے دوران سڈنی برج پر کی تھی۔ وہ اس پر موٹر، بس اور ریل میں سوار ہو کر گذرا پھر اسے پیدل طے کیا، ہوائی جہاز میں اس کے اوپر اڑا اور بحری جہاز میں اس کے نیچے سے گذرا۔ اسے وہ لمحاتی منظر بے حد دلفریب لگا جب اس نے عرشہ پر کھڑا ہو کر بحری جہاز کے اگلے حصہ کو پل بھر کے لیے پُل کو چھوتے دیکھا۔ مسافر نے اسی طرح کی کوشش دنیا کی سب سے بلند عمارت کو دیکھنے کے سلسلہ میں بھی کی۔ دن اور رات میں دیکھا، دور اور نزدیک سے دیکھا خشکی اور تری سے دیکھا۔ دوسری بلند عمارتوں کے دریچوں سے جھانک کر دیکھا اور ہوائی جہاز کے دریچہ سے لگ کر دیکھا۔ صحیح زاویہ کیمرے کو مل گیا مگر مسافر کی آنکھ اسس سے محروم رہی۔ مسافر نے تلاش ترک کر دی۔ اس سے

بلند تر عمارتیں وجود میں آگئیں۔

کاغان میں قیام کیے ہوئے دس دن گذرے تھے۔ ابھی چند دن اور ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ مسافر سیف الملوک کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی سی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اسے اٹھایا گیا تو وہاں بڑی رونق تھی۔ قالین بچھے ہوئے تھے، چھولداری لگی ہوئی تھی، سیخیں پروئی ہوئی تھیں۔ کنارے سے پکڑی ہوئی ٹراؤٹ مٹکے میں تیر رہی تھی، تازہ مچھلی کے تلنے کی باس اور آواز آرہی تھی۔ کاہل مہمان بے ترتیب بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ میزبان کا چست عملہ خدمت گذاری میں جتا ہوا تھا۔ جس کہستانی گوشہ میں آٹا اور نمک مشکل سے دستیاب ہوتا ہے وہاں ہر میدانی آسائش کا گودام بھرا تھا۔ جشن کا سماں تھا۔ جنگل میں منگل تھا۔ جنگلات کا سب سے بڑا افسر اور سب سے بڑا ٹھیکہ دار دونوں وہاں موجود تھے۔ مسافر بھی اس دعوت میں شریک ہوا لیکن وہ ایسا ناشکرا نکلا کہ اسی روز وادیٔ کاغان کو خیرباد کہہ دیا۔

وہ جو ناغے کے دن تھے ان میں مسافر نے شوگران دیکھا اور لالہ زار بھی گیا۔ ان کے علاوہ اور بہت کچھ دیکھا مگر ان مقامات پر جن کا کوئی نام نہ تھا۔ جہاں وہ بے سمت اور بے ارادہ جا نکلا۔ لیکن وہ یوں مارا مارا پھرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ دل و دماغ فارغ اور آمادہ، پاؤں میں ہمت اور آنکھوں میں چمک۔ جوتا ایسا پہنا جو کنکریلی راہوں پر ساتھ دے۔ ٹوپی وہ جو پیشانی پر سایہ کرے۔ چھڑی وہ جو سیر اور خطرہ دونوں میں کام آئے۔ گھڑی کو گھر پر چھوڑ دیا اور وقت بتانے کے لیے سورج کو ساتھ لے لیا۔ راستہ بتانے کے لیے کسی کو ہمراہ آنے کی اجازت نہ ملی۔ جب پہاڑی نے آواز دی اس پر لبیک کہا۔ جب چشمہ نے دعوت دی وہاں جھک کر ٹھنڈے میٹھے پانی کا ایک گھونٹ پی لیا۔ مسافر ایک چشمہ پر جھکا

تو اس میں ڈاکٹر حامد کا عکس نظر آیا ان کے مرشد کا کہنا ہے کہ پانی پیو تو ہمیشہ ٹھنڈا پیو اس کے ہر گھونٹ کے ساتھ تمہاری رگ و پے میں شکر کا جذبہ بجلی کے کوندے کی طرح لپک جائے گا۔ ممکن ہے غفلت کی وجہ سے تمہیں اس کا احساس تک نہ ہو اور تم زبان سے خاموش رہو۔ مگر تمہارے روئیں روئیں سے الحمدللہ کی صدا بلند ہو کر آسمانوں تک پہنچ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک گُر کی بات اور بتائی تھی۔ آپ کے بارے یہ قول دوسرے کا تھا مگر خاک کے بارے میں یہ رائے ان کی اپنی تھی۔ فرمایا، گاہ بگاہ جا نماز کے بغیر فرشِ خاک پر نماز ادا کرو۔ جس خاک سے بنے ہو اور جس خاک میں بالآخر ملنا ہے اس سے یہ اجنبیت کیسی۔ خاکی اور خاک کا فاصلہ جتنا کم ہو گا خود شناسی کی منزل اسی قدر نزدیک ہو گی۔ یہ دونوں باتیں سرِ وادی کنہار سمجھ میں آئیں۔ قدرت نے ایسی باتوں کے روشن ہونے کے لیے پہاڑوں اور وادیوں کی شرط لگا دی ہے۔ کوہ طور ایک پہاڑ ہے، بطحا ایک وادی۔

(۴)

تسکین مسافر نہ سفر میں نہ حضر میں۔ سفر خواہ کتنا ہی طویل اور دلچسپ کیوں نہ ہو، حضر کی منزل خواہ کتنی دل آرام اور خوش منظر کیوں نہ ہو، حدِ نظر ہمیشہ حدِ سفر سے آگے نکل جاتی ہے۔ مسافر نئے مقامات جتنے شوق سے دیکھتا ہے اسی شوق سے اَن دیکھے مقامات کے نئے خواب بھی دیکھتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آگے جانے کا راستہ بند ہو جائے وہاں دل میں ایک کانٹا سا چبھ جاتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آگے کچھ سجھائی نہ دے وہاں اس کانٹے کی خلش بڑھ جاتی ہے۔ بعض سفر ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا عطیہ بجز ایک خلش کچھ بھی نہیں ہوتا۔

مسافر کے تین میدانی سفر اس چوتھے ہوائی سفر کی نذر ہو گئے۔ گبرال،
پھنڈر اور شسر ہنگل میں جو کانٹے لگے تھے وہ اس ہوائی سفاری کے دوران نکل گئے۔
خلش کی جگہ معلومات نے لے لی۔ سودا مہنگا پڑا۔

گبرال پہنچ کر راستہ بند اور وادی ختم ہو جاتی ہے بس ایک آنے والا
راستہ چھوڑ کر پہاڑوں نے تینوں طرف روک لگا دی ہے۔ سامنے والا پہاڑ برف
سے بائیں جانب والا چیڑ کے درختوں سے اور دائیں جانب والا چٹیل چٹانوں سے
ڈھکا ہوا ہے۔ سوتے البتہ تینوں طرف سے پھوٹتے اور وادی میں آن کر یک جان ہو
جاتے ہیں۔ مسافر یہاں آ کر نہال ہو جاتا ہے۔ بس اک ذرا یہ خیال رہ رہ کر ستاتا ہے
کہ اگر یہ پہاڑ سامنے سے ہٹ جائے تو وہ کہاں جا نکلے گا۔

پھنڈر ایک کٹھن سفر کی آخری منزل قرار پائی۔ ذراسی پہاڑی کو ہان کو
ہموار کر کے ایک قیام گاہ اور ایک ہیلی پیڈ بنا لیا ہے۔ پہاڑی کے ایک طرف جھیل ہے
اور دوسری طرف دریائے غذر۔ وادی اس کے دامن میں واقع ہے۔ ہوا پہاڑ ہی
سے ٹکراتی ہے پھر اس پر چڑھ دوڑتی ہے اور چیختی چلاتی دوسری جانب کھڈ میں گر جاتی
ہے۔ اس روز یہ طوفان اتنا تیز تھا جیسے ساری عمارت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ مسافر
نے اٹھ کر دروازے اور دریچے بند کرنے چاہے مگر ہر روز سر شام چلنے والی تند ہوا نے کوئی
کھٹکا سلامت نہ چھوڑا تھا۔ کسی دروازے کو میز کرسی سے بند کیا۔ کسی پٹ کے آگے چارپائی
لگا دی۔ کمرے میں ایک کھڑکی جنوب کی طرف کھلتی تھی اسے بند کرنے کے لیے کچھ نہ ملا
تو مسافر اسے پکڑ کر کھڑا باہر کا تماشہ دیکھتا رہا۔ کھڑکی کے باہر ایک پہاڑ کھڑا پہرہ
دے رہا تھا۔ اس کی پشت پناہی کے لیے اس سے بھی اونچا پہاڑ موجود تھا۔ یکے بعد

دیگرے اسی طرح بلند ہوتے ہوئے پرت پرت پہاڑوں کی تہہ لگی ہوئی تھی۔ گرمیوں
میں ان پہاڑوں پر ایک آوارہ پھرتے ہیں اور سردیوں میں نیچے اتر آتے ہیں۔ اس لمحہ
مسافر کا خیال ان سے آوارہ تر نکلا اور اِس سلسلہ کے اُس پار جانے کی کوشش میں
مصروف ہو گیا۔ راستہ کانٹوں بھرا تھا سو ایک کانٹا چبھ گیا۔

ریاست دیر میں لکڑی کے ایک کارخانہ کی تنصیب کا مسئلہ تھا مسافر نے
کراچی میں رہتے رہتے معتدل موسم کو بھی اہتمام سے برداشت کرنے والے ساتھیوں
کو دسمبر کے مہینے میں قصۂ زمین برسرِ زمین کی نوید دی۔ اس اطلاع کا خاطر خواہ اثر ہوا۔
جب دیر کی برف سے ڈھکی ہوئی اور بارش سے جا بجا بہہ جانے والی سڑک پر بجلی سے
محروم گھپ اندھیرے میں مسافر جیپ کو دھکا دینے کے لیے اترے تو ایک دوسرے
کو پہچاننے میں دقت ہوتی۔ آواز دے کر ایک دوسرے کی شناخت کرنا پڑی۔
مانگے کے ڈھیلے ڈھالے اوور کوٹ، لمبے متروک مفلر، رانوں تک پہنچنے والی جرابیں
اور ٹخنوں تک پہنچنے والے زیر جامے، اونی دستانوں پر چمڑے کے دستانے، جراب پر
جراب، سویٹر پر سویٹر، چہرے کنٹوپ میں پوشیدہ۔ یہ مختصر قافلہ اونی کپڑوں میں اتنا مفصل
لپٹا ہوا تھا کہ صرف پھٹی پھٹی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ جب شرینگل پہنچے تو وہ چھوٹا سا گاؤں
برف کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ہر کھیت میں برف اگی ہوئی تھی۔ ہر راستہ پر برف چل رہی تھی
ہر گھر میں برف مقیم تھی۔ کوئی شے اگر برف کی زد سے بچی ہوئی تھی تو وہ گھروں کے دروازے
تھے جو ٹکٹکی لگائے موسم گرما کی راہ دیکھ رہے تھے۔ قافلہ ملک صاحب کے گھر داخل
ہوا۔ اس گھر میں ہر شے مانوس اور دل میں گھر کرنے والی تھی۔ فصیل، برج، صحن، مہمان خانہ
چارپائیاں اور حقے۔ پنشنر صوبیدار کی حنائی داڑھی، جواں بڑھاپا، تذکیر و تانیث کے جھگڑے

سے پاک زبان، جمع متکلم میں گفتگو۔ اوورکوٹ اور کوٹ دونوں کے بٹن کھلے تھے اور اندر سے
ایک مہمان نواز اور فراخ دل جھانک رہا تھا۔ صحن کے ایک کونے میں دو دیواروں کی آڑ
میں انگاروں پر گوشت بھونا جا رہا تھا۔ فصیل کے پیچھے شمال مشرقی جانب ایک سلسلہ کوہ
نظر آ رہا تھا جس پر گھنا جنگل تھا۔ مسافر اس جنگل میں گم ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس جانب
شیرشنگل آخری بستی ہے مگر وہ دوسری جانب کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔

آج اس ہوائی سفاری نے وہ تینوں سوال حل کر دیئے جو پھنڈر کی
کھڑکی گبرال کے چشمہ اور شیرشنگل کے مہمان خانہ میں پہاڑ بن کر سامنے آ گئے تھے۔ ہوائی
جہاز کے دریچہ سے مسافر نے نیچے جھانکا تو آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ہوائی جہاز اس وقت
پھنڈر، گبرال اور شیرشنگل کے اوپر پرواز کر رہا ہے۔ پھنڈر کے جنوب میں پہاڑوں کے
پرت کی دوسری جانب گبرال ہے۔ گبرال پر گبرو پہاڑ راستہ روکے کھڑا
ہے اس کی پشت پر جو بستی آباد ہے اس کا نام شیرشنگل ہے۔

ہوائی جہاز اب چترال پر پرواز کر رہا ہے۔ مسافر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ یہ
علاقہ پاکستان کے ان گنے چنے دور افتادہ مقامات میں سے ایک ہے جہاں اسے
ابھی تک جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہ بارہا اس کے آس پاس کے علاقوں میں پھرتا
رہا۔ چترال کا دروازہ دیر ہے اور صحن سوات ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دروازے
اور صحن تک پہنچ جائیں اور پھر بھی گھر کے اندر داخل نہ ہوں۔ جن پہاڑوں پر اس وقت
جہاز اڑ رہا ہے ان میں گھر بسانا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ یہاں ایک
سے زیادہ گھر بناتے ہیں۔ جب ایک گھر کو سردیاں فتح کر لیں تو دوسرے میں منتقل ہو جاتے
ہیں۔ وہاں پرانی عداوتیں نہ جینے دیں تو اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جفاکش اور

فاقہ مست ہوا کرتے ہیں، سرکیف اور خانہ بدوش جیا کرتے ہیں۔

لواری کی چوٹی کے دوسری طرف اور بہت سی چوٹیاں ہیں مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ چترال کی وادی ہے۔ شاید بڑے پہاڑوں میں گھرے ہوئے چھوٹے پہاڑوں کو پہاڑ کے بجائے وادی کا نام دیتے ہیں۔ ایک پہاڑی پر چھوٹا سا قصبہ نظر آ رہا ہے۔ شہر کیا ہے بس پہاڑی کی کمر پر مچان بندھی ہوئی ہے۔ یہ چترال کا صدر مقام ہے۔ گھر ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے ہیں جیسے اس شہر میں سڑکیں نہیں ہوتیں، شہر میں زندگی کے جو آثار ہوائی جہاز سے نظر آنے چاہئیں وہ سب غائب ہیں۔ شہر بالکل خاموش ہے اور اس خاموشی میں سامنے نظر آنے والی ماہی پشت پہاڑی سے کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ پہاڑی اس بلندی سے ایسے نظر آ رہی ہے جیسے ایک بڑی سی کچی قبر۔ اس کو دیکھ کر مسافر کو چترال کے جواں سال اور جوانا مرگ مہتر کا خیال آ گیا۔ وہ سول سروس کی تربیت گاہ میں اس کے شریک درس تھے۔ یہ تربیت گاہ لاہور میں نہر کے کنارے اس عمارت میں شروع کی گئی جہاں پنجاب کی ریاستوں کے ریذیڈنٹ بہادر رہتے اور دفتر کرتے تھے۔ ان کا واسطہ راجوں مہاراجوں سے تھا اس لیے عمارت شایانِ شان تھی۔ اس عمارت میں پاکستان کے اولین مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہونے والے بیس لڑکوں کو ٹھہرایا گیا۔ ان کے ساتھ چند لڑکے اور بھی تھے جن میں سے ایک مزاری تمندار تھا اور دوسرا چترال کا مہتر۔ ان دنوں رواج تھا کہ ایسی تربیت گاہوں میں دو ایک شہزادے اور نواب زادے ہر کورس میں شامل کیے جاتے تاکہ مقابلہ کے امتحان میں کامیاب ہونے والے متوسط گھرانوں کے کتابی کیڑوں کو امارت کی ہوا لگے اور ان کے پر پرزے نکل آئیں۔ دوسری طرف یہ مقصود تھا کہ کھلنڈرے رئیس زادوں کو اطلاع مل جائے کہ

ان کی جاگیر سے بڑی ایک علم دہنر کی جاگیر بھی ہوتی ہے۔ اکادمی میں زیر تربیت لڑکوں کے پاس تھوک میں خریدی ہوئی سبز رنگ کی سائیکلیں تھیں اور مہتر آف چترال کے پاس سرخ رنگ کی کھلے چھت والی موٹر تھی۔ چترال کی وادی جتنی تنگ ہے یہ موٹر اسی قدر کشادہ تھی۔ رات کو دس بارہ لڑکے اس میں سوار ہو جاتے اور نہر کے کنارے قوالی کرتے ہوئے دور تک نکل جاتے۔ ان بے فکر نوجوانوں کی صبح نہر کے ایک کنارے بسر ہوتی اور رات دوسرے کنارے۔ نہر کے ایک طرف سڑک تھی اور دوسری طرف گھڑ سواری کی پٹی۔ ان کی تربیت میں صبح سویرے کی گھڑ سواری شامل تھی اور ان کی طبیعت میں رات کو سر پر اٹھا لینے کا سودا تھا۔

انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ سر پر تاج پہننے والا ہمیشہ سرگراں رہتا ہے۔

مہتر آف چترال نے تربیت گاہ میں قیام کے دوران ہر طرح سے اس مقولے کو غلط ثابت کر دکھایا۔ فکر کبھی اس نوجوان کو چھو کر بھی نہ گذری ہوگی۔ وہ سیدھا سادا ملنسار اور خاموش لڑکا تھا۔ دنیا داری میں بالکل کورا۔ اتنا کم گو کہ اس سے گفتگو اکثر یک طرفہ ہوتی تھی۔ زرعی کالج میں چند دن گذارنے کے بعد زیر تربیت لڑکوں کا دستہ گروپ فوٹو کے لیے خاموش کھڑا تھا۔ سب دم سادھے کہ اگر ہلے تو مورت خراب ہو جائے گی۔ ادھر فوٹو گرافر سیاہ چادر کے نیچے ایسا چھپا کہ نکلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سامنے کرسیوں پر کالج کے پرنسپل، اکادمی کے ڈائرکٹر اور مہتر آف چترال بیٹھے ہوئے تھے۔ پرنسپل نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا، ایکسلنسی چترال کے وسائل اور ذخائر لامحدود ہیں۔ مہتر خاموش رہے لہٰذا پرنسپل نے سلسلہ کلام کو جاری رکھا۔ چترال کے جنگلات پاکستان کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ چترال میں پن بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ چترال کے خوبصورت مناظر سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتے ہیں۔ چترال

کے بہادر باشندے پاکستانی فوج کے لیے بہت موزوں ہیں۔ چترال میں ایک نہ ایک دن معدنیات کا بڑا خزانہ ملے گا۔ یہ ساری باتیں پرنسپل نے ایک سانس میں بیان نہیں کیں بلکہ ہر جملے کے بعد اس امید پر رک کر سانس لیا کہ سلسلہ کلام کو اب ہز ہائینس تھام لینگے مگر وہ خاموش رہے۔ بالآخر پرنسپل نے جو کیمرے کی طرف منہ کیے اکڑے بیٹھے زیر لب یہ باتیں کر رہے تھے جسم کو ڈھیلا چھوڑا، ماتھے پر بل ڈالا اور مڑ کر بولے 'یور ہائی نس کیا آپ میری باتیں سن رہے ہیں۔ جواب ملا' جی ہاں۔ اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ تربیت ختم ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہ گذرا کہ نوجوان مہتر وادی چترال کو چپ چاپ چھوڑ کر وادی خاموشاں میں جا بسے۔

مہتر آف چترال کا انتقال فضائی حادثہ میں ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے تربیتی جہاز میں پشاور سے چترال روانہ ہوئے۔ ہوا تیز تھی بادل گھرے تھے اور پہاڑ بادلوں میں گھات لگائے ہوئے تھے۔ سوچ کا سلسلہ یہاں آن کر ٹوٹ گیا۔ ہوائی سفاری کا بوئنگ سات سو سات اس وقت چترال پر پرواز کر رہا ہے۔ راہ میں بادل آ گئے ہیں اور لمحہ بہ لمحہ گھرے ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاز نے اپنی گاؤدم چونچ کو اونچا کر لیا ہے۔ یکایک رفتار بڑھ گئی ہے۔ انجنوں کے پھیپھڑے دھونکنی کی طرح چل رہے ہیں۔ جہاز اب بادلوں سے باہر ہے اور اس کی انحنائی پرواز سے عیاں ہے کہ وہ آگے جانے کے بجائے واپس ہو رہا ہے۔ مبصر نے بلند گو پر اعلان کیا، ہمیں افسوس ہے کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے سلسلہ ہندوکش کی پچیس ہزار فٹ بلند چوٹی کی جانب سفر ترک کر دیا گیا ہے۔ ترچ میر کی چوٹی بادلوں میں گھری ہوئی ہے اور ہواباز کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔

جہاز اب مقررہ راستہ سے ہٹ گیا ہے۔ اس کی پرواز کچھ دیر کیلئے غیر معین

ہوگئی ہے۔ وہ ان جانے اوران دیکھے راستہ پرچل رہا ہے۔ مگر فضا میں راستے کہاں ہوتے ہیں، صرف راستہ کا احساس ہوتا ہے۔ فضا بے کراں اور بے نشاں ہے۔ نہ کسی پرانے قافلے کا نقش قدم محفوظ نہ کسی نئے کارواں کے لیے سنگ میل موجود، نہ پس انداز اور نہ زادِ راہ۔ فضا پاک ہے اور اس کا مرکب بہت لطیف، اس لیے فضا میں مادہ تقریباً معدوم ہو جاتا ہے اور سمت موہوم۔ صرف ایک خلا رہ جاتا ہے۔ ہر طرف خلا ہی خلا، ایک خلا کے بعد دوسرا خلا۔ فکر کو اس کا سرا نہیں ملتا۔ تاہم اس خیال سے ڈھارس ہوتی ہے کہ اگر خلا بسیط ہے تو کوئی محیط بھی تو ہوگا۔

مسافر نے جب پہلی بار سکردو کا ہوائی سفر کیا تو اسے پرواز کے راستوں اور ان کے بارے میں ہوا بازوں کے رویے کا تھوڑا سا تجربہ ہوا۔ پرواز کے لیے حسب دستور مناسب موسم کی شرط تھی اور وہ حسب معمول کئی دن سے پوری نہیں ہو رہی تھی۔ لوگ سامان اور امید لے کر تڑکے آ جاتے۔ امید و بیم میں وقت گذارتے، جھٹپٹا ہوتا تو ہوائی اڈے سے تھکے ہوئے کل پر آس لگاتے واپس چلے جاتے۔ فجر سے آکر انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے مسافر کو تین گھنٹے کے بعد فضائی ادارے نے جہاز کے بجائے طعام گاہ میں پہنچا دیا۔ وہاں جہاز کا عملہ بھی موجود تھا۔ ہوا باز اور اس کی وردی دونوں کو کلف لگی ہوئی تھی۔ دونوں استری شدہ تھے۔ مسافر اس کے پاس گیا اور میز پر نقشہ پھیلا کر پوچھا کہ جہاز سکردو جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے اور راہ میں آنے والے بادلوں میں چھپے ہوئے پہاڑوں اور سیاسی بادلوں میں چھپی ہوئی وادی کا خیال کیونکر رکھتا ہے۔ ہوا باز نے نقشہ پر انگشت شہادت سے ایک لکیر بنائی۔ راولپنڈی سے مری، مری سے مظفر آباد، مظفر آباد سے کشن گنگا کے بہاؤ کے خلاف اس مقام تک جہاں یہ الٹی گنگا پورب کو پھر جاتی ہے۔ اس

مقام پر ہواباز کی انگلی نقشہ پر ایسے رک گئی جیسے کشمیر کی تاریخ۔ مسافر نے کہا، یہاں تک راستہ واقعی اس لائق تھا کہ نقشہ پر انگشت شہادت سے سمجھایا جاتا۔ ہواباز نے بات سنی ان سنی کردی۔ دوسری انگلی سکردو پر رکھی اور فخر سے کہا، یہاں سے وہاں تک کوئی معین راستہ نہیں لہٰذا جو مزاج میں آئے کر گذرتا ہوں۔ ہواباز نے ایک ہوائی چھوڑی۔ اگر چائے پی ہو تو راہ راست پر چلتا ہوں اگرچہ دوراست۔ اگر پی رکھی ہو تو جہاز کو تنگ سے تنگ وادیوں میں لے جاتا ہوں۔ البتہ خمار کو خطرہ پسند ہے سو جس دن وہ چڑھا ہو میں قریب ترین راستہ کی تلاش میں چوٹیوں کو چومتا، بادلوں میں دڑاتا، ہوا کو ہرچہ بادا باد کہتا آڑا اڑنے لگتا ہوں۔ مسافر نے پوچھا، آج کیا ارادے ہیں۔ ربڑ اور پلاسٹک جیسے بے اثر پذیر چہرہ پر پہلی بار زندگی کے آثار مسکراہٹ کی شکنیں بن کر نمودار ہوئے۔ کوئی فکر کی بات نہیں، آج تو میں نے چائے میں دودھ کے چند قطرے بھی ڈال لیے ہیں۔

یونہی میں اس لمحہ اعلان ہو رہا ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں، جہاز ابھی مقررہ راہ پر لگ جائے گا۔ کپتان راحت دس برس سے ان پہاڑوں میں جہاز چلا رہے ہیں، وہ ہر پہاڑ سے واقف ہیں، وہ ہر چوٹی سے مانوس ہیں۔ وہ ان پہاڑوں اور چوٹیوں کو اپنے گھرانے کے افراد میں شمار کرتے ہیں۔

ہم سفر نے آہستہ سے کان میں کہا، آج پھر چترال کے سفر کی خواہش پوری نہ ہو سکی بس دور سے ایک جھلک دیکھی اور بادلوں نے واپس لوٹا دیا۔ یوں لگتا ہے تمہاری خواہش لواری کی سرنگ کی طرح ہے۔ اس کا چرچا تو بہت ہے، تھوڑا بہت کام بھی ہوتا رہتا ہے مگر رفتار ایسی ہے کہ مدتوں تک موقع پر سرنگ کے بجائے ایک اندھے غار کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مسافر نے جواب نہ دیا، وہ غار کا ذکر سنتے ہی اجنتا ایلورہ، خوشاب،

یکپبری اور بیروت جانکلا۔

غاروں سے مسافر کی دلچسپی بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ کبھی لگاؤ گہرا اور داخلی ہو جاتا ہے اور کبھی تعلق سطحی اور بیرونی رہ جاتا ہے۔ اس نے سترہ برس کی عمر میں تنہا ایک ہزار میل کا سفر کیا تاکہ وہ ان چند مقامات تک پہنچ سکے جن میں اجنتا اور ایلورہ کے غار شامل تھے۔ طالب علمی کے دن اور لاعلمی زمانہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ دو غار ایک جیسے اور ایک ساتھ ہیں۔ اورنگ آباد پہنچے تو غاروں کے دونوں سلسلوں کا فرق اور فاصلہ پتہ چلا۔ ایک سلسلہ منقش ہے دوسرا مصور۔ ایلورہ کے ابھرے ہوئے نقوش اور پتھر کے بھرے بھرے جسم دیکھے۔ ایک نقش یاد میں ابھی تک اسی طرح ابھرا ہوا ہے۔ کئی منزلہ گرد کے اردگرد دو شاگرد ہیں۔ منزلیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور ایک ہی نظر میں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک شاگرد منزل بہ منزل اوپر جا رہا ہے دوسرا محض ایک یا دو منزلیں نیچے اتر کر رک گیا ہے۔ وہ بلندیوں پر جا کر کھو گیا اور یہ خاکساری کی بدولت فوراً اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ اجنتا کی منزل کا سفر مسافر کے لیے بڑا صبر آزما نکلا۔ بس خراب ہوئی رات پڑ گئی جب ٹھیک ہوئی تو پہاڑیوں میں اسے چند مسلح افراد نے روک لیا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلا کہ وہ کسی سیاسی خون خرابے کے بعد روپوش ہو رہے ہیں۔ جب ساری سواریاں رات کے دو بجے اتر گئیں تو ان مسلح افراد کے سردار نے مسافر سے کہا کہ وہ ان کا مہمان بن جائے۔ بس اس گروہ کو اڈے سے اجنتا کے خوبصورت اور آرام دہ مہمان خانہ میں لے گئی۔ گھنٹہ بھر بعد پر تکلف کھانا چنا گیا۔ کھانے کے بعد وہ چار پانچ آدمی برآمدے میں دری بچھا کر لیٹ گئے، بندوقیں اور خنجر سرہانے رکھ لیے۔ مسافر نے کمرے کے تمام دروازے اندر سے بند کیے اور سو گیا۔ تھکن اتنی تھی کہ صورت حال پر غور کرنے اور حیرت یا خوف کے مارے جاگتے رہنے کا

موقع نہ ملا۔ مسافر بہت دیر سے اٹھا۔ بیرے نے بتایا کہ ان کے ساتھی آن ملے تھے اس لیے وہ لوگ ساڑھے چار بجے صبح گھوڑوں پر سوار ہو کر جنگل کی طرف نکل گئے۔ جاتے ہوئے ان کا سردار مسافر کی رہائش اور خورد و نوش کا بل پیشگی ادا کر گیا۔ مسافر نے اجنتا کے غاروں کی سیلی اور سیاہ دیواروں پر وقت کے ہاتھوں بچ جانے والے مدھم فریسکو دیکھے سنگھار والی تصویر کی نقل تو وہ لنڈن لائبریری میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا، اصل کو دیکھا تو دیر تک دیکھتا ہی چلا گیا۔ اجنتا کی ساری شبیہیں مٹی مٹی اور بجھی بجھی تھیں اور یاد میں بالکل اسی طرح محفوظ ہیں۔ ان کے ساتھ ایک مدھم سی تصویر اس مسلح گروہ کے سردار کی بھی ہے جس نے آدھی رات گولی چلا کر بس روکی تھی۔ مسافر نے ذرا سی دیر کھانے کی میز پر کمزور برقی رَو میں اس کا چارخانہ رومال سے ڈھکا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ شخص عجیب تھا، یہ سنتے ہی کہ مسافر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم ہے زبردستی اس کا میزبان بن بیٹھا۔ ان دنوں اس تعلیمی ادارے کے نام میں ایسا جادو تھا کہ وہ مفرور چاؤش محمد احمد پر بھی چل گیا

مسافر ایک بار خوشاب میں کوئلہ کی ایک بے ضابطہ کان میں رسی سے بندھے ہوئے چھینکے کی مدد سے نیچے اتر گیا۔ اس کان کا منہ بڑے سے کنوئیں کی طرح تھا مگر تہہ تک پہنچ کر اس کی گولائی آدھی رہ گئی۔ سرنگ میں داخل ہوئے تو اس کا قطر بھی دو سو گز جا کر نصف ہو گیا۔ جھک کر چلنا شروع کیا۔ سرنگ چھوٹی ہوتی چلی گئی اور مسافر جھکتا چلا گیا۔ دہرا ہو جانے کے بعد جب جھکنے کی اور گنجائش باقی نہ رہی تو سرنگ ختم ہو گئی۔ وہاں ایک بغلی غار تھا جس میں صرف بیٹھ کر مفلوج بطخ کی طرح سرکنے کی جگہ تھی۔ دس گز کے فاصلہ پر ایک کان کن بیٹھا تھا جس کے سیاہ ننگے بدن پر کوئلہ کی کالک میں پسینہ کی لکیریں بنی ہوئی تھیں۔ غار کے دہانہ سے وہ سیلے ہوئے پتھر کے کوئلہ کا ایک ڈلا نگ رہا تھا۔ وہ اکڑوں

بیٹھا تیشہ فرہاد لیے سامنے پتھر کی دیوار پر ضرب لگا رہا تھا، آہستہ آہستہ جیسے گورکن اپنی ہی قبر کھود رہا ہو۔ کسی نے ٹارچ جلائی۔ لمحہ بھر کو روشنی اس کی آنکھوں میں پڑی۔ ان میں وہی بے بسی تھی جو اسسٹنٹ کمشنر زیر تربیت نے لائل پور سنٹرل جیل میں پھانسی کے تختہ پر کھڑے متلی مستلی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ مسافر اس کے بعد بیس برس تک کسی غار میں نہ داخل ہوا۔ موقع آیا تو اسے ٹال گیا۔

رات سورنتو کے رومانی ساحلی شہر میں بسر ہوئی اور صبح فیری پر سوار ہو کر مسافر خوابوں کے جزیرے کیپری میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد سارے خواب منتشر ہو گئے۔ مغربی سیاح مُصر کہ یہ فردوس بر روئے زمیں ہے اور مشرقی مسافر کو اصرار کہ یہ احمقوں کی جنت ہے۔ جزیرہ پہاڑی ہے اور اس پر دنیا کے مشہور دولتمندوں کے مکان بنے ہوئے ہیں۔ تنگ سڑکیں اور بے ترتیب مکان۔ گائیڈ مکینوں کے نام گنتا تو سیاحوں کی ٹولی چیخ مارتی کہ وہ اتنے عظیم لوگوں کے دروازے تک پہنچ گئے ہیں۔ سو ان کے پیسے وصول ہو گئے۔ مسافر نے گائیڈ سے کہا یہ نام مکینوں کے نہیں مالکوں کے ہیں۔ بیشتر گھر غیر آباد تھے، عملہ موجود مالک غیر موجود۔ یہ مالک تجارت، سیاست، شہرت، محبت اور انکم ٹیکس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے کسی اور ملک میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کسی نے مسافر کو بیزار پایا تو مشورہ دیا کہ جب تک لوگ بند دروازوں پر پڑے ہوئے تالوں کی زیارت میں مصروف ہیں اتنے میں تم نیلگوں غار دیکھ آؤ۔ موٹر بوٹ نے جزیرہ کا چکر لگایا اور کھلے سمندر کے کنارے ایک چٹان کے پاس جا کر رک گئی۔ مسافر ایک چھوٹی سی کشتی میں منتقل ہو گیا جو چٹان کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی چٹان میں ایک سوراخ تھا۔ یہ غار کا دہانہ تھا۔ ملاح نے غار کے دہانہ پر لگی ہوئی موٹی سی تار کے سہارے کشتی کا ایک سرا غار کے اندر داخل کیا اور اس میں

سوار دو تین مسافروں کو ہدایت دی کہ وہ جھک جائیں اور اس وقت تک اپنا سر گھٹنوں میں دیئے رہیں جب تک ساری کشتی دہانہ کے پار نہ ہو جائے۔ مسافر نے مراقبہ سے سر اٹھایا تو وہ ایک پر فریب طلسماتی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ یہ ایک بڑے ہال کمرے جتنا غار تھا جس کا آبی فرش پگھلے ہوئے نیلم کا بنا ہوا تھا۔ غار کے اندر اندھیرا تھا مگر پانی شفاف تھا اور روشن نیلا۔ سورج پانی کی تہ سے بلند ہو رہا تھا جیسے چاہ نخشب سے چاند۔ کشتی تار کے سہارے ہوتے ہوئے غار کے وسط تک پہنچی۔ چشم تخیل کو یوں لگا جیسے کسی کی خوبصورت نیلی آنکھوں میں سما گئے ہوں۔ کشتی اس چشم غزال کے نیلے سمندر کی سطح پر یوں تیر رہی تھی فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے۔

بیروت سے پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ مسافر وہاں بار بار جانے کے بہانے ڈھونڈ لیتا اور ہر بار اسے پہلے کی نسبت زیادہ دلکش پاتا۔ ذرا سا ملک اور نسبتاً ذرا بڑا سا شہر۔ سمندر، ساحل کی ریت، پہاڑیاں، وادیاں، باغات اور باشندے، ہر سمت حسن ہی حسن۔ کھلے بازار، چور بازار، بنک، صراف، مصروف بندرگاہ اور اس سے زیادہ مصروف فرودگاہ، ہر طرف رونق ہی رونق۔ ایک قدم پر رومی کھنڈرات دوسرے پر بابل کی بستیاں اور تیسرے پر مسلمانوں کے شہر، ہر گام پر تاریخ ہی تاریخ۔ لوگ ہر دیسی، چند زبانی، وسیع المشرب اور صلح کل۔ چہار سو امن ہی امن۔ بس نظر لگ گئی اور جن لوگوں کی نظر لگی ان میں مسافر بھی شامل ہے۔ ایک دن بیروت سے ٹریپولی کی طرف روانہ ہوئے اور گھنٹہ بھر ساحلی سڑک پر سفر کے بعد بس کا رخ پہاڑ کی جانب ہو گیا۔ آدھی چڑھائی چڑھنے کے بعد بس ایک ایسے مقام پر جا کر ٹھہر گئی جہاں پہاڑ کا پیٹ پھولا ہوا تھا۔ اس پہاڑ کے سر پر لمبی نوکدار چوٹی نہیں۔ وہ بیجاپور کے گول گنبد کی طرح تھا۔ بس سے

مسافر بدھے اس جال میں اترتے گئے جو ان کے لیے بچھا ہوا تھا مشروبات و ماکولات و نامعقولات۔ ہر طرح کے تحائف ساتھ گھر لے جانے والے یا سفر کے دوران دل بہلانے والے۔ اس جال کے ایک سرے پر ٹکٹ گھر سے گذر کر دیوار کے ساتھ ایک پختہ فٹ پاتھ تھا۔ جھاڑیوں میں جا کر یہ فٹ پاتھ سیڑھیوں میں بدل گیا اور وہ قدم بقدم ایک تنگ راستہ پر نیچے اترنے لگیں۔ جہاں ہوا میں نمی اور سیمنٹ میں سیلن بڑھ گئی وہاں حفاظت کے لیے جنگلہ لگا ہوا تھا اور سامنے محراب پر چھوٹا سا بلب جل رہا تھا۔ مسافر اس محراب سے داخل ہو کر دائیں ہاتھ چند نیم تاریک سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک چبوترے پر جا کر رک گیا۔ آگے قدم رکھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ غار کے اندر پہنچ چکا تھا۔ تاریک غار میں دور دور بجلی کے بلب لگے ہوئے تھے۔ ان کی روشنی باہر سورج کی روشنی کے مقابلہ میں اتنی مدھم تھی کہ تھوڑی دیر تک ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک ہیولا ابھرا ایک خاکہ بنا اور ایک منظر تعمیر ہو گیا۔ یہ غار ہے کہ خلا! غار بھلا اتنے کھلے، اتنے اونچے اور اتنے بڑے کہاں ہوتے ہیں۔ پہاڑ اندر سے بالکل کھوکھلا نکلا، جیسے کسی نے پہاڑ کا پہاڑ اٹھا لیا ہو اور صرف اس کا خول رہنے دیا ہو۔ غار میں ایک سرے سے دوسرے مگر نظر نہ آنے والے سرے تک ایک پایاب دریا بہہ رہا تھا۔ جہاں بجلی کی روشنی تھی وہاں چھت اور دیواروں کا عکس اس کی شفاف سطح پر نقش و نگار بنا رہا تھا جہاں اندھیرا تھا وہاں چھت اور دیوار کے کالے سائے پانی کو گدلا کر رہے تھے۔ اگر یہ غار انسان نے بنایا ہے تو اسے کتنی فرہادی صدیاں لگی ہونگیں اور اگر قدرتی عمل ہے تو اس پر کتنے ارتقائی قرن گذر رہے ہونگے۔ غار کہہ رہا تھا، مجھے غور سے دیکھو، میری تخلیق انسان کے بس کی نہیں۔ وہ تو کبھی کبھی یہاں پناہ لینے

آیا کرتا تھا اور اب سیر کرنے آتا ہے۔ غار سے پوچھا کہ آیا ان پناہ لینے والوں میں اصحاب کہف بھی شامل ہیں۔ جواب نہ ملا اور گہرے غار کی خاموشی اور گہری ہو گئی۔

سیاح چار چار کی ٹکڑیاں بنا کر کشتیوں میں سوار ہو گئے۔ نیم روشن غار میں وقفہ کے ساتھ چپو چلانے کی آواز سے خاموشی بھی دو نیم ہو گئی۔ حیرت تھی کہ دو چند ہوتی چلی گئی۔ کشتی دور تک غار کے دل میں اترتی گئی۔ دوسرا سرا ابھی نظر نہیں آیا کہ پہلا سرا ابھی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ غار کے اس درمیانی حصے میں پہنچ کر مسافر نے چھت اور دیواروں پر نظر دوڑائی تو اسے ٹھہرنے کے لئے کہیں چپہ بھر ہموار جگہ نہ ملی۔ ساری سطح ناہموار اور ساری جگہ اونچی نیچی۔ اس پر بنی ہوئی ہر صورت کھردری اور ہر ساخت کھرکھری پوشیدہ صورت گری کے مختلف مراحل سے گذرنے والے سارے نقش ناز ائیدہ۔ غار کی خمدار دیواروں کی کمانیوں اور ان سے مل کر بننے والی محرابی چھت دونوں پر پتھروں اور ان سے رسنے والے کیمیائی مواد سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ہر نقش دیوار یا چھت میں پیر گاڑے بے اختیار سر کے بل ہوا میں معلق تھا۔ جا بجا بئے کے گھونسلے، شہد کے چھتے، شیشے کے فانوس اور زمرد کے آویزے لٹکے ہوئے تھے۔ قدرت نے سینکڑوں سنگتراش اس غار میں مامور کئے ہوئے ہیں جن کا کام صدیاں گذرنے اور دن رات مصروف رہنے کے باوجود ادھورا ہے۔ چھت سے لٹکے ہوئے سنگتراشی کے ایسے نمونے جن کی تعمیر قدرے آسان تھی ان کے ہر ایک فٹ کی تیاری میں پوری ایک صدی لگی ہے۔ ٹھوس چٹانوں میں بنے ہوئے نمونوں کے لئے ہر ایک انچ پر کارخانہ قدرت کے مزدوروں نے دس ہزار سال صرف کیے ہیں۔ مسافر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی کشتی ایک ایسے آویزے کے نیچے سے گذر رہی تھی جو چالیس پچاس فٹ لمبا تھا اور چھت

سے لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں اور چھت میں صناعی کا مقابلہ ہوا ہوگا۔ چھت جیت گئی تو فتح کی خوشی میں دیواروں نے اسے کاندھے پر اٹھا لیا۔ کشتی ہلکورے لیتی رہی، چپّو لوریاں دیتا رہا، سیاح خواب دیکھتے رہے۔ اس خواب میں انہوں نے سنگتراشی اور نقاشی، استرکاری اور قالب کاری، شکل سازی اور سانچہ سازی کے جو نمونے دیکھے وہ دنیا کے کسی عجائب گھر میں نہیں ملتے۔ جب غار کا دوسرا سرا آیا تو دریا نے ایک بل کھایا اور زیرِ زمین غائب ہوگیا۔ چھت ایک دم نیچے آن گری اور غار کا منہ بند ہوگیا۔ ساتھ ہی خواب بھی ختم ہوگیا۔

مسافر خواب کی دنیا سے نکل کر عالمِ خیال میں داخل ہوگیا۔ یہ غار کا سفر دراصل نہاں خانۂ دل کا سفر تھا۔ اس غار میں وہی وسعت ہے جو دل میں ہوتی ہے۔ اس کے روشن حصے شعور ہیں اور تاریک حصے لاشعور۔ یہ غار زخمِ دل کی طرح رِستا رہتا ہے۔ اس کی چھت اور دیواروں کا چپہ چپہ دل کی طرح داغ داغ ہے۔ پنبہ کجا کجا نہم۔ چھت سے الٹی لٹکی ہوئی صورتیں وہ ہزاروں خواہشیں ہیں جن پہ دم نکلے یا وہ عریاں تصویریں جو ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے۔ دیواروں پر بنی ہوئی شکلیں وہ بت ہیں جنہیں لوگ صنم خانۂ دل میں سجائے رہتے ہیں۔ لیکن یہ صنم خانۂ خدا بھی تو ہے۔ اسی لئے اس شفاف اور خنک پانی کی طرح جو غار کے وسط میں بہہ رہا ہے ایک سرچشمۂ یقین دل کی گہرائیوں سے بھی پھوٹتا ہے۔ دل کا کنول اسی پانی میں کھلتا ہے اور اسی کی لہر سے زندگی عبارت ہے۔

کہتے ہیں کہ خانہ جنگی کے مسلسل دھماکوں سے اس لبنانی غار کا ایک حصہ بیٹھ گیا ہے۔ یہ خبر ضرور درست ہوگی۔ سنگین سیاسی سانحہ پر آخر دل بھی تو بیٹھ جاتا

ہے۔ سنا ہے کہ اس غار کے دہانہ پر تیغا لگا کر اسے چن دیا ہے۔ سیاحوں کا داخلہ بند ہو گیا ہے۔ ممکن ہے یہ خبر بھی درست ہو مگر اس سے مسافر کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مسافر کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں۔ جب جی چاہا آنکھیں میچ لیں، سر جھکایا، گریبان میں منہ ڈالا، دل میں جھانکا اور غار میں اتر گئے۔ کشتیٔ دل کے لئے سیل ہے عہدِ..... خیال!

(۵)

ہوائی جہاز میں ساقی گری کا عجب سماں بندھا ہے۔ عملہ ہر طرح کے مشروبات کی طرح طرح کی شکلوں والے شیشے اور پیمانے لئے تیزی سے گھوم رہا ہے، جیسے عملہ ایک مینا ہے جو گردش میں ہو۔ طشت میں سارس کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑی اونچی بوتلوں کے ساتھ تیرتی بطخ کی طرح بیٹھے ہوئے شیشے بھی سجے ہیں۔ درمیان میں وہ سہ طرفہ بوتل دھری ہے جس کی ہنستی گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے ہیں۔ بیشتر پیمانے اونچی کرسی اور بلند کانچ کی دیواروں والے ہیں۔ اور کچھ اتنے چوڑے پیندے اور اتنی نیچی دیواروں والے ہیں کہ خواہ ان میں کتنی مقدار کیوں نہ ڈالی جائے وہ تہ میں تلچھٹ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ ہر مسافر کی پسند کے مطابق بوتل کھولی جاتی ہے اور اس کے ظرف کے مطابق انڈیلی جاتی ہے۔ بعض بوتلوں پر کاگ کے بجائے سر پلا پیمانہ لگا ہوا ہے جو مقررہ مقدار کے بعد موسیقی اور ساقی گری دونوں بند کر دیتا ہے۔ عملہ کی فیاضی پر البتہ کوئی روک نہیں۔ جو منتظر ہیں ان کی نظریں عملہ پر لگی ہیں۔ جو فیض یاب ہیں وہ سیال میں نظریں گاڑے ہوئے ہیں۔ گفتگو کی بھنبھناہٹ یکایک بند ہو گئی ہے۔ سب لوگ اس بہتی گنگا میں غرق ہو گئے۔ سعدی نے منہ بند کرنے کے لئے نوالہ تجویز کیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ گلستاں ایک پرانی کتاب ہے اگر نئی ہوتی تو پیالہ درج ہوتا۔

ہوائی جہاز گھر گھر کر آنے والی کاری بدریا میں اڑ رہا ہے۔ سیاہ بادلوں کے ٹکڑے مے نوشوں کی طرح جھوم رہے ہیں۔ جہاز مینا کی طرح ان کے ہجوم میں تیر رہا ہے اور وہ اس پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ جہاز کے اندر ردش پر مسافروں کا ہجوم ہے ہر ایک جام بکف اور دوش بدوش کھڑا ہے۔ جہاز ایک میخانہ ہے۔ ہوا میخانہ بدوش ہے۔ مے نوشی کا موسم ہمدوش ہے۔ جہاز کے باہر ایک پیچیدہ نظامِ شمسی ہے اور اس کے اندر ایک الجھا ہوا نظامِ مے نوشی۔ اُدھر کشش، گردش اور ثقل ہے۔ اِدھر کشیدگی، گردش اور خمار ہے۔ حقیقت کیا ہے، کسے معلوم، سب نشے میں ہیں۔

مبصر کی آواز جو کچھ دیر کے لئے تھم گئی تھی اب پھر آرہی ہے منظر کی پاکیزگی کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ انبوہ کہساراں کی فضا اتنی پاک و صاف اور ہوا اتنی لطیف ہے کہ کثافت میں رہنے والے کیڑے اس میں دم بھر کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ انسان کا شمار بھی ان کیڑوں میں ہوتا ہے جس کثافت کا وہ عادی ہو چکا ہے اسے ذرا کم یا زیادہ کر دیں اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ وہ آکسیجن کے بغیر نہ کے ٹو کی چوٹی سر کر سکتا ہے اور نہ پشاور کی اس خوابگاہ میں زندہ رہ سکتا ہے جس میں ایک رات سوئی گیس کے بھر جانے سے اس سفر کے مبصر کی زبان ہمیشہ کے لئے بند ہونے والی ہے۔

ہوا، زندگی اور صحت کی بات چلی تو مسافر کو ایک مدرس یاد آئے۔ وہ پنشن یافتگی کے بعد ایک غیر آباد اور بلند پہاڑی پر تنہا بنی ہوئی بارک کے مالک بن گئے۔ باقاعدگی سے ہر سال وہاں گرمیاں گذارنے لگے۔ بچے اس مقام کی تنہائی سے عاجز آچکے تھے اور ہر قیمت پر واپس گرم میدانوں میں لوٹنے کے لئے مصر تھے۔ ایک بار بحث نے زور پکڑا تو بچوں نے بغاوت کر دی اور بقول مدرس منطق اور صبر کا دامن چھوڑ کر کج بحثی پر اتر

آتے۔ نیچے بولے، یہاں رکھا ہی کیا ہے بس پاگل کر دینے والی تنہائی۔ اگر جنت میں بھی یہی کیفیت ہوئی تو وہ جہنم کی گرمجوشی کو ترجیح دیں گے۔ مدرس نے کہا، تم تنہائی کی قدر نہیں کرتے جو روح کے لیے مفید ہے تو کم از کم اس لطیف ہوا کی قدر کرو جو جسم کے لیے مفید ہے۔ پھر آہ بھری اور کہا، میری طرح لمبے اور گہرے سانس کا مزہ لو، زندگی کا لطف دوبالا ہوگا اور چودہ طبق روشن ہو جائیں گے، یہ ہوا آکسیجن نہیں اوزون ہے اوزون۔ مسافر جو بوئنگ کی کھڑکی سے لگا پاک صاف فضا میں جھانک رہا تھا اسے جب مدرس کا حکم یاد آیا تو اس نے غیر ارادی طور پر اس کی تعمیل میں ایک لمبا سانس لیا۔ مشروبات کی بدبو اور سگریٹ کا دھواں اس کے پھیپھڑوں میں پہنچا تو وہ بے طرح کھانسنے لگا۔ ایک ہم نشیں نے ناک پر رومال رکھ لیا اور دوسرے ہم نشیں نے دونوں ہاتھوں میں ایک جام شراب اور اس کے تین سربمہر ڈبے سنبھالنے کی خاطر کھڑکی کی طرف پشت کر لی۔ ہوائی جہاز پہاڑوں اور وادیوں پر اڑنے کے ساتھ تجارتی مہمانداری کی بلندیوں اور پستیوں پر بھی پرواز کر رہا ہے۔

تند ہوا نے ہوائی جہاز کو دو چار جھٹکے دیئے۔ لمحہ بھر کے لئے ہوائی جہاز خزاں کے گرتے ہوئے زرد پتے سے بھی کمزور لگا۔ ایک بوتل فرش پر گری، کئی جام چھلک کر کپڑوں پر گرے۔ لوگ اپنی اپنی نشستوں کی طرف لپکے۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ ہوائی جہاز کے انجنوں نے زور باندھا، دوسرے لمحہ بادل اور طوفان پیچھے رہ گئے اور ہوائی جہاز آگے نکل گیا۔ مسافر نے کھڑکی سے دو چار بار نیچے جھانکا اور ہر بار گود میں پھیلائے ہوئے ایک انچ مساوی دو میل والے نقشہ کی مدد سے منظر کو مقام میں بدلنے کی کوشش کی۔ نیچے ایک وسیع منظر ہے۔ پہاڑ، وادیاں، جنگل اور دریا۔ معلوم ہوتا ہے وہ سب کلام اقبال کے حوالے ہیں۔ وہ مسافر سے ہم کلام ہیں۔ تو اسیر مکاں ہے، قید مقام سے گذرنا نہیں جانتا

نہ تیرے پاس طبیعت آزاد ہے نہ تیری ہوائے سیر مثالِ نسیم ہے نہ تو مثنوی مسافر کا شاعر
نہ جاوید نامہ کا زندہ رود۔ یہ نقشے خیال کی آزادی اور خاک کی بلند اقبالی میں حارج ہوتے
ہیں اور تو ہے کہ ان سے منزل کا تعین کرتا ہے۔ مسافر اس وقت فلسفہ سے بہت دور
ہے اس لئے بحث میں الجھنے کے بجائے نقشہ میں الجھ جاتا ہے۔ اس مرتبہ مقام شناسی
میں دیر نہ لگی۔ جہاز اس وقت ضلع غذر پر پرواز کر رہا ہے۔ یہ ایک گمنام ضلع ہے! ایک
بار چائے کی پیالی پینے کے لئے ذرا کی ذرا اس ضلع کے صدر مقام گاکچ میں ٹھہرے تو
صاحب ضلع کی بیگم نے گلہ کیا۔ بھلا یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے، لڑکیوں کے رشتے کی
بات شروع کرتے ہیں تو ضلع کے نام پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔

یہ سفر ہوائی جہاز کا ہے اور وہ سفر جیپ کا تھا۔ جہاں سے یہ جہاز ابھی
چند ثانیوں میں گذر جائے گا وہ علاقہ جیپ نے گھنٹوں بلکہ دنوں میں طے کیا تھا۔ مسافر
نہ اس لمحاتی سفر کو بھولنے والا ہے اور نہ اس مہاتی سفر کو۔ جیپ دریائے غذر کی محافظ
پہاڑی فصیلوں کے پہلو میں تراشے ہوئے نامکمل راستہ پر چھپکلی کی طرح پیٹ کے بل رینگ
رہی تھی۔ راستہ اتنا غیر محفوظ تھا کہ رونگٹے فوراً کھڑے ہو گئے۔ جیپ گھنٹوں اسی طرح رینگتی
رہی اور رونگٹے اسی طرح کھڑے رہے۔ انہیں منزل پر پہنچنے کے بعد بھی واپسی کے خوف
نے بیٹھنے نہ دیا۔ یہ راستہ پیادہ کے لئے سوار سے زیادہ محفوظ ہے اور پیدل چلنے والا اگر دو
چار بار راستہ کو جل دے کر پگڈنڈیوں پر اریب نکل جائے تو سوار سے پہلے منزل مار لیتا
ہے۔ لیکن کوسوں پیدل چلنے کے لئے جو فرصت اور مشق درکار ہے وہ آج کل نایاب ہے۔
شاید اگلے زمانہ میں لوگ لمبی عمریں لے کر آتے تھے اور ان میں سے ایک عمر پیدل چلنے
کے لئے علیحدہ کر لیتے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسلسل پیدل چلنے سے ان کی عمریں طول کھینچ

جاتی ہوں کیونکہ عزرائیل پیدل کی نسبت سوار کو اور مصروف کی نسبت فارغ کو پہلے جا لیتا ہے۔ فرصت اور فراغت کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں۔ فرصت کا ساعت سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایک کیفیت کا نام ہے۔ ساعت کو شکست دینا آسان ہے۔ اس کے لئے دم نزع ایک اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔ جیسے میدان جنگ میں اس جاں بلب تشنہ زخمی سپاہی کا اشارہ جس نے اپنی جان اور پانی پینے کی باری دوسرے زخمی ساتھی کے حق میں دے دی۔ یہ فراغت ان ناشکرے لوگوں کو کہاں نصیب ہوتی ہے جن کی زندگی ہر قدم اور ہر فیصلہ پر نفع نقصان کے گوشوارہ بناتے گذر جاتی ہے۔

اس روز پیدل چلنے کو جی بہت چاہا جیپ کے پہیہ اور کچی پتھریلی تنگنائے کے سرے پر لگی ہوئی ٹکر کے درمیان بال برابر فاصلہ تھا۔ یہ روک ان گھڑ پتھروں کی تھی جو تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لگے ہوئے تھے۔ کئی جگہ پتھر نصب کرنے کی جگہ بھی نہ تھی اس لئے اسے خالی چھوڑ دیا یا پتھر کو الٹا کر کے نوک کے بل کھڑا کیا ہوا تھا۔ یہ پتھر زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ اس راہ پر چلنا ہے تو سر کے بل چلو۔ کبھی کبھی جیپ کا پہیہ ایسے پتھروں سے ٹکراتا اور دیر تک ان کے کھڈ میں گرنے کی آواز آتی رہتی۔ یہ پتھر لڑھکتے ہوئے کئی ہزار فٹ کی عمودی گہرائی طے کرتے اور پھر ان کی آواز ایک سرکش پہاڑی دریا کی جلترنگ میں گم ہو جاتی۔ قراقرم کے دامن میں ان خطرناک راہوں پر سفر کرتے ہوئے پتہ چلا کہ سفر اور شعر میں ایک قدر مشترک ہے۔ مصرع تر کی صورت نظر آنے کے لئے تن شاعر میں سیروں لہو کے خشک ہونے کی شرط ہے۔ مسافر کو ایک تر منظر بھی اسی شرط کو پورا کرنے کے بعد میسر آتا ہے ریاضت کبھی رائیگاں نہیں جاتی خواہ وہ راہ خیال کی ہو خواہ راہِ سفر کی۔ میلوں تک پہلو بہ پہلو اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان صرف اتنا فاصلہ ہے جو چکی

کے دو پاٹوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اس ذرا سی جگہ میں جیپ اور دریائے غذر دونوں کے لئے گذرگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ دھوپ میں چاندی کی طرح چمکنے والا دریا یوں لگتا جیسے پن چکی کا پسا ہوا تازہ آٹا۔ جیپ کی وہی حیثیت تھی جو گیہوں کے ساتھ گھن کی ہوتی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے موڑ کے بعد ایک ایسا بیڈھب موڑ آتا جیسے اسی لمحے گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔ اس تنگ گذرگاہ پر دو ایک بار گھرے بادلوں نے سائبان تن دیا تو گویا مسافر درے کے بجائے سرنگ میں داخل ہو گئے۔ حد نظر پر ہر طرف سے پابندی لگ گئی۔ دائیں بائیں پہاڑی دیواریں نزدیک آتی چلی گئیں۔ ایک اس قدر قریب کہ چاہے تو مسافروں کو چھو لے دوسری اتنی قریب تر کہ مسافر چاہیں تو جیپ سے ہاتھ نکال کر اسے چھو لیں۔ گھنٹہ بھر کے ایسے بھنچے ہوئے سفر کے ہچکولے کھانے کے بعد یکایک دونوں طرف کے پہاڑ ایک ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ سامنے دو انتہائی کشادہ میلوں کی وادی پھیلی ہوئی تھی۔ مسافر ایک کلی کے اندر سفر کر رہے تھے جو یہاں پہنچ کر چٹک گئی۔

وادی میں داخل ہونے کے بعد مسافر ایک دوسرے کو داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ مگر یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ سامنے سے ایک جیپ آئی اور اس کیفیت کو روندتی ہوئی نکل گئی۔ ٹوٹی پھوٹی متروک ماڈل کی جیپ، نہ اگلے حصہ پر چھت نہ پچھلے حصہ پر سائبان، جگہ جگہ سے لوہا پچکا ہوا، رنگ روغن اڑا ہوا، لہراتے حلقوں پر گھسے پٹے ٹائر، ایک بمپر پر پٹرول کے ٹین اور دوسرے پر بستر بندھے ہوئے۔ اس جیپ میں نیچے لدا وا اور اس کے اوپر کم و بیش پندرہ سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان سواریوں میں

گھرا ہوا اور مٹی کی دبیز تہ کے نیچے چھپا ہوا ایک غیر ملکی چہرہ بھی تھا۔ اس کا پیلا رنگ خاکستری غازہ نے گندمی بنا دیا تھا۔ وہ پاکستانی لگتا تھا حالانکہ جاپانی تھا۔ وہ مہم جو تھا اور دیر چترال سے ہوتا ہوا درہ شندور کے راستہ غذر میں داخل ہوا تھا۔ کسی نے پوچھا "یہ اتنی دور یہاں کیا لینے آیا ہے اور ٹوکیو سے شندور تک کا خرچ کون برداشت کریگا۔"

اس سوال کی تہ میں یہ فکر بھی کار فرما تھی کہ بیشمار مراعات حاصل ہونے کے باوجود اس سفر میں مسافروں کا خرچ حساب اور توقع سے زیادہ کیوں ہو رہا ہے۔ مسافر نے کہا۔ اس جاپانی سیاح کا خرچ بھی تو ہم لوگ برداشت کر رہے ہیں۔ ہم جاپانی لینڈ کروزر جیپ میں سوار ہیں، ایک کی گھڑی سٹیزن ہے دوسرے کی سیکو، سفری ریڈیوگرام نیشنل ہے، کیسٹ سونی کے ہیں، کیمرہ کینن ایف ٹی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سیاح کی فارغ البالی میں ہماری شاہ خرچی شامل ہے۔ رہا اس کا یہاں تک آنا تو اس کی وجہ بھی سادہ سی ہے، مہم جوئی اس کی زندہ تہذیب ہے اور ہماری مردہ تاریخ۔

وادی میں سڑک کے کنارے اکا دکا گھر نظر آنے لگے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ بستی آنے والی ہے۔ اتنے میں مسافر کو کھیتوں میں تنہا کھڑی ایک چٹان نظر آئی۔ چاروں طرف ہرے اور پیلے کھیت، بیچ میں سہ منزلہ مکان جتنی بلند اور سیدھی چٹان جو پہاڑوں سے کٹ کر یوں کھڑی تھی جیسے گلہ سے گم ہو جانے والی بھیڑ۔ اس چٹان کے نیچے ایک جھونپڑی تھی، تین دیواریں سرکنڈوں کی اور چوتھی یہ چٹان۔ مسافر کو یہاں سے بہت دور واقع وہ گھر یاد آیا جو ایک آئی سی ایس زمیندار نے اپنی نئی بیگم کے لئے بنایا تھا۔ گھر کا ہر کمرہ علیحدہ طبقہ پر واقع ہے۔ کہیں دو سیڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں تو کہیں چار نیچے اترتی ہیں کہیں محض ڈھلوان ہی سے دو

طبقوں کو ملانے کا کام لیا ہے۔ ڈرائنگ روم میں پوری ایک چٹان شامل ہے، روشندان اس چٹان کے اوپر ہیں اور آتش دان اس چٹان کے نیچے۔ مدت ہوتی صاحب خانہ نے ایک بار مسافر کو بطور خاص اپنے دفتر میں بلایا اور زمینداری نظام کی خوبیاں سمجھانے کی کوشش کی۔ مسافر جو ان دنوں تعلیم سے نیا نیا فارغ ہوا تھا قحط بنگال کے کمیشن کی رپورٹ کی دوسری جلد کے ایک اختلافی نوٹ کا حوالہ دینے لگا۔ فرمایا ان کے لکھے پر نہ جاؤ، میری زمینوں پر جاؤ۔ دیکھو وہاں میرے مزارع ساتھ کے گاؤں کے چھوٹے مالک سے زیادہ خوشحال ہیں۔ مسافر نے دو مختلف اضلاع میں ان کی زرخیز زمینیں دیکھیں۔ ایک کی کاشت جدید دوسرے کے باغ لذیذ۔ عرصہ کے بعد ان کی دو رہائش گاہیں دیکھیں، ایک کی سجاوٹ خوب اور دوسرے کی ساخت خوب تر۔ اس دوسرے دولت خانہ کو ایک چٹان نے دلفریب اور پراسرار بنا رکھا تھا۔ جب مسافر نے وادی گوپس کے ایک غریب خانہ میں بھی چٹان کو اسی انداز سے شامل پایا تو اسے اس عجیب و غریب اتفاق پر حیرت ہوئی۔ ایک کسان دوسرا زمیندار، ایک کی زمین پہاڑی دوسرے کے مربعے نہری، ایک محض رعایا دوسرا اعلےٰ افسر۔ دونوں صاحب خانہ باذوق ہیں۔ ان کے گھر چٹانوں سے ٹیک لگائے کھڑے ہیں۔ لیکن ایک شخص کے گھر میں پتھریلی چٹان ایک سنگین مذاق ہے اور دوسرے کے یہاں ناہمواری کا سنگِ میل۔

بستی میں داخل ہوئے تو راستہ تنگ ہونا شروع ہو گیا۔ مکان ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ اور ہر ایک مکان کے ساتھ ایک باغ تھا۔ ایک دو کمرے کا مکان اور احاطہ کے اندر دو تین مرلہ کا باغیچہ۔ مکان کے کھڑکی دروازے گلی میں کھلتے اور باغ کی دیوار کے شگاف سے نالے کا پانی باہر نکلتا اور گلی کے پار کسی گھر میں نقب لگا کر گھس جاتا۔ کمروں

کی دیواریں مصالحہ سے چنے ہوئے پتھروں سے بنی ہوئی تھیں اور پایئں باغیچوں کے گرد پارے کی دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ دونوں طرح کی دیواریں دونوں جانب بنی ہوئی تھیں بیچ میں جو ذراسی جگہ بچ گئی جس میں مرغیاں اور بچے کھلے پھر رہے تھے وہی یہاں کی شاہراہ شیر شاہ سوری تھی۔ اس شاہراہ پر چلنے والی جیپ کی چھت خوبانیوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی شاخوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جیپ کی آواز سن کر کھڑکیوں کے پٹ کھلنے لگے اور خوبانی جتنی بڑی آنکھیں ان میں سے جھانکنے لگیں۔

بستی کے بیچوں بیچ گذرنے والے راستہ میں دو چار اندھے موڑ تھے۔ ہر ایک اتنا تنگ کہ جیپ کو آگے پیچھے کرنے اور دیواروں سے رگڑ کھانے کے بعد مڑنا نصیب ہوتا۔ بالآخر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ ایک ایسے موڑ پر دوسری طرف ایک ٹریکٹر اور اس کی ٹرالی پھنسی ہوئی تھی۔ ادھر یہ لدی پھندی جیپ کھڑی تھی۔ لوگ جمع ہوگئے۔ اقوام متحدہ کے اجلاس کا نقشہ جم گیا۔ دو پسماندہ ملک اپنے سفر پر نکلے۔ ان کا راستہ بڑی طاقتوں کی فوجی دیواروں اور تجارتی مصلحتوں کے بیچ وخم نے اتنا تنگ کر دیا کہ ان دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ کون پہلے پیچھے ہٹے۔ کون کتنا آگے بڑھے۔ کونسی دیوار سے چند پتھر سرکا کر راستہ چوڑا کیا جائے۔ جیپ کو وہاں اس بحث میں الجھا ہوا چھوڑ کر سواریاں پیدل ریسٹ ہاؤس کی طرف روانہ ہوگئیں۔ ریسٹ ہاؤس میں فوج کے تعمیراتی شعبہ کے افراد نے چھاؤنی ڈالی ہوئی تھی ایک کمرہ دو گھنٹہ کے لئے خالی کر دیا گیا اور کمرے کے ساتھ ان کا سامان بھی مسافروں کے تصرف میں آ گیا۔ مسافر بستر پر لیٹ گیا۔ تکیہ کے غلاف پر سرخ اور سبز ریشمی دھاگہ سے کشیدہ کاری کی ہوئی تھی۔ کڑھے ہوئے پھول اور پتے بیوی کے ذوق کا پتہ دے رہے تھے۔ تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی کتاب سے شوہر کے شوق کا پتہ چلتا تھا۔ اس کتاب کا عنوان تھا ایمان

فردشوں کی کہانیاں عرف صلاح الدین ایوبی کے دور میں دشمن عورتوں کی کارگذاریاں۔

مسافر کا جی چاہا کہ وہ اس کارآمد کتاب کو سبقاً سبقاً پڑھے اور جب ہر بات ذہن نشین ہو جائے تو زمانہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے تاکہ وہ صلاح الدین ایوبی کے عہد میں پہنچ کر اور اس کی فوجوں میں شامل ہو کر ایسی مثالی زندگی بسر کرے کہ دشمن اور اس کی عورتوں کی کوئی چال بھی کارگر ثابت نہ ہو۔ تاریخ پڑھتے ہوئے اکثر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اگر قاری تاریخ کے اس موڑ پر کھڑا ہوتا تو وہ ہرگز ایسی فاش بلکہ فحش غلطی نہ کرتا جو تاریخ کے اس عظیم کردار نے کی جس کا حال وہ پڑھ رہا ہے۔ اس احساس برتری کو البتہ اس وقت ایک برقی جھٹکا لگتا ہے جب قاری اپنے ملک اور منطقہ کی حالیہ تاریخ پر بے بسی کی نظر ڈالتا ہے۔

وادی اور بستی دونوں دریا کے جنوب میں واقع ہیں۔ دوسرا کنارہ ذراسی جگہ چھوڑ کر باقی تمام تر پتھریلا اور بے آب و گیاہ ہے۔ وہ ذراسی جگہ اس سنگلاخ ویرانہ میں ایک سرسبز گوشہ ہے۔ آس پاس کی ویرانی کی بدولت وہ اپنی شادابی سے کہیں بڑھ کر شاداب نظر آتا ہے۔ اس جگہ کا نام آب حیات ہے اور وہاں گوپس کے راجہ کا گھر ہے۔ اصلاحات کے بعد وہ نام کے راجہ رہ گئے ہیں حالانکہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۳ء تک وہ اس پورے علاقہ پر پورا اختیار رکھتے تھے۔ اب وہ صرف حسن علی مقپون ہیں۔ بوڑھے، وضعدار، مہمان نواز اور اگلے وقتوں کی ایک اچھی یادگار۔ دوپہر کا کھانا مسافر نے راجہ صاحب کے ساتھ کھایا۔ جھولا پل کو پار کیا اور ایک خراب پتھریلے راستہ سے گذر کر آب حیات منزل پہنچ گئے۔ محرابی صدر دروازے کے چوبی پٹ کھلے تھے۔ دروازہ بہت پرانا تھا۔ جیپ کو اندر داخل ہونے میں وقت لگا اور مشکل پیش آئی۔ صحن میں راجہ صاحب

دونوں ہاتھ کھولے بغلگیر ہونے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ مسافر کو راجہ صاحب کے فراخ اور مہمان نواز دل میں داخل ہونے میں نہ دقت لگا نہ کوئی مشکل پیش آئی۔

طویل قامت، چھریرا بدن، روشن اور مہربان آنکھیں، سرخ و سپید رنگ۔ راجہ صاحب نے چترالی ٹوپی پہن رکھی تھی اور اچکن کے سارے بٹن بند تھے اچکن پرانی تھی، کالر اگر تنگ ہو چکا ہوگا تو کھلا ہوگا ورنہ بند ہوگا۔ دیکھنے والے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کیونکہ ان کی داڑھی سفید مگر گھنی اور لمبی تھی۔ سبزہ زار میں بادام کے پیڑ کے نیچے صوفے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی پلنگ بچھا ہوا تھا جس پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر راجہ صاحب بیٹھ گئے۔

سامنے پتھر کا دو منزلہ سادہ سا بنگلہ تھا جس کے ایک کنارے چیری کے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ ہر شاخ نے کان میں بدخشانی آویزے پہن رکھے تھے۔ ہر درخت کے نیچے شاخوں کے گھیر تک سبزے پر پکے پھل گرے ہوئے تھے جیسے بہت سی بیر بہوٹیاں گھاس پر چلتے ہوئے ذرا دیر کے لئے رک جائیں۔ راجہ صاحب کی وضعداری یہ ہے کہ ان درختوں سے پھل توڑ کر کھانے کی عام اجازت دے رکھی ہے۔ اصول یہ ہے کہ پھل جی بھر کر کھا سکتے ہیں مگر اتار کر آب حیات منزل سے باہر نہیں لے جا سکتے۔ اور شان یہ ہے کہ وہ فاضل پھلوں کو بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ندیدہ پن، ذخیرہ اندوزی، اور دکانداری، تینوں کے دروازے بند ہیں۔ بس ایک مہمان نوازی کی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر سلمان اور عالیہ چیری کے درختوں کی شاخوں میں لگے خوشوں سے خوشیاں چننے میں لگ گئے۔

سبزہ زار کے ایک تختہ پر نشست جمی تھی۔ دوسرے پر آڑو کا باغ تھا تیسرے پر انار کا۔ اس کے بعد سیب شہتوت ناشپاتی اور امرود کے تختے علیحدہ علیحدہ یا ملے جلے تھے۔ خوبانی البتہ ہر طبقہ پر جا بجا اگی ہوئی تھی۔ اوپر سے ایک چھوٹا سا چشمہ آتا ہے۔ پہلے

گھر میں داخل ہو کر پانی بھرتا ہے پھر باغ کے تختوں سے ہوتا ہوا جو ذرا سا بچ رہتا ہے وہ دریائے غذر میں جا گرتا ہے۔ بچوں نے چیری کے علاوہ ہر قسم کے پھل دار درخت سے ایک آدھ پتّہ بھی توڑ لیا۔ سارے پتے راجہ صاحب کے آگے پلنگ پوش پر پھیلا دیئے۔ وہ ہر ایک کا مقامی نام اور اس کی خصوصیات بڑے انہماک سے بتانے لگے۔ بچوں نے سبق لکھنے کی خواہش ظاہر کی تو راجہ صاحب نے نو ضرب بارہ کا ایک کاغذ دینا چاہا۔ مسافر نے یہ ہدیہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ گوپس کی آب حیات منزل تک پہنچنے کے لئے کاغذ کو سینکڑوں میل کا فاصلہ ہوائی جہاز اور جیپ سے طے کرنا پڑتا ہے۔ کمیابی اور اور قیمت کے لحاظ سے وہ کاغذ کے ورق کے بجائے چاندی کا ورق بن جاتا ہے۔ مسافر کو یہ بات گوارہ نہ تھی کہ راجہ صاحب کا ایک کاغذ بھی کم پڑ جائے کیونکہ چارپائی اور تپائی پر پھیلے ہوئے کاغذات اور مجلد کاپیوں سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ راجہ صاحب اپنی سوانح لکھنے میں مصروف ہیں۔ سوانح کا مسودہ دیکھنے کی اجازت ملی تو مسافر نے بکھرے ہوئے کاغذات میں دیباچہ کی تلاش شروع کی۔ ادھر راجہ صاحب بھی مختلف مجلد کاپیوں کی ورق گردانی میں مصروف ہو گئے۔ مسافر کے ہاتھ ایک کاغذ لگا اس کے سرنامہ پر لکھا تھا۔ بنام مہربان دوست ڈپٹی کمشنر بہادر۔ مسافر کو بدگمانی ہوئی کہ یہ ظاہری رکھ رکھاؤ محض دکھاوا ہے ورنہ یہ شخص یوں عرض گذار نہ ہوتا۔ مگر اس تحریر کو پڑھا تو وہ نہ عرضی تھی نہ عرضداشت بلکہ ایک مشورہ تھا دوستانہ اور بزرگانہ۔ مسافر نے راجہ صاحب کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ یہ ایک ایسے شخص کا چہرہ ہے جو اپنی تکلیف کو ضبط کے ساتھ برداشت کرے گا مگر اپنے خاندان کی خدمات گنانے اور اپنی وفاداری کی قیمت مانگنے کے لئے عرضیوں کا ہاتھ نہیں پھیلائے گا۔ راجہ صاحب کے پاس اب دے کے

چند یادیں اور ایک وضعداری بچی ہے۔ وہ اس سرمایہ کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور اس احتیاط کے پیش نظر کہ دیکھنے والے کو ان کے سینے کے داغ نظر نہ آجائیں وہ اچکن کے نظر آنے والے تمام بٹن بالالتزام بند رکھتے ہیں۔ اچکن کا گلا کھلا ہے یا بند، اس کا حال اسے معلوم جو شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔

وضعداری کی بنیاد یہ جذبہ ہے کہ انسان اپنی نظروں میں نیچا نہ ہو جائے اس بنیاد پر لوگوں نے طرح طرح کی عمارتیں بنا رکھی ہیں۔ ایک عمارت کا ذکر راجہ صاحب نے کیا۔ گوپس کے قرب و جوار کی بات پامیر تک جا پہنچی تھی۔ انہوں نے کاغذ پر ایک نقشہ بنایا۔ دریائے غذر میں دو دریا آکر ملتے ہیں، ایک اشکومن اور دوسرا یاسین۔ ان کے منبع کے رخ پہاڑوں میں چلتے جائیں تو چند دشوار گذار برفانی درے پار کرنے کے بعد دریائے یارخون آتا ہے۔ اس سے کچھ دور پاکستان کی سرحد ہے۔ دوسری طرف پامیر ہے جس کا ایک حصہ افغانستان میں ہے اور دوسرا روس میں۔ اس سطح مرتفع کا موسم سخت اور لوگ سخت کوش ہیں۔ سوکھی گھاس اور سدابہار وضعداری کے سوا اس سرزمین میں اور کچھ نہیں اگتا۔ راجہ صاحب وضعداری کی مثال دینے لگے۔ پامیر کے کسی خانہ بدوش گلہ بان کو سال بھر کے لئے قرضہ دینے کے بعد اگلے برس صحرا میں اس کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بعد جب اس کا خیمہ ملے تو آپ اس سے قرض کی واپسی کا تقاضہ نہیں کر سکتے۔ قرضخواہ بڑھ کر اپنا تعارف کراتا ہے کہ مہمان اور محتاج ہوں۔ یہ سنتے ہی گلہ بان روایتی وضعداری کے جذبہ سے مغلوب ہو جاتا ہے اور قرضہ کی پائی پائی محتاج کو خیرات کر دیتا ہے۔

مسافر نے تیزی سے راجہ صاحب کی زیر تصنیف سوانح کا دیباچہ پڑھا۔

ان کا خط عرائض نویس جیسا تھا اور عبارت فورٹ ولیم کالج جیسی ۔ دیباچہ قادر مطلق کی حمد سے شروع ہو کر اس کی قدرت کی بوقلمونی سے ہوتا ہوا اور پیدائش کے مختلف مراحل سے گذرتا بچپن کی بے بسی کے ذکر تک جا پہنچتا ۔ وہاں سے انسان کی ناسپاس گذاری کے اعتراف کے بعد اس توفیق کا شکر ادا کرنے پر ختم ہوتا جو قابل فخر اسلاف اور قابل اعتماد اخلاف کے درمیان پچھتر برس عمر گذارنے کے بعد مصنف کی جانب سے پروردگار کے حضور لازم آتا ہے ۔ مسافر نے راجہ صاحب کو سوانح جلد مکمل کرنے اور چھپوانے کا مشورہ دیا ۔ کیونکہ وہ ایک ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے پہاڑوں کی طــــرح خاموش ہے اور تاریخ کے گواہوں کی فہرست میں اس کا نام ہی نہیں آتا ۔ راجہ صاحب ۴۸-۱۹۴۷ء کے جہاد کشمیر کا تاریخی چشم دید حال بیان کرنے لگے ۔ کہنے لگے میرے ساتھیوں کے پاس سردیوں میں جوتے تک نہیں تھے وہ پاؤں پر رسیوں سے کپڑے اور کھالیں لپیٹے ہوئے لڑ رہے تھے ۔ یہ سنا تو کسی نے فرمائش کی کہ راجہ صاحب اپنی زندگی کا سب سے بڑا تاریخی واقعہ سنائیں ۔ راجہ صاحب ہنس دیئے ۔ کہنے لگے آپ کو واپسی کی جلدی ہے اور میری پون صدی کی زندگی ایک ہی نہج پر ٹھہری ہوئی ہے ، کیا سناؤں کیا نہ سناؤں ۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ جو بھی یہاں آتا ہے وہ ان پہاڑوں سے واپس میدانوں میں لے جانے کے لئے واقعات کی سوغات چاہتا ہے ۔ سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے سابق کرنل یہاں ریزیڈنٹ بہادر بن کر آئے تو پوچھنے لگے اس گوشہ کو آب حیات کیوں کہتے ہیں ۔ میں نے کہا اس لئے کہ یہاں کبھی کسی کو موت نہیں آئی ۔ شائد انہوں نے قسم کھانے کے لئے کہا سو میں نے کھا لی ۔ بس پھر کیا تھا ، کرنل صاحب نے بڑے وثوق سے کسی سرکاری دستاویز میں یہ درج کر دیا کہ گوپس میں ایک جگہ

آبِ حیات ہے جہاں کے لوگ خضر کے ہم عمر اور ہم عصر ہیں ۔ بات محض اتنی سی تھی کہ اس ویرانہ میں پہلے کوئی آبادی نہ تھی لہٰذا ملک الموت کا ادھر آنا جانا ہی نہ تھا ۔ میں نے اسے آباد کیا، گھر بنایا، باغ لگایا، کنبہ اور ملازمین کو ساتھ لے کر چند سال سے یہاں مقیم ہوں ۔ الحمد للہ کہ تا حال دریا کے اس کنارے کی واحد اور نئی آبادی میں سب بقید حیات ہیں ۔ لہٰذا میں قسم کھا کر یہ کہتا ہوں کہ آبِ حیات میں کبھی کسی کو موت نہیں آئی ۔ لیکن موت برحق ہے ۔ جب ملک الموت قرضخواہی کے لئے آئے گا تو کوئی قرض دار انکار نہ کر سکے گا ۔ میں نے قرض چکانے کی پوری تیاری کر رکھی ہے ۔ راجہ صاحب نے اٹھ کر باغ کے گوشہ سے نظر آنے والی پہاڑی سڑک کی طرف اشارہ کیا جو دو میل کے فاصلہ پر ایک چٹان تک جا کر ختم ہو جاتی ہے ۔ چٹان پر راجہ صاحب نے جیتے جی اپنی قبر بنوا رکھی ہے ۔ اس چٹان سے پوری وادی نظر آتی ہے ۔ مسافر نے مشرقی یورپ کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک قبر دیکھی تھی ۔ مرنے والا پہلے ڈاکو تھا، پھر بادشاہ بنا اور بالآخر عیسائی چرچ کی ولایت پر فائز ہوا ۔ اس کی وصیت تھی کہ جس علاقہ اور جن لوگوں سے میں نے محبت کی ہے مرنے کے بعد بھی میں انہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں ۔ ایک کھیپ ان مرنے والوں کی ہوتی ہے جو مبالغہ آمیز سوانحی تذکروں اور عظیم الشان مقبروں کی خواہش لے کر مرتے ہیں ۔ ایک دبی دبی خواہش مسافر کی والدہ محترمہ کی تھی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے کسی شہید کی قبر کے پاس جگہ ملے اور برملا خواہش والد محترم کی تھی کہ ناموس رسولؐ کی پاسداری میں شہید ہونے والے غازی علم الدینؒ کے مزار کے پاس جگہ ملے ۔ ایک خواہش مفتی محمد حسنؒ کی تھی جو بے روح جسم کے لئے صرف اتنی رعایت چاہتے تھے کہ وہ ایسی جگہ دفن ہو جہاں اذان کی آواز آتی رہے ۔ یہ تینوں خواہشیں بالآخر

پوری ہو کر رہیں ۔

حاکمانہ روایت کے مطابق ایک صبح مسافر اور اس کے ساتھی دریائے غذر میں ٹروٹ مچھلی کے شکار کی مہم پر نکلے ۔ انتظام کرنے والوں نے چوبیس گھنٹے پہلے دریا کے بائیں کنارے میل بھر کا ٹکڑا منتخب اور محفوظ کر رکھا تھا ۔ گاؤں سے تین مانے ہوئے شکاری بھی بلائے گئے ۔ ان کی بدیسی بنسیاں اور پُرفریب کانٹے مسافر کے ساتھیوں میں تقسیم کر دیئے گئے اور انہیں بانسوں کی مدد سے عارضی بنسیاں بنانی پڑیں ۔ پھر ان کو ہدایت دی گئی کہ وہ تینوں شکاری دائیں کنارے پر چھ سات میل دور نکل جائیں اور رات کے کھانے کے لئے جتنی مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں وہ وقت پر لے آئیں ۔ شکاری پیدل نکل گئے مسافر کے ہمراہی جیپ پر سوار ہو گئے ۔ سہ پہر کو دونوں فریق جمع ہوئے ۔ ہمراہیوں نے کامیابی کی سند کے طور پر بیس پچیس مچھلیاں پیش کیں جو دریا کے اس حصہ سے پکڑی تھیں جہاں وہ کف دریا کے ساتھ سر بکف کنارے پر آ جاتی تھیں ۔ یہ مچھلیاں ان کے علاوہ تھیں جو کانٹے میں پھنسنے کے بعد اپنی گلوخلاصی کرانے میں کامیاب ہو گئیں یا پکڑ کر کنارے پر رکھی گئیں مگر تڑپ کر پانی میں جا گریں ۔ ان تین شکاریوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ کسی خدمت کے لائق نہ نکلے اور انشاء اللہ آئندہ کسی موقع پر اس کوتاہی کی تلافی کریں گے ۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک کے پاس فرداً فرداً اتنی مچھلیاں تھیں جتنی ہمراہیوں کے سارے ہجوم نے مل کر پکڑی تھیں ۔ مسافر نے ان سے وہ مصافحہ کیا جو ہاتھ اوپر اٹھانے، سفید جھنڈا لہرانے اور ہتھیار ڈالنے کے مساوی ہوتا ہے ۔ انعام دینا چاہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا ۔ جب وہ تینوں دوست جو معمولی فرق کے ہم عمر نظر آ رہے تھے رخصت ہونے لگے تو مسافر نے یونہی پوچھ لیا کہ کیا تینوں ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں ۔

جواب ملا ایک گھر کے۔ پھر ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا اور کہا یہ میرے والد صاحب ہیں۔ دوسرے نے تیسرے کی طرف اشارہ کیا اور کہا، یہ میرے والد صاحب ہیں۔ مسافر نے اس تیسرے شخص کی طرف دیکھا جو ایک کا والد اور دوسرے کا دادا تھا۔ یہ شخص صبح پانچ پہاڑی میل چل کر آیا۔ دوپہر سے سہ پہر تک اس نے دس ویسے ہی میل مچھلی پکڑنے اور لانے کے لئے طے کئے۔ اب پھر پانچ میل چل کر گھر پہنچیگا۔ اور اس شخص کی عمر ستر برس سے زاید ہے۔ شاید اس وادی میں جگہ جگہ آب حیات کے چشمے بہتے ہیں۔

مسافر نے چلتے چلتے ان سے کام کاج کے بارے میں پوچھ لیا۔ سوال غیر ضروری لگا۔ کیونکہ وہ شکل صورت سے غریب کاشتکار لگتے تھے۔ جواب ملا یہاں کھیت کہاں ہیں کہ کوئی کھیتی باڑی کرے۔ پہاڑ اور جنگل ہے۔ اس لئے سردیوں میں لکڑیاں چیرتے ہیں اور گرمیوں میں جانور چراتے ہیں۔ یہ سن کر مسافر کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اسے لکڑ ہاروں اور چرواہوں سے بڑا انس ہے۔ اور یہ اس وقت پیدا ہوا جب وہ کہانیاں سننے کی عمر سے گذر رہا تھا۔ اس کی خاطر اس کے والد محترم نے چند کہانیاں بھی لکھیں جنہیں جامعہ ملیہ نے پہلے رسالہ پیام تعلیم میں قسط وار اور پھر کتابی صورت میں چھاپا۔ دو کہانیاں بہت مقبول ہوئیں، ایک شہزادی گلنار اور دوسری خوشحال لکڑ ہارا اور اس کے بیٹے۔ مسافر کو اندازہ ہے کہ وہ لکڑ ہارا کون تھا مگر اس کے باوجود وہ ایک عرصہ سے خوشحال لکڑ ہارے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ سفر پہاڑوں کا ہو کہ ریگستانوں کا وہ ہر دور افتادہ جگہ پر ملنے والے لکڑ ہارے اور چرواہے کو دیکھ کر ٹھٹھک جاتا ہے۔ شاید یہی وہ کہانی والا شخص ہے جو اتنا پر نظر تھا کہ جب اسے جنگل میں سرا ہے ایک خزانہ ملا تو اس نے لینے

سے انکار کر دیا اور اپنے بیٹوں سے کہا، اگر تمہیں دولت کی تلاش ہے تو پہلے تمہیں ایک دوسرے باپ کی تلاش کرنی ہوگی۔ زندگی خود ایک دولت ہے۔ اور قانع زندگی سب سے بڑی دولت ہے۔ اس دولت کو سیم وزر کی تلاش میں ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

مسافر نے سلسلہ کوہ قراقرم میں کئی بار چرواہوں کی تلاش کی مگر یوں لگتا ہے جیسے کاندھے پر آنکڑے والی لاٹھی رکھے، رکھوالی کتے کو ساتھ لئے، منہ سے صرف جانوروں کی سمجھ میں آنے والا حرف ندا بار بار نکالنے والا چرواہا ان پہاڑوں میں ہوتا ہی نہیں۔ ان راہوں میں کئی بار بھیڑ بکریاں دیکھ کر جیپ روکی۔ جتنی بھیڑ بکریاں تھیں اتنے ہی بچے آس پاس پھرتے نظر آئے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں ننھے ننھے بہن بھائیوں کو گودیں لئے دہری ہوئی جا رہی تھیں۔ گودیں دودھ پیتے سر پر بندر ٹوپی پہنے بچے پھسل پھسل جاتے اور پھر جھٹکے سے انہیں اوپر کیا جاتا۔ مسافر بچوں کو آواز دیتا۔ آواز سنتے ہی بچوں میں بھگدڑ مچ جاتی۔ وہ سب تتر بتر ہو کر بھاگنے لگتے۔ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے اگر مسافر پیچھا کر رہا ہو تو بڑے زیادہ تیز ہو جاتے اور چھوٹے رونے لگ جاتے۔ پھر مسافر ٹھہر جاتا اور وہ سارے بچے ایک محفوظ فاصلہ پر منڈیر یا نالی کا مورچہ بنا کر اکٹھے ہو کر اس کا معائنہ کرتے۔ مسافر کیمرہ اٹھاتا تو کچھ بچے پھر بھاگنا شروع کر دیتے، دو چار پیٹھ پھیر لیتے اور ایک آدھ دلیر ڈٹ کر کیمرہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اس کے بعد فاصلے سکڑ جاتے۔ مسافر بسکٹ سنترے یا سینڈوچ پیش کرتا۔ آگے بڑھ کر لینے والا کوئی نہ ہوتا۔ رکھ کر پیچھے ہٹ جائیں تو جھپٹ پڑتے اور لڑنے لگتے۔ اتنے میں ان کو بھیڑ بکریاں یاد آ جاتیں جو اس اثنا میں دور نکل جاتیں۔ بچوں کا ریوڑ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کے پیچھے نکل جاتا۔

ایک وہ چرواہا بھی تھا جو خزدار اور لس بیلہ کے درمیان دیکھا تھا۔ جون کا گرم مہینہ اور وہ پہلا زمانہ تھا جب ان دونوں بستیوں کے درمیان صرف اونٹوں پر سفر ہوتا تھا۔ مہینہ میں ایک آدھ سرپھرا اس بے نشان راستہ پر جیپ کا سفر کرتا مگر راستہ بتانے کے لئے کسی ساربان کو ساتھ بٹھا لیتا۔ مسافر رات، دو بجے روانہ ہوا۔ چار بجے ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ آٹھ بجے ہر شے تپ رہی تھی۔ مسافر نے موٹے کپڑے کے کھلے شلوار کرتے کے اوپر احرامی تقطیع کا تولیہ بھگو کر سر اور جسم پر لپیٹا ہوا تھا۔ سامان میں ایلومینیم کا ناشتہ دان تھا جس میں دوپہر کے لئے رس مسا گوشت سالن تھا۔ دوپہر سے کہیں پہلے وہ سالن پھنکیاں بن کر ابل گیا۔ بلبلے اٹھتے اور بند ناشتہ دان میں سیلے پٹاخوں کی طرح پھس سے پھٹ جاتے۔ ہچکولے کھاتی جیپ اندر سے اتنی گرم تھی کہ دستہ کو دیر تک تھام کر بیٹھیں تو ہاتھ جل جائیں۔ گذر ایسی چٹانوں سے تھا جو جل کر کوئلہ بن گئی تھیں۔ وڈھ سے گذرنے کے بعد جیپ کو پورالی دریا کے خشک پتھریلے راستے پر ڈال دیا۔ دونوں طرف تپتی پہاڑیاں تھیں اور بیچ میں گرم پتھروں سے پٹا ہوا راستہ۔ سورج سوا نیزے پر تھا اور سائے کو کہیں اماں نہ ملی تو وہ پتھروں کے نیچے چھپ گیا۔ اتنے میں جیپ ایک ابھری ہوئی چٹان کے پاس سے گذری۔ یہ چٹان ایک سوجے پھولے ہونٹ کی طرح باہر نکلی ہوئی تھی اور اس ابھار سے دو چار گز زمین پر سائبان تن گیا تھا۔ اس ذرا سے سائے میں نیم گرم سنگریزوں پر ایک چرواہا لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر اس کی عورت کی گود میں تھا جو اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ چند بکریاں پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر عمودی چٹانوں پر ایسے چڑھ رہی تھیں جیسے چھپکلیاں دیوار پر رینگ رہی ہوں۔ وہ ان ڈھیٹ سوکھی گھاس کی جڑوں کے گچھے تلاش کر رہی تھیں جو ایسے بے محابا گرم موسم میں

پتھروں کی درزوں میں گوریلوں کی طرح چھپی بیٹھی تھیں اور ہتھیار ڈالنے سے انکاری تھیں۔
جینے کی امنگ، بھوک کے مطالبے، محبت کے تقاضے یہ سب خواہشیں بڑی ڈھیٹ
ہیں۔کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔خواہ وہ گھاس ہو خواہ بکریاں خواہ چرواہا۔

گوادر کی بندرگاہ کے سامنے دور تک بحیرہ عرب ہے اور پچھواڑے بہت
دور تک صرف ریگستان۔ایک بار مسافر ساحلی محافظوں کے کرنل کے ہمراہ اس ریگستان
کے اندر دور تک چلا گیا۔مسافر کو شکار کا شوق نہیں مگر پھر بھی وہ ان علاقوں میں،جہاں
شکاری اپنی غرض لے کر جاتے ہیں گاہے بے غرض نکل جاتا ہے۔صحرا میں ایک جگہ
خاردار خشک جھاڑیوں کے پاس ایک ٹنڈ منڈ درخت اینٹھن کی حالت میں ایسے کھڑا تھا
جیسے درد کی شدت سے ابھی زمین پر لوٹنے لگے گا۔اس کے نیچے ایک چرواہا بیٹھا ہوا تھا
جو اجنبی چہروں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔پختہ عمر،خوش مزاج،خاموش اور با ہوش۔
مسافر دیر تک اس سے گفتگو کرتا رہا جو اگرچہ براہ راست تھی مگر اسے مترجم کے سہارے کی
ضرورت اس وقت پڑ جاتی جب وہ چرواہا عربی فارسی اور بلوچی روزمرہ کو اردو سے خلط ملط
کرتا تھا۔گوادر کی بندرگاہ سے بادبانی کشتی میں چلیں تو ہوا اسے سیدھا مسقط لے جاتی
ہے۔ملاح وہاں سے چنگی چوری کا سامان اور عربی الفاظ کشتی میں بھر لیتے ہیں۔فارسی الفاظ
خشکی کے راستہ اونٹوں پر چڑھ کر آتے ہیں۔بلوچی مقامی زبان ہے اور اردو قومی۔اس
چرواہے کے ریوڑ میں ان ساری زبانوں کے محاورے جمع تھے۔مسافر نے چرواہے سے
معاشیات کا وہ سبق سیکھا جو کسی کتاب میں نہیں ملتا۔وہ اس سے گذر اوقات کی تفصیل
پوچھ رہا تھا۔چرواہے نے کہا سیدھی سی بات ہے۔اگر بکریاں تیس ہوں تو روٹی ایک
وقت ملتی ہے۔ساٹھ ہوں تو دو وقت ملتی ہے۔سو ہوں تو بھوکا مرتا ہوں۔مسافر کا سارا

کتابی علم دھرا رہ گیا۔ اس نے اقرار کیا کہ یہ سیدھی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ چرواہا بولا' میری کوئی بکری نہیں۔ میں راکھی ہوں۔ لوگ ہر شش ماہی مجھے اپنی بکریاں چرانے کے لئے دیتے ہیں۔ عوضانہ ایک روپیہ فی بکری فی ماہ کے حساب سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دودھ میرا اور بچے ان کے۔ جب آمدنی کا دارومدار تیس بکریوں تک چھوٹے سے گلے پر ہو تو روکھی سوکھی گذر ہوتی ہے۔ مہنگائی بھی ہے اور کنبہ بھی ہے۔ جب اس سے دگنا ریوڑ میرے حوالہ ہو تو میں بڑا آسودہ رہتا ہوں۔ دودھ مکھن بھی نکل آتا ہے' چھاچھ لسی کی بھی کمی نہیں ہوتی۔ اس شش ماہی بچوں کے کپڑے اور بیوی کا زیور بنا لیتا ہوں۔ اگر ریوڑ بہت بڑا ہو تو دیکھ بھال میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ لاکھ کوشش کروں پھر بھی دوسرے تیسرے مہینے ایک نہ ایک بکری جنگل میں گم ہو جاتی ہے۔ گمشدہ جانوروں کا ہرجانہ بھرنے کے بعد آمدنی صفر رہ جاتی ہے۔ مسافر نے کہا' سیدھی سی بات ہے تم ساٹھ سے زیادہ بکریاں نہ لو۔ چرواہا بولا' بات اتنی سیدھی نہیں میرے موکلوں کی تعداد مقرر ہے' ان کی بکریوں کی تعداد مقرر نہیں۔ اب یہ مالک کی مرضی اور صورت حالات پر منحصر ہے کہ ایک موکل کبھی دو بکریاں دے دیتا ہے اور کبھی دس۔ اگر انکار کروں تو لگا بندھا موکل ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ سو ہر چھ ماہ بعد قسمت کی بازی لگتی ہے۔ مسافر نے پوچھا اب کی بار ریوڑ کی کیا صورت ہے۔ کہنے لگا' یہ آدھا آپ کے سامنے ہے اور آدھا ادھر نیچے کھائی میں ہے۔ تعداد معقول ہے' دودھ وافر ہے۔ ایک نگ بھی کم نہیں ہوا' چھ مہینے ختم ہونے والے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میرا خدا مجھ سے خوش ہے۔ مسافر رخصت ہوا تو چرواہے نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور کہا چم سرد۔ ترجمان کی ضرورت پڑ گئی۔ معلوم ہوا کہ چم سرد برابر چشم سرد۔ اور مطلب یہ ہے کہ خوش رہو تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی ہے۔ مسافر کی

آنکھوں میں نم تھا۔ اس نے دل میں سوچا معلوم ہوتا ہے میرا خدا مجھ سے خوش ہے۔

(۶)

ہوائی جہاز اس وقت نلتر کی وادی پر پرواز کر رہا ہے۔ دریچہ سے
اس کی ذرا سی جھلک گاہ بگاہ یوں نظر آتی ہے جیسے خوش رنگ منظر کی پھٹی ہوئی
تصویر کا ایک بڑا سا ٹکڑا ہوا اڑا کرلے جا رہی ہو۔ مسافر کی نگاہیں ایک جھیل کو ڈھونڈ رہی
ہیں اور وہ ننھی سی گول جھیل پھٹپھٹاتے انجنوں والے ہوائی جہاز کے شہپر کے نیچے یوں چھپی
ہوئی ہے جیسے کڑک مرغی کے پروں کے نیچے اکیسویں دن کا انڈہ۔ مسافر آج سے پندرہ
برس پہلے بھی تو یہاں آیا تھا۔ اس وقت اس نے جی بھر کر اس جھیل کا نظارہ کیا تھا۔
اب وہاں کیا رکھا ہے، محض ایک تلخ تجربہ۔ سو وہ اس سے پارسال دوچار ہو چکا ہے۔
نلتر کے پہلے سفر کی دشواریاں اب خواب و خیال ہو گئی ہیں۔ انہیں یاد
کریں تو وہ فرضی لگتی ہیں جیسے مسافر کی آپ بیتی نہ ہو بلکہ سندباد جہازی کا قصہ ہو۔
ان دنوں پوری وادی میں صرف ایک پختہ کمرہ تھا جس کے سامنے لکڑی کی جافری لگی
ہوئی تھی۔ کمرہ میں دو پلنگ اور دو کرسیاں تھیں۔ وادی میں تین سیاح نکل آئیں
تو تیسرے کو زمین پر سونا پڑتا۔ بیٹھنے میں البتہ کوئی دقت پیش نہ آتی کیونکہ ساری
وادی میں سبز مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ خشک پہاڑوں میں گھری ہوئی نلتر کی یہ سرسبز
وادی کسی جنت نشاں خطہ کا ایک ٹکڑا ہے جو سلسلۂ قراقرم میں راستہ بھول کر یہیں
رہ پڑا ہے۔ اس چھوٹی سی وادی میں ڈھلوان پر ایک طرف جنگل ہے اور دوسری
طرف برف۔ درمیان میں پہاڑی ندی ہے اور کچھ کھیت۔ ندی کے کنارے جگہ ہموار نظر
آئی تو مسافر نے جیپ کا رُخ ادھر موڑ دیا۔ دو چار میل کے بعد جب بے نشاں راستہ

ناقابلِ استعمال نظر آیا تو جیپ کو لوٹانے لگے۔ وہاں ایک لکڑہارا کھڑا تھا۔ اس نے کہا یہاں تک آئے ہو تو وادی کے آخری سرے تک کیوں نہیں جاتے۔ دیکھنے کی اصل چیز تو وہاں ہے۔ ہمت کر و بس ایک میل اس ڈھلوان پر پتھروں میں راستہ بنانا پڑے گا اور دو نالوں میں دھکا دے کر جیپ کو گذارنا ہوگا' اس کے بعد جنگل کھلا اور ہموار ملے گا پھر جہاں پہاڑ راستہ روک لیں وہاں ان کے دامن میں ایک چھوٹی سی خوبصورت جھیل ملے گی جسے دیکھ کر ساری تکان دور ہو جاتی ہے گی۔ مسافر نے سوچا یہ جھیل ہے کہ آدم خور دیو کی قید میں شہزادی جسے اس نے ایسی جگہ چھپا رکھا ہے جہاں کوئی چھڑانے والا نہ پہنچ سکے۔ لکڑہارے نے ہمت بندھائی اور مسافر ناتراش راہوں پر چل کھڑا ہوا۔ لیکن ہر رکاوٹ پر آگے بڑھتے چلے جانے کے فیصلہ کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں از سرِ نو سوچنا پڑتا۔ شوق کہتا پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ یہ ندی میں جو اتنے بہت سے پتھر ہیں یہ سب مسافر ہوا کرتے تھے۔ پایاب پہاڑی نالے کی تہ میں چھوٹے بڑے لاتعداد پتھر آبِ رواں کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ جہاں بہت سے پتھر جتھا بندی کر لیتے وہاں پانی کی جماعت بھی کھڑی ہو جاتی۔ پھر پانی ان پتھروں کے سر پر سے ہوتا ہوا جھرنے کی صورت سر کے بل آگے بڑھ جاتا۔ مسافر گھنٹہ بھر کی جدو جہد کے بعد جنگل میں آن نکلا۔ جنگل کھلا کھلا تھا۔ درخت نہ اتنے گھنے کہ منظر ان میں گم ہو جائے اور نہ اتنے چھدرے کہ ان کو ذخیرہ کہنے میں تامل ہو بس صرف اتنے درخت اور ایسے درخت جن سے منظر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ دو چار پرندے بھی نظر آئے۔ خوش رنگ چمکدار پروں پر نکھری دھوپ پیر رکھتے ہی پھسل جاتی۔ جی چاہا انہیں دیر تک دیکھتے رہیں۔ مگر ہوشمندی کا تقاضا ہے کہ منظر کو صرف ایک بار نظر بھر کر دیکھ لو' اتنی دیر نہ لگاؤ کہ وقت

ہاتھ سے نکل جاتے۔ پرندوں کا کیا اعتبار کب اڑ جائیں۔ دھوپ کا کیا بھروسہ کب ڈھل جاتے۔ معتبر ہے تو صرف وقت جس کی رفتار میں کبھی فرق نہیں آتا۔ مسافر نے سفر جاری رکھا، اسے جھیل کو ہاتھ لگا کر شام سے پہلے اپنے ٹھکانہ پر واپس پہنچنا تھا۔

وادی کا دوسرا سرا آ گیا۔ جنگل ختم ہو گیا۔ پہاڑ قریب آ گئے۔ سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا۔ مسافر جیپ سے اتر کر اس ٹیلہ پر چڑھ گیا۔ تین طرف پہاڑوں کا سہ حدہ تھا اور چوتھی طرف یہ سرسبز ٹیلہ۔ ان کے درمیان آغوشِ کہستان میں ایک ننھی منی سی جھیل تھی۔ اسے جھیل کہنا مبالغہ ہو گا۔ یہ جھیل ہے کہ کنول پر رکھا ہوا شبنم کا قطرہ، مسافر نے سوچا۔

آسمانی رنگ کی اس جھیل کے کنارے جو تنہا درخت منظر میں ڈوبا ہوا تھا اس کا عکس پانی کی سطح پر ہلکا نیلا اور تہ میں سرمئی تھا۔ اس کے پتے جھیل میں گرتے رہتے ہیں اور جنتری کا کام دیتے ہیں وہ جو تہ میں سیاہ گیلی مٹی کے ساتھ یکجان ہو گیا ہے وہ اس موسم کے آغاز میں درخت سے جدا ہونے والا پہلا پتہ تھا اور یہ زرد ڈنٹھل والا کچھ بھورا اور کچھ سبز پتہ جو سطح پر تیر رہا ہے اس وقت گرا جب مسافر نے پیپرس کے اس درخت کی کاغذی چھال اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے اس چھال کے مخطوطات عجائب گھروں میں بارہا دیکھے تھے مگر درخت سے ملاقات پہلی بار ہو رہی تھی۔ درخت کا سفید اور سبک تنا تیار کاغذ کا گٹھا تھا۔ چھال کا پتلا پرت ہاتھ میں لے کر کولھو کے بیل کی طرح اس کے گرد چکر لگائیں تو گھنٹہ دو گھنٹہ میں یہ درخت فضا میں تحلیل ہو جائے گا اور اس کی جگہ ہاتھ میں صرف ایک کاغذ رہ جائیگا، طویل اور کورا۔ مسافر نے چاقو سے چھال پر لکیر لگائی اور پرت کو لے کر درخت کا ایک چکر آہستہ اور احتیاط سے لگایا

جیسے ڈاکٹر کسی زخمی کی پٹی اتار رہا ہو۔ کاغذی چھال پھر بھی ایک جگہ سے پھٹ گئی۔ وہاں درخت میں گانٹھ تھی جیسے زخم ابھی بھرا نہ ہو۔ نیچے سے درخت کی تازہ نم چھال نکلی، اس گلابی استر کی طرح نازک جو انسانی جسم میں کھال کے نیچے ہوتا ہے۔ چھال بھی تو آخر کھال ہوتی ہے۔ یہ خیال آتے ہی مسافر نے ہاتھ کھینچ لیا۔ چھال کا جو ٹکڑا ہاتھ میں تھا اسے ہوا میں خشک ہوتے دیر نہ لگی۔ مسافر نے پہلے اس پر بسم اللہ لکھی پھر سرخوشی میں نہ جانے اور کیا کچھ لکھا۔ مجنوں جب دبستان میں لام الف لکھتا تھا تو اسے بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ کیا لکھ رہا ہے۔ اس جھیل کے کنارے مسافر کی سرخوشی کسی عاشق سے کم نہ تھی۔ اور نہ منظر حسن و خوبی میں کسی لیلا سے کم ہوگا۔

مسافر نے گھر پہنچ کر چھال کا وہ ٹکڑا اپنے پھیلے ہوئے ساز و سامان میں کہیں سنبھال دیا۔ تجربہ کہتا ہے داشتہ آید بکار۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ داشتہ کے ساتھ صرف نابکار کا تصور ہی ٹھیک بیٹھتا ہے۔ مسافر ہنس دیتا ہے، آخر اپنے اپنے تجربہ کی بات ہے۔ مسافر کے پاس اَن گنت چھوٹی بڑی، بھولی بسری، غیر مستعمل یا نامکمل چیزیں گھر میں یوں بھری پڑی ہیں جیسے کسی بزدل کے دل میں طرح طرح کے خوف۔ پہلے دور نہیں ہوتے اور نت نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ مگر وہ گھر کو ان سے خالی کرانے پر آمادہ نہیں۔ دامن جھاڑنے کے لئے جتنی ہمت چاہیئے وہ مسافر اپنے اندر نہیں پاتا۔ یہ سب کہنہ اور ماندہ چیزیں اس کے لئے لمحات اور تجربات کی نشانیاں ہیں۔ وہ اپنی دریافت انہی نشانیوں سے کرتا ہے۔ وہ تو شاید لکھتا بھی اس خاطر ہے کہ اسے اپنا سراغ مل جائے۔

بہت دنوں کے بعد اس نے ایک الماری کھولی۔ چھال کے ٹکڑے کے لئے ادھر ادھر جھانکا مگر وہ نہ ملا۔ البتہ وہاں ایک بند لفافہ پڑا تھا۔ اسے کھولا تو اس میں سے پیپل کا

زرد پتہ نکلا۔ مسافر یہ پتہ انورادھا پورہ سے لایا تھا۔ یہ پتہ ایک ایسے درخت کی شاخ سے گرا تھا جس کی تاریخی عمر دو ہزار برس بتائی جاتی ہے۔ اور یہ درخت جس شاخ سے پھوٹا تھا وہ گیا کے اس درخت کی تھی جس کے نیچے کپل وستو کے شہزادے کو نروان ملا تھا۔ جنم بھومی میں بدھ مت اور گیا کے پوتر درخت دونوں کی بیخ کنی ہو گئی مگر اس مذہب اور اس درخت کی جو قلمیں دوسرے ملکوں میں لگائی گئیں وہ اب تک ہری بھری ہیں۔ سری لنکا کے وسط میں انورادھا پورہ کے کھنڈرات میں ایک جانب دیواریں، سیڑھیاں، حجرے اور عبادت گاہیں بنی ہوئی ہیں جن کے بیچوں بیچ ایک چبوترے پر جنگلے کے اندر یہ درخت لگا ہوا ہے۔ اس کا ایک خشک پتہ مسافر کو تحفہ میں ملا جسے اس نے اس لئے قبول کیا کہ دینے والے کی دل شکنی نہ ہو اور اسے سنبھال کر رکھا کہ وہ گوتم بدھ کا ایک قول یاد دلاتا رہے۔

گوتم بدھ نے کہا تھا، تم ایک زرد پتہ کی مانند ہو۔ موت کے کارندے تمہاری گھات میں لگے ہوتے ہیں۔ تم ایک سفر کا آغاز کر رہے ہو۔ کوئی اور تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ تم جلد ایک شمع بن جاؤ جو تمہاری خامیوں کو جلائے اور خوبیوں کو روشن کرے تاکہ تمہیں وہ جوان زندگی میسر آئے جو بڑھاپے اور موت کی زد سے باہر ہے۔

ملتر کی پرسکون وادی کے جنوب مشرقی گوشہ میں نیلی شفاف جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے مسافر نے جب پہلی بار اپنا عکس پانی کی نرم خیز سطح پر دیکھا تھا تو اس وقت بھی اسے گوتم بدھ کی یاد آئی تھی۔ گوتم نے کہا تھا۔ انسان چار طرح کے ہوتے ہیں۔ زندگی کے دھارے کے ساتھ بہنے والے دھارے کے خلاف تیرنے والے، دھارے میں اپنا مقام بنا کر جم جانے والے اور وہ جو جیتے جی موت اور زندگی کے دونوں دھاروں کو عبور کر کے اتھاہ آسودگی کے خشک کنارے پر پہنچ جاتے ہیں۔

مسافر کو اس سلسلہ میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ وہ دھارے کے ساتھ بہنے والی پہلی اور ادنیٰ قسم کا فرد ہے۔ لیکن اس نے بساط بھر کوشش کی کہ وہ اس دھارے کے ساتھ خوشی خوشی بہہ جانے والوں میں شامل نہ ہو۔ جھیل میں ہلکورے لیتے ہوئے عکس کو دیکھ کر اسے تسلی ہوئی۔ یہ عکس سطح آب کے اوپر ہے اور ناخوشی کا احساس مسافر کی انا کو ڈوبنے نہیں دیتا۔

نلتر کی وادی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے کے بعد مسافر کو احساس ہوا کہ اس کنج کہسار میں وہ ڈھیر سارے اوصاف جمع ہیں جو دنیا کی محفلوں سے اکتا جانے والے شاعر کو مطلوب تھے۔ سکون اور سبزہ، نیلا آسمان اور نیلگوں جھیل، برف سے ڈھکی چوٹیاں اور دیودار سے ڈھکی ڈھلوانیں۔ پانی اتنا شفاف کہ ساری کدورت دھل جاتے اور ہوا اتنی پاک کہ ہوا و ہوس دم نہ مار سکے۔ نہ یہاں دنیا کی محفلوں کا شور ہے اور نہ دنیا داروں کی سیاست کا زور۔ یہاں صرف سیاح کا قدم پہنچتا ہے یا شاعر کا خیال۔ مسافر کو یہ جگہ بھا گئی۔ اس نے پائنچہ چڑھا کر ننگے پاؤں جھیل میں ڈال دیئے اور سبزہ کی ڈھلوان سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو والی دل میں ڈوبی ہوئی خواہش سطح آب پر ابھر آئی۔ اس نے گردوپیش پر فیصلہ کن نظر ڈالی۔ یہ قطعہ موزوں ہے بس ایک کمرہ ڈال کر یہاں رہ پڑیں تو عیش ہو جائے۔ گذر بسر چونکہ ایک ہی کمرے میں ہو گی اس لئے ذرا کشادہ ہونا چاہیئے۔ جھیل کی طرف کھلتا ہو اور سامنے کی پوری دیوار اور دروازہ شیشہ کا ہو تا کہ جھیل ہر وقت نظروں کے سامنے رہے۔ پشت پر پہاڑ کی جانب بڑی سی مستطیل کھڑکی ہو جس سے پہاڑ، برف اور جنگل کا منظر ایسے نظر آئے گویا فریم میں جڑا ہوا ہے۔ باقی دو دیواروں میں بھی داخلہ کے لئے دریچے ہونے

چاہیئں، ایک جنگلی پھولوں کی مہک کے لئے دوسرا نغمۂ سمرغ کے لئے۔ الغرض کمرہ ایسا ہونا چاہیئے کہ منظر شیشے سے اور ماجرا دریچہ سے اندر داخل ہو جائے۔ یوں کمرے کی بیشتر جگہ یہ دونوں گھیر لیں گے۔ جو بچ رہے گی اس میں قالین بچھے گا۔ میز کرسی لگے گی۔ کتابوں کا شیلف ہوگا اور ستانے کے لئے ایک ہزار پہلو آرام کرسی۔ باقی ساز و سامان کدھر جائے گا۔ ساز تو مانا شہر میں چھوڑ دیں گے مگر سامان کے بغیر گزران کیسے ہوگی۔ ایک کمرہ ضروریات زندگی کے لیے اور ڈال لیں گے۔ یہ سونے والا کمرہ ہوگا۔ اس میں تزئین کے لئے غالیچہ اور مصور خطاطی کے نمونے ہونگے۔ استعمال کے لئے پلنگ، بستر، لیمپ، تپائی اور ایک جہاں گیر ریڈیو ہوگا۔ کپڑوں کے لئے ڈریسنگ روم علیحدہ ہونا چاہیئے۔ غسلخانہ، باورچی خانہ اور سٹور روم اس کے علاوہ ہونگے۔ کھانا پکانے کے لئے ملازم اور اس کی رہائش کے لئے کمرہ بھی ضروری ہے۔ بجلی کی کوئی فکر نہیں چراغ روشن ہونگے۔ گیس کی کوئی حاجت نہیں لکڑی جلائیں گے۔ دھوبی اور حجام نہ ہوئے تو کیا غم ملگجی گدڑی پہنیں گے اور بال خوب بڑھائینگے۔ ممکن ہے لوگ اس گنہ گار کی صورت دیکھ کر اسے پیر فقیر بنا لیں۔ ایسا ہوا تو اس گوشہ کا سکون اور مسافر کا ایمان دونوں غارت ہو جائیں گے۔ خواہش کو یوں تاراج ہوتے دیکھا تو مسافر نے اپنے پاؤں جھیل سے باہر نکال لیے۔ وہ ان کو خشک کرتا جاتا اور سوچتا تھا کہ ایک خاموش اور خوبصورت جگہ پر جھونپڑہ ڈال لینے کی خواہش کا نقشہ ذراسی دیر میں اسلام آباد کے سرکاری بنگلہ کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ خواہش بھی آندی کی طرح ہر دم نئی بستیاں بساتی ہے۔

بچپن میں مسافر نے ایک تھیٹر دیکھا تھا جس میں ایک شخص کسی کی جھلک دیکھ لینے کے بعد خود کلامی کے جوش میں بار بار پکارتا تھا، ایک بار دیکھا ہے اور ایک بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ وہ شخص عجیب تھا۔ جھلک اسے خواہ کتنی بار نظر آئے وہ ایک

بار پھر دیکھنے کی خواہش کا اظہار بڑی شدت سے کرتا تھا۔ ہر جھلک اس شدت میں اضافہ
کر دیتی۔ نلتر جھیل اور مسافر کا باہمی تعلق بھی چند سال تک اسی طرح کا رہا۔ پھر اسے
دیر تک وہاں جانے کا موقع نہ ملا۔ اس سے تعریفیں سن کر چند ہمراہی مصر تھے کہ ایک بار ہم بھی
ہمراہ چلیں گے۔ پچھلے برس یہ آرزو پوری ہوئی اور اس کے بعد مسافر سے کسی نے ایک بار
پھر دیکھنے کی ہوس کا ذکر نہیں سنا۔ نومل پہنچے تو معلوم ہوا کہ پرانی سڑک متروک ہو چکی ہے
اور نئی سڑک نالے کے دوسری طرف ہے۔ پرانی سڑک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر یکا یک
وادی میں داخل ہوتی۔ وادی کا پہلا اور بھرپور نظارہ سفر کی ساری تکان دُور کر دیتا۔ نئی سڑک
چور دروازے سے وادی میں داخل ہوتی ہے اور نظارہ کو روندتی ہوئی دور تک چلی جاتی ہے۔
جھیل کی طرف روانہ ہوئے تو منظر بدلا ہوا تھا۔ بدمذاقی نے منظر کی حد بندی کر کے اسے
چھوٹے چھوٹے مالکانہ قطعات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جس وادی میں رہنے والے گنے چنے اور
کھیت تھوڑے بہت تھے وہاں قدم قدم پر مکانوں کی دیواریں اور کھیتوں کی منڈیریں بلند
ہو چکی تھیں جس جنگل میں بھیڑ بکریاں بھی گنتی کی تھیں وہاں ناک بہتے اور گدھ جیسے بچوں
کے پرے کے پرے لگے ہوتے تھے۔ پہلے جھیل سے پانچ میل کے فاصلے تک کوئی جھونپڑی
نہ تھی۔ اب وہاں جھیل کے ساتھ جو ٹیلہ ہے اس کے نیچے جانوروں کا بہت بڑا باڑہ بنا ہوا
ہے اور ان کے مالکوں کے کچے گھر بنے ہوئے ہیں۔ مسافر نے ہمراہیوں سے کہا، راستہ کے
حسن کا تو خون ہو چکا ہے لیکن جھیل کا منظر اس کی تلافی کر دے گا۔ مسافر کی قیادت میں
سارے ہمراہی دم سادھ کر اور جگر تھام کر ٹیلہ پر چڑھ گئے۔ سامنے ایک جوہڑ تھا۔ کنارے
کیچڑ اور غلاظت سے لت پت۔ جنگل کے گرے ہوئے درخت جگہ جگہ سے جھیل کا کنارہ
روکے کھڑے تھے۔ پانی میں ڈوبی ہوئی لکڑی گل کر سیاہ بدبودار برادہ بن چکی تھی۔

پیپرس کا درخت غائب تھا۔ جہاں کبھی مسافر پانی میں پاؤں ڈالے خواہشوں کے نقشے کھینچتا تھا وہاں کچھ کھنڈر کنارے پر تھے اور کچھ تعمیراتی ملبہ جوہڑ میں پڑا تھا۔ جوہڑ کے اندر کسی نے مصنوعی جزیرہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس جزیرے تک لکڑی کے پل سے ہو کر جاتے تھے۔ جزیرہ پر بدبو اور غلاظت کا قبضہ تھا۔ سنا ہے کہ اس گوشہ کہسار کو سیاحوں کی خاطر پرکشش بنانے کے لئے اس جھیل کے کنارے پیپرس کے درخت سے ملحق ایک ریسٹ ہاؤس بنایا گیا اور بھرائی کر کے ایک جزیرہ ڈالا گیا۔ سردیوں کی ایک رات سامنے پہاڑ کی چوٹی سے برف کا ایک تودہ چلا اور دیودار کے درختوں کو ہمراہ لیتا ریسٹ ہاؤس کی عمارت کو توڑتا ہوا اس جھیل کو جوہڑ بنا گیا۔ رہی سہی کسر ان مویشیوں نے پوری کر دی جن کا باڑہ ٹیلہ کے دوسری طرف بنا ہوا تھا۔ مسافر کو دو صدمے پہنچے۔ ایک تو یہ کہ اس نے کنج عافیت کے لئے جس جگہ کی خواہش کو دل میں جگہ دی تھی وہاں اِدھر ایک ریسٹ ہاؤس بنا اور اُدھر کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ ہماری کتنی ہی خواہشات میں ہماری ہلاکت کا سامان ہوتا ہے اس لئے قدرت انہیں پورا نہیں کرتی اور ہم سمجھتے ہیں کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ دوسرا صدمہ یہ تھا کہ جس منظر کی کشش کا بیان ہمراہیوں کو سفر کے لئے آمادہ کرنے کا باعث بنا وہ منظر وہاں سے کوچ کر چکا تھا۔ یہ دوسرا صدمہ مسافر کو دوسری بار اٹھانا پڑا۔ اس سے پہلے وہ خلیج سیام کے ایک جزیرہ میں اس سے دوچار ہو چکا تھا۔

خلیج سیام کے کنارے پاتیہ ایک خوبصورت ساحلی مقام ہے۔ موسم معتدل، ساحل کٹا پھٹا، سمندر دور تک اندر آجاتا ہے اور کہیں نیلا ہے کہیں سبز کہیں خاکستری اور کہیں سیاہی مائل۔ سیاحوں کا بھی یہی حال ہے کوئی سفید کوئی پیلا، دوچار بھورے ایک آدھ کالا۔ زیادہ تر سیاح جرمنی سے آتے ہیں۔ مسافر کو وہ خوبصورت جرمن

نوجوان یاد ہے جو روانگی کے وقت لاؤنج میں بے تحاشہ رو رہا تھا اور اونچی آواز سے کہہ رہا تھا۔ مغرب کی عورت کو مرے ہوئے ایک صدی ہو چکی ہے۔ مشرق کی عورت ابھی زندہ ہے۔ مجھے تھائی لینڈ کی شہریت اور دلہن درکار ہے۔ میں واپس نہیں جاؤنگا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر ہوائی اڈے چلے گئے اور اس نے اپنا سامان واپس ہوٹل کے کمرے میں بھیجدیا۔ پاتیہ کے ہوٹل بڑے خوشنما ہیں۔ ان کی تعمیر میں گردوپیش کے منظر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ کوئی گاؤں کی طرح بسا ہوا ہے اور کوئی چٹانوں کا حصہ نظر آتا ہے۔ ایک بادبانی کشتی کی طرح بنا ہوا ہے اور ایک موٹر بوٹ کی شکل کا ہے۔ مسافر نے پیراکی کا لباس پہنا اور ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کے پیچھے رسی تھام کر چوبی تختہ پر کھڑا ہو گیا جو سمندر کی سطح کو چیرتا ہوا اپنے پیچھے پانی کی ایک لکیر بناتا جا رہا تھا۔ سمندر کی لہریں ذرا دیر کے لئے اس لکیر کا تماشہ دیکھتیں پھر اسے مٹا دیتیں۔ موٹر بوٹ چلانے والے نے چاہا کہ پانی کی سطح پر چوبی تختہ کے نالی دار نقش پا سے ایک دائرہ بنایا جائے۔ اس نے موٹر بوٹ کو سیدھا چلانے کے بجائے گول گھمانا شروع کیا اور رفتار کو تیز تر کر دیا۔ چھینٹیں اڑ اڑ کر مسافر کی آنکھوں میں پڑنے لگیں۔ توازن برقرار رکھنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ لکیر گہری ہوتی چلی گئی، سمندر ناراض نظر آنے لگا۔ بالآخر دائرہ مکمل ہوا اور موٹر بوٹ کنارے کی طرف روانہ ہوئی۔ مسافر کے ہاتھ کھچاؤ کی وجہ سے شل تھے، ٹانگیں تناؤ کی وجہ سے چور تھیں لیکن جسم میں آسودگی کا ایک پورا سمندر موجزن تھا۔ پاتیہ میں ایک اور بہلاوے کا انتظام بھی ہے مگر وہ تجربہ تلخ نکلا۔ کنارے سے لگی ہوئی موٹر بوٹ سے ایک لمبی رسی لے کر اسے دور ساحل پر کھڑے ہوئے مسافر کی کمر کے گرد باندھ دیا۔ پھر ایک پیراشوٹ کی رسیاں اس کے کاندھے سے باندھ دیں اور پیراشوٹ کو ریت پر پھیلا دیا۔ اس کھیل میں جب موٹر بوٹ

تیزی سے سمندر میں چلتی ہے تو بندھا ہوا آدمی دو چار قدم بھاگنے کے بعد پیرا شوٹ میں
ہوا بھرتے ہی بلند ہو جاتا ہے اور جتنی لمبی رسی ہو سمندر سے اس بلندی پہ اڑتا رہتا
ہے اور نیچے موٹر بوٹ چلتی رہتی ہے۔ موٹر بوٹ نے دو بار کوشش کی۔ دونوں بار مسافر
ساحل کی ریت پر گھسٹتا ہوا چلا گیا۔ ہوا نرم خیز تھی اس لئے چھتری بلند نہ ہو سکی۔ آب بازی
کے لئے جتنے ڈالر خرچ کئے تھے خاکبازی میں کہنیوں اور گھٹنوں پر اتنی خراشیں آگئیں۔
پاتیہ کے ساحل سے دور سمندر میں ایک دھندلا سا خاکہ نظر آتا ہے۔ یہ
جزیرۂ مرجان ہے۔ مسافر نے اس جزیرہ کی سیر کے لئے سالم بادبانی کشتی کرایہ پر لی۔ بش
شرٹ کو بدن سے علیحدہ کیا، پاؤں کو موزے جوتے کی قید سے آزاد کیا، پائنچے چڑھی پتلون
اور بنیان پہنے عرشہ پر رکھی ہوئی جھولا کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیز ہوا اور دھوپ سے آنکھیں
چندھیانے لگیں تو سبز چشمہ لگا لیا۔ منظر رنگین ہو گیا مگر اس میں ایک بے رونق یکرنگی تھی۔
کشتی کا ملاح اور اس کا دس سالہ لڑکا ہوا اور موجوں سے لڑ رہے تھے۔ لڑکا کبھی ایک
بلّی پر بندر کی طرح چڑھ جاتا اور کبھی دوسری سے پھسل کر نیچے
آجاتا۔ کبھی ایک بادبان کھولتا کبھی دوسرا لپیٹ دیتا۔ ملاح نیچے سے ہدایات جاری کرتا
اور رسیاں کستا یا ڈھیلی چھوڑ دیتا۔ کشتی رخ پر لگ گئی۔ ان دونوں کا کام ختم ہوا، باقی
کام ہوا کے ذمہ تھا۔ جزیرہ نزدیک آتا جا رہا تھا۔ ملاح بیکار بیٹھا تھا، لڑکا کشتی کے
ابھرے ہوئے نوکیلے سرے پر ذراسی جگہ میں سکڑ کر سو گیا۔ بادبانی کشتی نے جزیرے کے
پاس پہنچ کر لنگر ڈال دیا۔ چھوٹی چھوٹی چپو سے چلنے والی کشتیوں نے اس بڑی کشتی کو گھیر لیا۔
ایک کشتی والے سے سودا طے ہوا کہ وہ گھنٹہ بھر مرجانی سلسلہ کی سیر کرائے گا۔ اس چھوٹی سی
کشتی میں منتقل ہوئے تو گویا آب و رنگ کی ایک نئی دنیا میں جا پہنچے۔ اس کشتی کا پیندا

شیشے کا ہے اور وہ زیر آب ساحل سنگستان کے اوپر تیر رہی ہے۔ مسافر اس کشتی میں لیٹ کر شیشے سے آنکھیں لگائے سمندر کی تہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہاں سمندر تین چار ہاتھ گہرا ہے اور اور اس کی تہ سے مونگے کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں ابھرتی اور کشتی کے شیشے والے تلے کے پاس پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ لمحہ بھر کو یہ مسافر بھول گیا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے۔ اسے یوں لگا کہ وہ پانچ چھ سال کا بچہ ہے جسے کسی نے گتے کی نلکی اور رنگین کرچوں سے بنی ہوئی عکس بین پہلی بار دیکھنے کے لئے دی ہے۔ بچہ اسے سورج کے رخ پر رکھ کر اس کے ساتھ ایک آنکھ لگا کر اسے گھماتا جاتا ہے عکس بین کے دوسرے سرے پر رنگوں کی قوس قزح ٹوٹتی اور جڑتی رہتی ہے۔ ہر بار ایک نیا نمونہ بنتا ہے، رنگ برنگ اور رنگا رنگ۔ کوئی آنکھوں کو اچھا لگتا ہے، کوئی دل کو بھا جاتا ہے اور کوئی حیرت میں اضافہ کر دیتا ہے۔ بچے نے اس آلہ کو اتنی دیر تک گھمایا کہ اس کا بچپن ختم ہو گیا مگر رنگین نظاروں کی وہ گوناگونی تھی کہ ایک بار بھی تکرار کی نوبت نہ آئی۔ اب وہ بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ کانچ کی کشتی کی تہ سے ٹکٹکی باندھے تہ آب ان رنگین عبارتوں کو دیکھ رہا ہے جن میں کوئی حرفِ مکرر نہیں۔

کشتی کو دم سے لے کر چلتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ مگر نہ دل سیر ہوا نہ تماشہ ختم ہوا۔ یہ حجری طبقہ سمندر کے نیچے میلوں تک پھیلا ہوا ہے۔ رنگ کاری اور طرز تعمیر کا یہ شاہکار سلسلہ چٹان ایک حقیر لجلجے کیڑے یا کیڑے کی نسلاً بعد نسلٍ جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ ایک ننھا سا کیڑا بے پایاں سمندر میں کہیں پاؤں جما کر اپنے لعاب سے اپنے گرد ایک حصار کھینچتا ہے۔ یہ زندگی میں اس کا قلعہ ہوتا ہے اور موت کے بعد اس کا مقبرہ بن جاتا ہے۔ اسی حصار پر دوسری نسل اپنے پیر مضبوطی سے گاڑ دیتی ہے اور اس

بنیاد پر ایک نیا حصار بنا لیتی ہے۔ ہزاروں سال اس عمل کو دہرانے کے بعد سمندر کی ته میں ایک دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور ایک باغ کھل جاتا ہے۔ دیوار اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ ته میں اٹھنے والے طوفانوں کا رخ موڑ دیتی ہے۔ باغ اتنا خوبصورت ہوتا ہے کہ خشکی پر واقع کوئی باغ اس آبی گلزار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ کیڑے انسان سے زیادہ سمجھ رکھتے ہیں۔ انہیں حسن اور قوت کا راز معلوم ہے۔ ان کی نسلیں قرن ہا قرن تک اپنے ورثہ سے پیوست رہتی ہیں۔ مسافر نے اس ورثہ کو تختۂ گل سے زیادہ متنوع اور حسین پایا۔ یہاں تک کہ وہ ننھی منی مچھلیاں جو زرق برق پوشاک پہنے اس مونگی بھول بھلیل اوران مرجانی گھروندوں میں ادھر سے ادھر گلگشت کر رہی ہیں وہ بھی تیلیوں سے زیادہ رنگین اور نازک ہیں۔ کشتی ساحل کی طرف مڑی جو بالکل نزدیک ہے۔ مسافر کو معلوم ہے کہ ذرا سی دیر میں یہ منظر خواب وخیال ہو جائے گا۔ وہ شیشے سے چپک گیا کہ شاید اس طرح وہ نظارہ کی ته تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس نے آنکھیں جھپکنی بند کر دیں کہ چشم زدن میں وہ اس نظارہ سے محروم نہ ہو جائے۔ سمندر کی تاریک ته سے ایک سایہ ابھرتا اور سطح آب سے جب ایک ہاتھ رہ جاتا تو پھلجھڑی بن جاتا، روشن اور رنگین۔ ہر لحظہ باغ میں نئی پھلجھڑیاں چھوٹتی رہتیں۔ اس باغ میں مونگے کے بیچدار بوٹے اگے تھے جو سروں پر گلدان اٹھائے ہوئے تھے۔ سورج کی شعاعیں ان بوٹوں پر پڑتیں تو پتھر کے بدن جگنو کی طرح جلتے بجھتے۔ یہ مرجانی گلبن اور مونگی گلدان طرح طرح کے تھے۔ چھتے کی طرح ہزار خانہ، اسفنج کی طرح رخنہ رخنہ، فانوس کی طرح شمع شمع، گل صد برگ کی طرح پر پر۔

کشتی جزیرہ سے آن لگی تو مسافر ناریل کے جھنڈ میں واقع چھپر کی چھت اور بغیر

درو دیوار والے ریستوران میں کھانے کی فرمائش درج کرانے کے بعد ریت پر آکر لیٹ گیا۔ اس کے پاس جب گائیڈ اور دست فروش آتے تو وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ ایک چھوکرا ہشیار نکلا۔ اس کے سرہانے کھڑا ہو کر بولا، تم آنکھیں بند رکھو تاکہ کوئی اور نہ آجائے مگر کان کھول کر غور سے میری بات سنو۔ میرے پاس نایاب مرجان ہیں اور کمیاب گوہر۔ تمہیں سستا دوں گا کیونکہ میں کشتی والے سے پوچھ آیا ہوں کہ تم پاکستانی مسلمان ہو۔ ڈالر میں ادائیگی کرو گے تو پھر اور رعایت دوں گا۔ تم بولتے کیوں نہیں، کیا سوچ رہے ہو۔ مسافر سوچ رہا تھا کہ یہ زیر آب منظر کتنا حسین تھا جسے ایک بار دیکھا ہے اور ایک بار دیکھنے کی ہوس ہے۔

چند سال یونہی بیت گئے۔ پھر ایک دن خود بخود سبیل نکل آئی۔ مسافر نے عذرا کو ہمراہ لیا اور مشرق بعید کا چکر لگانے کے بعد دوبارہ خلیج سیام کے اس جزیرہ پر آ پہنچا جہاں خواب سمندر کے پانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بڑے اشتیاق سے دونوں نے اپنی نظریں شیشے کے پیندے میں گاڑ دیں۔ نیچے سمندر میں گہرے سایوں، سیاہ ہیولوں اور بدرنگ خاکوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ نہ تختۂ گل نہ شب برات، نہ جگنوؤں کا جھرمٹ نہ جل پریوں کے پرے۔ سر اٹھا کر کشتی والے سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا اور خاموش ہو گیا۔ پتہ چلا کہ جب مون سون کے بادلوں کی چھتری سورج کی شعاعوں کو روک لیتی ہے تو ان پانیوں میں رنگین اور خوشنما سلسلۂ مرجان کی جگہ بھدے سائے اور بدرنگ چٹانیں لے لیتی ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن مسافر نے جب کبھی کسی کیف آور اور دلفریب نظارہ کو دیکھا تو زیر لب کہا، ایک بار دیکھا ہے اور بار بار شکر ادا کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ شکر کا حق ادا ہوتا ہے نہ دوسری بار دیکھنے کی ہوس پیدا ہوتی ہے۔

ہوا تھم گئی۔سمندر پرسکون ہے۔ لہریں برائے نام ہیں، سمندر کی سطح ہموار نظر
آتی ہے۔کشتی بے حد آہستہ چل رہی ہے۔ بادبان پھولتا ہی نہیں۔ ملاح اس کو ہر رخ
پر گھما کر تھک گیا ہے۔مسافر اور ہم سفر مونگی جزیرہ سے پاتیہ کے ساحل کی طرف روانہ ہیں
دیر ہو گئی تو ہم سفر نے سست رفتاری سے اکتا کر کہا، جی چاہتا ہے ہماری کشتی ہوا ہو
جائے اور فراٹے بھرنے لگے۔مسافر نے کہا انشا اللہ ایسا ہی ہو گا۔

وہ دونوں جنوب مشرقی ایشیا سے چلے اور ڈیڑھ ہزار میل دور مشرق
بعید کے ایک جزیرہ کے وسط میں سیل سپردگی کا کھیل کھیلنے کے لئے پہنچ گئے۔ اس
قدرے خطرناک کھیل میں کشتی کسی تندرو پہاڑی دھارے میں ڈال دیتے ہیں جو اسے تیزی
سے بہا کر نشیب میں لے جاتا ہے۔سڑک کے ایک طرف کیلے کا گھنا باغیچہ ہے اور دوسری
طرف ایک بانس واڑی۔پگڈنڈی بانسوں سے کتراتی اور پانی کے گڑھوں سے بچتی
گھاٹ پر ایک چھپر کے نیچے جا کر ختم ہو گئی۔علیک سلیک اور تھوڑی سی تکرار کے بعد ایک
ڈونگی کرایہ پر مل گئی۔پہاڑی کنارے کے پہلو میں کھدی ہوئی بیشمار سیڑھیاں اتر کر وہ دریا
پر جا پہنچے۔ دریا یہاں بہت چوڑا ہے اور بالکل ساکت۔اس کی سطح کسی گہرے آدمی
کے بے قیافہ چہرہ کی طرح ہے۔قیافہ شناس یہ بتانے سے بھی قاصر ہیں کہ دریا کس سمت
میں بہہ رہا ہے۔ ڈونگی دیکھ کر مسافر کو حیرت ہوئی۔پتلے سے درخت کا کھوکھلا تنہ ہے جس کا
گودا نکال کر کشتی کا کام لیتے ہیں۔دیکھنے میں یہ اس تنکے کی طرح ہے جس کا سہارا ڈوبنے
والے لیا کرتے ہیں۔یہ پتلی سی کشتی بہت لمبی ہے اور دونوں سروں پر نوک خنجر کی طرح
خمدار ہے۔ اتنی طویل ہونے کے باوجود اس میں محض ایک مسافر کے سمٹ کر بیٹھنے
کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ دوسرا مسافر اسی صورت میں سوار ہو سکتا ہے کہ وہ یک جان د

دو قالب پر ایمان رکھتا ہو۔ مسافر اور شریک سفر کو اس ڈونگی میں سما جانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ ملاحوں نے لمبی رسی لے کر ایک کشتی کے سرے کو ذرا فاصلے پر کھڑی دوسری کشتی کے سرے سے باندھ دیا۔ اور اسی طرح دوسری کو تیسری اور تیسری کو چوتھی سے جہاں گنتی ختم ہوئی وہاں آخری سرے کو موٹر بوٹ سے باندھ دیا جو نکیل اور رسی سے بندھے ہوئے ان آبی اونٹوں کا ساربان ہے۔ موٹر بوٹ روانہ ہوئی اور ریکے بعد دیگرے ساری ڈونگیاں اس کے پیچھے ایک قطار بنا کر چل دیں۔ رفتار بہت کم ہے۔ سفر بہاؤ کے خلاف ہے۔ پندرہ ڈونگیاں ہیں جن کی قطار درمیانی رسیاں لمبی ہونے کی وجہ سے بہت طویل ہو گئی ہے۔ جہاں تک دریا سیدھا ہے یہ موٹر بوٹ اور کشتیاں ایسے لگ رہی ہیں جیسے بطخ اور اس کے پیچھے پیچھے قطار میں تیرتے ہوئے بچے۔ دریا میں ایک موڑ آیا ہے اسے کاٹتے ہوئے رسی سے بندھی کشتیوں نے ایک بڑا سا نیم دائرہ بنایا منظر یک بہ یک بدل گیا ہے۔ مسافر نے نئے چاند کا عکس پانی میں بارہا دیکھا تھا مگر یوں دن کے وقت ہلال کو روئے آب پر دھیرے دھیرے تیرتے ہوئے پہلی بار دیکھا ہے۔ وہ نظارے میں کھو گیا۔ دریا بل کھاتا اور سیدھا ہوتا رہا۔ ہلال نکلتا اور ڈوبتا رہا۔ گاہے کشتیوں کا کارواں سراب میں تیرتا رہا۔ گاہے اونٹوں کا قافلہ دریا کی سطح پر خراماں خراماں چلتا رہا۔ یہ طلسم اس وقت ٹوٹا جب موٹر بوٹ مقررہ جگہ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔

دریا یہاں دو شاخہ ہے۔ ایک شاخ بڑی تند و تیز ہے جو پہاڑ سے اتر کر دریا میں شامل ہو رہی ہے۔ باقی سفر اسی شاخ میں بلندی کی طرف ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ کیسے ہو گا۔ ڈونگیاں علیحدہ علیحدہ کر لی ہیں اور ہر ڈونگی پر تین تین مشقتی مقرر ہو گئے ہیں۔ دو آدمیوں نے کشتی کی طرف پشت کئے اس رسی کو جس سے ڈونگی کا اگلا سرا بندھا

ہوا تھا کاندھے کے اوپر سے گذار کر ہاتھوں میں تھاما اور کنارے پر چلتے ہوئے اسے بہاؤ کے
خلاف کھینچنا شروع کیا۔ تیسرا آدمی کمر کمر پانی میں ڈوبا اس کام میں لگا ہے کہ کشتی کہیں
خشکی پر نہ چڑھ جائے۔ ڈونگی پہاڑی نالہ میں اوپر لے جا رہے ہیں۔ بلندی بڑھتی جا رہی
ہے۔ پانی تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ نالہ کی تہ اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ پتھروں نے اپنا سر پانی سے
باہر نکالنا شروع کر دیا ہے۔ چٹانیں بھی ان کی مدد کو آ گئی ہیں۔ گاہے تینوں ملاح پانی
میں اتر جاتے ہیں اور ڈونگی کو مع ہر دو مسافر اٹھا کر پتھروں کے اوپر رکھ دیتے ہیں۔ پھر
کوئی کھینچتا ہے اور کوئی دھکیلتا ہے۔ اب ایک ایسی جگہ آ گئی ہے جہاں پتھر
بڑے بڑے اور اونچے اونچے ہیں۔ نالہ کا پانی ان کی بغلوں میں سے بہہ رہا ہے۔ ڈونگی کے لیے
پانی میں رہتے ہوئے آگے جانے کی کوئی راہ نہیں۔ ملاح اسے کنارے پر کھینچ لائے
ہیں تاکہ کچھ راستہ خشکی پر طے کرنے کے بعد پھر پانی میں ڈال دیں۔ مسافر اتر کر
ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور تماشہ دیکھنے لگا۔ دھارا بہت تیز ہے۔ موجیں ایک دوسرے
کے تعاقب میں سرپٹ دوڑ رہی ہیں۔ راستہ پتھروں سے پٹا پڑا ہے۔ پانی کو قدم
قدم پر ٹھوکر لگتی ہے۔ لہر راہ میں کھڑی چٹانوں پر منہ کے بل گرتی اور پاش پاش ہو
جاتی ہے۔ بوند بوند ہوا میں بکھر جاتی ہے۔ دوسرے لمحہ یہ بے بس چھینٹیں پانی میں گرتے
ہی ایک نئی لہر بن کر نئے جوش و خروش سے بہنے لگتی ہیں۔ یوں موج در موج یہ دھارا
تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دونوں طرف ڈھلوانوں پر اگے ہوئے درخت اس
پہاڑی دھارے میں اپنے عکس کو کانپتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ تماشہ ختم ہوا اور چڑھائی
کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔ یہ ٹکڑا گذرے ہوئے راستہ سے زیادہ کٹھن ہے۔ ملّاح
ہانپ رہے ہیں۔ ڈونگی میں بیٹھے ہوئے مسافر کو بھی سانس چڑھ گیا ہے۔ نالہ قدم

قدم اور قطرہ قطرہ سر کرنا ہوگا۔ نہ جانے کتنا راستہ ابھی باقی ہے۔

سلسلہ کوہ ماکیلنگ کی ایک پہاڑی کی نصف بلندی پر تھوڑی سی جگہ ہموار ہے۔ بیشتر جگہ پانی کے تالاب نے گھیری ہوئی ہے جس میں اوپر سے ایک آبشار گرتا ہے اور نیچے کی طرف کہستانی نالہ نکلتا ہے۔ باقی حصہ میں سیاحوں اور ملاحوں کے سستانے اور چائے پینے کے لئے جگہ بنی ہوئی ہے۔ وہ ڈونگیاں جو یہاں تک ہزار جتن سے پہنچی ہیں ایک طرف بندھی ہوئی ہیں تھوڑی دیر کے بعد پروگرام کے مطابق وقفہ وقفہ کے ساتھ ایک ایک کو سپرد سیل کر دیں گے۔ تالاب کے کنارے رہنے گیلے پہاڑ کے ساتھ ایک موٹی سی تار لگی ہوئی ہے۔ اسے پکڑ کر نا ہموار اور دشوار گذار پگڈنڈی پر چلیں تو آبشار کے پردے کے پیچھے جا سکتے ہیں جہاں پانی نے چٹان میں ایک چھوٹا سا غار بنا رکھا ہے۔ مسافر اس غار کے دہانہ میں بیٹھ کر دیر تک پانی کی دیوار اور اس کے پار دھندلے نقوش کو دیکھتا ہے۔ انسان ابھی اپنے گمان کے غار سے باہر نہیں نکلا۔ وہ صرف اس کے دہانہ تک پہنچا ہے۔ ایک حجاب کے پرے بسنے والی دنیا کا دھندلا سا نقش اس کے ذہن میں ابھر رہا ہے۔

واپسی کا اعلان ہو رہا ہے۔ ڈونگی کے ساتھ اب صرف ایک ملاح ہوگا۔ اس نے ہدایات جاری کیں۔ جم کر بیٹھئے۔ پیر پائدان کے ساتھ زور سے لگا کر رکھیے۔ ڈونگی کے اندر جو حلقے لگے ہوتے ہیں انہیں مضبوطی کے ساتھ ہاتھوں سے پکڑ لیجیے۔ جسم کا کوئی حصہ خاص طور پر ہاتھ اور سر ڈونگی کے کناروں سے باہر نہیں ہونا چاہیئے ورنہ وہ آپ سے پہلے منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔ اگر آپ ہشیاری اور مضبوطی سے نہ بیٹھے تو آپ پانی میں ہونگے جس کا ہر پتھر مگرمچھ سے کم خطرناک نہیں۔ گھبرائیے نہیں۔ ڈرنے کی

کوئی وجہ نہیں۔خطرہ بہت ہے مگر اس سے دوچار ہونے کی شرح تقریباً صفر فی صد ہے۔سوائے ایک شخص کے آج تک اور کسی کو یہاں حادثہ پیش نہیں آیا۔اس شخص کے بارے میں اب تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ اس نے خودکشی کی تھی یا حماقت۔ باتونی ملاح نے کنارے سے لگی ہوئی کشتی کو دھارے کے درمیان دھکیلا اور رسّی کھول دی۔ ٹھہری ہوئی کشتی یکدم ہُوا ہو گئی۔ملاح کا آدھا جملہ پیچھے رہ گیا اور کشتی آگے نکل گئی۔تیر کمان سے نکل گیا۔گولی زناٹے سے اپنے سفر پر روانہ ہو گئی دیوانہ کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور گھوڑے کی لگام۔ وہ آب لوڈر والی نظم کا اردو ترجمہ ایک تجربہ میں ڈھل گیا۔غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا۔ اچھلتا ہوا، مچلتا ہوا، سر پٹکتا ہوا، وغیرہ وغیرہ کرتا ہوا۔ پہاڑی بلندی سے عمودی ڈھلان پر بہنے والے پانی کے تیز بہاؤ میں کشتی کی رفتار چکنے پیندے اور نوکیلی ساخت کی بدولت پتھر کی ہر رگڑ کے بعد تیز تر ہوتی چلی گئی۔ وہ پتھروں پر گھستی اور ان سے ٹکراتی، پانی میں چکراتی اور بل کھاتی چھینٹے اڑاتی ڈولتی ڈگمگاتی دھکے اور ہچکولے کھاتی بے بس اور بے قابو، بہاؤ کے ساتھ بہے جا رہی ہے حلقوں کو زور سے پکڑے پکڑے ہاتھ شل ہو گئے ہیں۔کمر دھکے کھاتے کھاتے دکھ گئی ہے۔ رفتار لمحہ بھر کے لئے نظر کو جمنے کا موقع نہیں دیتی سو وہ چکرا گئی ہے۔ ڈونگی کو ایک پتھر نے دائیں جانب سے دھکا دیا تو وہ بائیں جانب ہو گئی۔ وہاں سے چٹان نے کہنی ماری تو ایک طرف اتنا جھک گئی جیسے الٹنے والی ہو۔خوفناک زاویے اور خطرناک رفتار سے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سامنے سے ٹھوکر لگی تو ایک جھٹکے کے ساتھ سیدھی ہو گئی۔

اب وہ جگہ آ گئی ہے جہاں چٹانیں راستہ روکے کھڑی ہیں۔آتے ہوئے ڈونگی کو کنارے پر لا کر سلطان محمد فاتح کی طرح خشکی پر چلایا اور اس پہاڑی حصہ کو پار کیا تھا۔اس وقت تو

کشتی سیدھی چٹانوں کی طرف بہتی جا رہی ہے۔ یہ کوئی پانی تو ہے نہیں کہ ان کے نیچے سے نکل جائے۔ جگر تھام کے بیٹھنے کا مقام ہے۔ ڈونگی کا اگلا خمدار سرا بڑی سرعت اور صفائی کے ساتھ چٹان پر چڑھ کر ہوا میں بلند ہو گیا۔ اتنے میں مسافروں والے سرے نے بھی اسی عمل کو دہرایا اور ڈونگی لمحہ بھر کے لئے ہوا میں اڑنے کے بعد ایک زوردار دھماکے کے ساتھ پانی میں آن گری۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ باقی راستہ کتنا ہے اور کیسا ہے۔ ڈونگی پر اسے طے کرتے کیا گذری۔ آنکھیں اس وقت کھلیں جب موٹر بوٹ اسٹیشن آ گیا۔ ڈونگی ساکت کھڑی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مسافروں کے جامے پانی پانی ہیں اور زیر جامے پسینہ پسینہ۔ مسافر نے ہم سفر کی طرف دیکھا۔ آنکھیں کہہ رہی ہیں۔ عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام۔

(۷)

ہوائی جہاز اس وقت ہنزہ کی وادی پر پرواز کر رہا ہے چشم زدن میں یہاں آن پہنچا ہے اور اس سے بھی کم وقت میں اسے پیچھے چھوڑ جائے گا۔ اس وادی کا ایک سفر وہ بھی تھا جس میں جو کھم کے کئی دن لگے تھے۔ ایک دہائی گذرنے کے باوجود وہ تجربہ تازہ یاد کی طرح ہرا بھرا ہے اور اس سفر کی تکلیف کی تلافی مدت سے اس کا ذکر مزہ لے لے کر کرنے سے ہو چکی ہے۔ تجربے کی تلخی وقت کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے اور فاصلہ اس میں رنگ بھرتا ہے۔ پھر خود فریبی کا ایک ایسا دن بھی آتا ہے جب بیان اور تجربے میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں رہتی۔ مسافر اس خطرہ سے واقف ہے اس لئے ہنزہ کے پہلے پر خطر سفر کا حال اس دن سے پہلے کرنا چاہتا ہے جب وہ خواب کے بجائے محض خیال رہ جائے۔ اس سفر میں جیپ ایک پہاڑی پگڈنڈی

پر کسی کھوجی کی مانند یاک کا کھُر انکال رہی تھی ۔ رک کر چلتی اور چل کر رکتی ۔سواری کی مشین نے سارا زور لگایا ، بہت شور مچایا ، پوری صلاحیت صرف کی اور کئی کمال دکھائے مگر راستہ تھا کہ کسی طرح کٹنے میں نہ آتا ۔ مدتوں اس راستہ پر گرمیوں میں گھوڑوں اور سردیوں میں یاک پر سفر کرتے تھے ۔ ابھی حال ہی میں اس راستہ کو ذرا سا چوڑا کرنے کے بعد جیپ کو اس پر چلنے کی اجازت ملی تھی ۔سفر کی صورت حال اور انتظامات کی صورت حالات کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدانخواستہ ایک جیپ کو حادثہ پیش آجاتا تو اس کی امداد کے لئے دوسری جیپ آٹھ دس میل فی گھنٹہ کی طوُفانی رفتار سے دوڑاتے اور تیسری جیپ کو دوسری کی خیریت معلوم کرنے کے لئے روانہ کرتے ۔سفر کے دوران جب جیپ میں مسافر کی نشست چٹان کی طرف ہوتی تو وہ آدھا باہر لٹک جاتا ۔ظاہر یہ کرتا کہ منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ایسا کر رہا ہے مگر اصل مقصد صرف اتنا تھا کہ اگر وہ وقت آجائے جو وقت معین نہیں محض وقت ضرورت ہے تو موقع شناس کو جیپ سے کود کر باہر نکلنے میں دیر نہ ہو جائے ۔ اسی سفر میں جب مسافر کی نشست ہزاروں فٹ گہرے عمودی کھڈ میں بہنے والے تیز رو پتھریلے پہاڑی دریا کی طرف ہوتی تو وہ خوف کا علاج خوبصورتی سے کرتا اور منظر میں کھو جاتا ۔اس کے علاوہ سفر کو خیریت اور خوشی سے طے کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی ۔

اس سفر میں بہت سے کٹھن مقامات آئے جنہیں پُل کہا جاتا ہے ۔بیشتر پُل زنگ خوردہ زنجیروں ، گھسی ہوئی میخوں اور پھٹے ہوئے تختوں کی مدد سے کھڈ کے آر پار کھڑے تھے ۔ نہ کوئی محکمہ ان کا والی نہ کوئی مہندس ان کا نگہبان ۔ یہ تعمیر ہونے والے روز سے لے کر ڈھے جانے والی گھڑی تک محض اپنے بل بوتہ پر کھڑے رہتے ۔ایک

پُل ایسا بھی تھا جسے بناتے ہوئے شاید پل صراط کا نقشہ مستعار لیا تھا۔ یہ ایک چوٹی پر بنا ہوا تھا جو ایڑی تک شق تھی۔ شگاف کوئی پندرہ بیس فٹ کا تھا۔ گہرائی اتنی کہ تہہ نظر نہ آئی لہذا پتھر پھینک کر آواز سے اسے ناپنا چاہا۔ آواز آنی شروع ہوئی تو مسافر نے دم سادھ لیا مگر تابکے۔ سانس روکنا مشکل ہو گیا مگر آواز تھی کہ بدستور آتی رہی۔ جب ختم ہوئی تو بازگشت شروع ہو گئی۔ بازگشت ختم ہوئی تو کچھ دیر کان بجتے رہے۔ دوبارہ جھک کر دیکھا تو سر چکرانے لگا۔ اتنے گہرے کھڈ کو چار پانچ درختوں کے تنے رسّی اور سر کنڈے سے باندھ کر پاٹ رکھا تھا۔ دونوں سروں پر کوئی قابل ذکر روک بھی نہ تھی اور چوڑائی کے رخ دونوں جانب نشان کے طور پر جو رسی جھول رہی تھی وہی جنگلہ کا کام دیتی تھی۔ اس پُل کا ایک سرا اتنا سیدھا اور عمودی تھا کہ جب اس پر جیپ چڑھائیں تو یہ نظر سے اوجھل ہو جاتا۔ دوسری طرف سڑک اتنی سرنگوں اور پیچدار تھی کہ جب اس پل سے اتریں تو یہ پتہ نہ چلتا کہ اگلے پہیے ہوا میں ہیں یا زمین پر۔ اس پل کا جائزہ لینے کے بعد جی لوٹ جانے کو چاہا مگر واپسی کی راہ بند تھی۔ جیپ موڑنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور وہ صرف اس رخ پر سفر جاری رکھ سکتی جدھر اس کا منہ تھا۔ ناچار مسافر نے ہمراہیوں کے سامنے بے خوفی کا روپ دھارا، ان کی ہمت بندھائی اور پل پار کر لیا۔ انسان نے اپنے تاریخی سفر میں بہت سی منزلیں صرف اس صورت میں سر کی ہیں کہ فرار کا راستہ بند ہو چکا تھا۔ عین ممکن ہے کہ کئی مشہور فاتح دل میں طے کر چکے ہوں کہ اب میدان جنگ سے بھاگنے کا وقت آ گیا ہے مگر بھاگنے کی راہ اور فرصت نہ ملی اور اسی اثنا میں فتح نے بڑھ کر ان کے قدم چوم لئے۔ انسان کی کئی کامیابیاں ایسی اتفاقی ہیں کہ ناکامی کے وسوسے دل میں اٹھے مگر زبان پر جو تالے پڑے تھے انہیں

کھولنے میں دیر ہوگئی، ادھر اتنی دیر میں کامیابی نے دروازے پر دستک دیدی۔

مسافر نے ہنزہ کے دروازے پر دستک دی۔ خیال تھا کوئی بڑی سی بستی اور چوڑی سی وادی ہوگی۔ بلندی کی وجہ سے گرمیوں میں سرد ہوگی اور مشہور ہونے کی وجہ سے خوبصورت بھی ہوگی۔ وہاں پہنچے تو قدرے مایوسی ہوئی۔ پہاڑ کی پشت سے ٹیک لگائے ذرا سی بستی سستا رہی تھی جیسے دم لے کر کہیں اور کوچ کر جائے گی ڈھلوانوں پر خوبانی کے درخت اور چپہ بھر کے کھیت، نیچے دریائے ہنزہ اور اوپر راکاپوشی کی چوٹی، درمیان میں جو جگہ بچ گئی وہاں گرمی پڑ رہی تھی اور خاک اڑ رہی تھی۔ یہ خاک بالوں میں بیٹھ گئی، چہرے پر جم گئی اور ہونٹوں سے ہوتی ہوئی زبان کی نوک پر آگئی۔ منہ دھونے کے لئے پانی منگایا تو اس میں بھی موجود تھی۔ پانی خواہ دریا کا ہو خواہ چوٹی سے پگھل کر آنے والے چشمہ کا، ہر ایک جگ پانی میں نصف جگ ریت شامل تھی۔ اس ریت کے تہ میں بیٹھنے کے باوجود پانی کا رنگ سیاہی مائل تھا۔ مسافروں کو بہلانے کے لئے مقامی داستان طرازوں نے اس گدلے پانی کی خوبیوں کے متعلق بہت سے قصے گھڑے ہوئے ہیں۔ مسافر نے ان قصوں اور قصیدوں کو سنا۔ سنانے والوں میں پرجا بھی تھی اور اس کا راجہ بھی۔

میر آف ہنزہ ان دنوں وہ مرتبہ حاصل کر چکے تھے کہ سیاح انہیں راکاپوشی کے بعد اس علاقہ کا اہم ترین قابل دید مقام قرار دیتے۔ ان کو دیکھ لیا تو سارا ہنزہ دیکھ لیا۔ رانی صاحبہ کو دیکھ لیا تو خوبانی کے سارے باغوں کی سیر کر لی۔ مسافر ان کا مہمان تھا اس لئے تاشی محل میں اترا۔ پرانا متروکہ محل نرا کھنڈر ہے۔ اس محل کی دیکھ بھال ہوتی ہے اس لئے یہ عمارت نئی لگتی ہے۔ اگر یہ تعمیر کہیں اور ہوتی تو اسے بنگلہ یا ویلا

کہتے مگر یہ ختن اور کاشغر کے راستہ پر واقع ہے اور اس کی کھڑکیوں سے ٹیک لگا کر برف کا جو تودہ کھڑا ہے اسے کوہ راکاپوشی کہتے ہیں۔ اس دور افتادہ کچی پہاڑی بستی میں ایسی عمارت کی حیثیت ایک محل کی ہے سو بنانے والے نے یہ بات پتھر پر لکھ کر لگا دی ہے تاکہ سند رہے۔ لکھائی خراب، بھرائی ناقص، ہجے نادرست۔ کتبہ پر لکھا ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' ایں قصر مشیّد موسوم تباشش محل بر فرق سنگ بست در عہد مملکت سریر آرائی سلطنت عالیجاہ کی۔سی۔آئی۔ای میر محمد نظیم خاں صاحب والئی ہنزہ تاریخ ۲۵ ۱۹ مطابق ۱۳۴۴ بصرف تمام۔ بہت ڈھونڈا مگر تمام کے بعد شد کے آثار نظر نہ آئے۔ سارا علم یہاں آکر تمام ہو گیا۔ مسافر کو حیرت ہوئی کہ ایسے سنگ ساز نے قصرِ مشیّد کی قرآنی ترکیب کہاں سے اڑا لی۔ اس ایک ترکیب لفظی کی وجہ سے سلسلہ قراقرم میں واقع ہنزہ کی اس چوٹی اور اناطولیہ کے وسیع لہردار میدان میں واقع شہر قونیہ کے فاصلے یکایک سمٹ گئے۔ محکمی اور قدر و منزلت کا ایک دوسرا پیمانہ یاد آگیا۔ یہ فیض مولانا روم کا تھا جو مثنوی میں علم بالخصوص علمِ دین کو قصرِ مشیّد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مسافر نے رات کا کھانا میر جمال خاں کے ساتھ کھایا۔ دعوت اور میزبان دونوں خوش مزہ تھے۔ میر صاحب بے تکلف اور کھانا پر تکلف۔ اس کے باوجود اس تقریب میں فرماں روائی کی یاد دہانی اشاروں سے اور امارت کی نشاندہی کنایوں سے ہو رہی تھی۔ ماحول سے سمجھوتہ کرنے کے باوجود مسافر وہ جل تھلی جانور رہے جسے سلطانی تکلفات اور حکمرانی تصنّع کے سمندر میں سانس لینے کے لئے گاہ بگاہ سطح پر آنا پڑتا ہے۔ مسافر نے میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں جو سب سے معصوم نظر آیا اس سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ ایک بچی تھی جسے استاد گھر پر پڑھاتا تھا۔ آج استاد نے اکبر بادشاہ کے بارے میں سبق

پڑھایا تھا مسافر نے بے خیالی میں سوال پوچھ لیا، اکبر کے پیشرو یا اس کے جانشین کا نام بتاؤ۔ خاموشی چھپا گئی۔ حاشیہ نشینوں نے جواب کے انتظار میں چھری کانٹے روک لئے تا کہ شاباشں کا نعرہ لگانے میں دیر نہ ہو جائے۔ مسافر نے الجھن بھانپ لی اور اس سے نکلنے کے لئے فوراً پینترا بدلا اور کہا، یہ بتاؤ کہ ہمایوں اور شہزادہ سلیم میں کون اکبر کا باپ تھا اور کون شہزادہ۔ خاموشی اَور گہری ہو گئی۔ مسافر نے دونوں سوال واپس لے لئے اور ریاست کے نظام تعلیم میں دخل در معقولات کی معذرت چاہی۔ کھسیانا ہو کر یہ بھی یاد دلایا کہ اکبر غیر تعلیم یافتہ تھا، نہ پڑھ سکتا تھا اور نہ لکھ سکتا، اس کے باوجود وہ مغل اعظم کہلاتا ہے۔ اس کے بعد مسافر نے بات کا رخ سیاحوں کی طرف موڑ دیا۔ گفتگو کے دوران اس کتاب کا ذکر آیا جس میں ایک بدیسی سیاح نے لکھا تھا کہ میر صاحب کے محل میں ایک بڑا پیانو رکھا ہوا ہے۔ وہ سیاح جب تک ہنزہ میں رہا اسی بات پر تعجب کرتا رہا کہ اتنا بڑا اور نازک آلہ موسیقی راکاپوشی کے دامن تک کیسے پہنچا۔ کیا یہ ملکہ سبا کا محل ہے کہ جنّ اٹھا کر یہاں رکھ گئے۔ سیاح کی نگاہ پیانو تک پہنچ گئی مگر اس حقیقت کی تہ تک نہ پہنچ سکی کہ بات جِنّوں کی نہیں جُنوں کی ہوتی ہے۔ شوق وہی مانگتا ہے جو مشکل ہو۔ امیر آدمی کا شوق اکثر اس مشکل پر مچلتا ہے جو مہنگی ہو تا کہ جواری کی طرح شرط بدنے اور نیلام کے خریدار کی طرح بڑھ کر بولی دینے کی لذت کشش و پیچ بھی اس میں شامل ہو جائے۔ لاول ٹامس نے لاسکی کے ابتدائی دور کے آرٹسٹ کی حیثیت سے اور عرب کے لارنس کی تشہیر کے ذریعہ اتنا روپیہ کمایا کہ ایک بڑا پیانو کیا اس نے ایک بڑی پہاڑی ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دی۔ بات کچھ یوں تھی کہ اس نے ایک سطح مرتفع پر مکان بنایا اور بیوی کو تحفہ میں

دیا۔ بیوی نے مکان پسند کیا اور کہا کاش اس مکان کے پس منظر میں واقع پہاڑی بائیں کے بجائے دائیں جانب ہوتی تو ترتیب میں مزید حسن پیدا ہو جاتا۔ اگلی بار جب مسٹر لادل ٹامس وہاں پہنچیں تو پہاڑی ان کے حسب منشا دوسری جانب ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ پہاڑی کھودنے اور اس کی مٹی کو لاد کر دوسری جانب لے جانے اور وہاں پہاڑی کی صورت میں جمانے کا کام اس روپیہ نے کیا تھا جس کی فراوانی سے ہتھیلی پر سرسوں بھی جم جاتی ہے۔

لادل ٹامس ایک بار ہنزہ بھی گیا تھا۔ وہ ان دنوں ایک فلم بنا رہا تھا جس کے انگریزی عنوان کا بامحاورہ ترجمہ ہے، فردوس بر روئے زمیں۔ ایک بیتاب روح سکون کی تلاش میں تین دور افتادہ مقامات کی سیر کرتی ہے، ایک ہنزہ دوسرا نیپال اور تیسرا نامعلوم۔ سنا ہے کہ اس فلم کے لئے نقلی جشن تو بہار منعقد کیا گیا تھا۔ اصلی جشن سال میں ایک بار بجائی کے موسم میں ہوتا ہے۔ اس تقریب میں میر آف ہنزہ زربفت کی اچکن پہن کر ناج لگا کر پرانے محل کے جھروکے سے پہلا بیج دست مبارک سے زمین کی طرف پھینکتے ہیں۔ مسافر نے پوچھا کہ لادل ٹامس نے ہنزہ کی شہرت کا جو بیج لگایا ہے اس سے ریاست کو کچھ یافت بھی ہوئی ہوگی۔ میر صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے نہ لادل ٹامس سے کچھ ملا نہ بدیسی سیاحوں سے کبھی کچھ ملتا ہے۔ یہ سیاح منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ کاندھے سے بوجھ اتار کر نیچے رکھتے ہیں۔ اس میں نائیلون کا خیمہ، سونے کا تھیلا اور خوراک کے بند ڈبے ہوتے ہیں۔ جاتے ہوئے وہ ہنزہ کو خالی ڈبے اور خالی بوتلیں دے جاتے ہیں۔ جو اس کا اہتمام بھی نہیں کر سکتے وہ سیدھے میرے مہمان خانے میں آ دھمکتے ہیں۔ ان کے اخراجات اور نخرے میں

برداشت کرتا ہوں۔ اس کے عوض کبھی کبھی شکریہ کا خط بھولے بھٹکے آجاتا ہے۔ یوں لگا جیسے انہوں نے سیاحوں کو ہمیشہ مفت ٹھہرایا ہو اور واپسی کے لئے ادھار بھی پلے سے دیا ہو۔ مسافر کو حیرت ہوئی، نہ ریاست اتنی آسودہ کہ ایسے اخراجات کی متحمل ہو سکے اور نہ میر آف ہنزہ اتنے سادہ جتنے میر تقی میر۔ اس حیرت کے باوجود مسافر کو اقرار ہے کہ میر صاحب اور ان کے اجداد بڑے مہمان نواز تھے۔ اس کی ایک سند تاریخ میں محفوظ ہے اور دوسری ایک بوسیدہ رجسٹر میں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب انگریز قراقرم میں راج پاٹ لے کر آگیا تو ملت کی شکست کے بعد اس کی مہمانداری کا بوجھ بھی ہنزہ اور ناگر کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا۔ علاوہ ازیں میر صاحب کے پاس ایک پرانا مہمان نامہ بھی ہے جس میں پچھلی نصف صدی کے دوران شاہی مہمان نوازی سے مستفید ہونے والے معززین کے نام اور تاثرات درج ہیں۔ سنکیانگ کے گورنر، تبت کے لاٹے، چین، انگلستان اور امریکہ کے مسافر جن میں سے اکثر معزز ہونے کے باوجود جاسوسی کے لئے اپنی جان سفر کے جوکھوں میں ڈالتے تھے اس دفتر میں داخل ہیں۔ زمانہ ماقبل جیپ کے مسافروں کی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے اور ان کے تاثرات پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسافر انہیں دلچسپی سے پڑھ رہا تھا مگر جب اس کی نظر ایک ہم عصر کے حد درجہ مبالغہ آمیز تاثرات پر پڑی تو سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ کچھ یوں لکھا تھا کہ میزبانوں کے حسن سیرت کا مقابلہ اگر کسی شے سے ہو سکتا ہے تو وہ انہی کا حسن صورت ہے۔ مسافر نے بے مزہ ہو کر اسے بند کر دیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سفر کی رفتار اور سہولتیں بڑھنے کے ساتھ سچ بولنے کا رواج اسی مقدار اور رفتار سے کم ہو گیا ہے۔ میر صاحب کہنے لگے، مہمان نامہ پھر کھولئے، اس میں جنرل ایوب خاں کے دستخط بھی ہیں۔ ذرا ان کے نیچے جو تاریخ درج ہے اس

پر غور کیجئے۔ وہ فوجی انقلاب برپا کرنے سے چند دن پہلے یہاں آئے تھے۔ ہنزہ کی نکھری اور خنک فضا میں انہیں ملک کی تاریخ اور مستقبل کے بارے میں اہم ترین فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی ہوگی۔ وہ ایوب خانی انقلاب کی کامیابی کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت یہ بات میر صاحب کے وہم و گمان میں نہ ہوگی کہ انقلاب کے انجام پر بھی ہنزہ کی چھاپ ہوگی اس عہد کا اختتام چھ نکات کی ریت اڑنے سے اتنا گدلا ہوگیا جتنا ہنزہ کا پانی۔

ہنزہ کے پہلے سفر کے دوران مسافر نے پرانا غیر آباد محل اور نیا زیر تعمیر بجلی گھر بھی دیکھا۔ لکڑی اور پتھر کا قلعہ نما مکان بستی سے لگا ہوا مگر سب سے بلند جگہ پر بنا ہے۔ راستہ ایسی گلیوں سے ہو کر جاتا ہے جن کے آر پار مکانوں کی دوسری منزلیں اور برآمدے بنے ہوتے ہیں۔ دربارداری کے دالان اور مہمانداری کے کمرے خان ساماں کے گودام، خزانہ کے لئے خفیہ دہری منزلیں اور چور خانے، اسلحہ کے لئے تہ خانہ اور بارود خانہ سب کچھ اس ویران اور وسیع عمارت کی بھول بھلیاں میں موجود ہے۔ کہتے ہیں خانۂ خالی را دیومی گیرد اور یہ خانہ خالی بھی ہے اور خستہ بھی۔ آسیب تو مسافر کو نظر نہیں آیا مگر اس کا عکس دیکھنے کو ملا۔ ایک کمرے میں لارڈ کرزن کی تصویر آویزاں ہے۔ اخبار میں چھپی ہوئی تصویر کا تراشہ ہے۔ کاغذ کا رنگ بالکل بدل گیا ہے۔ زمانہ اس سے کہیں زیادہ رنگ بدل چکا ہے۔ لارڈ کرزن کو گذرے ہوئے پون صدی ہوئی ہوگی مگر اس کے عہد پر صدیاں بیت چکی ہیں۔ عہد انسانوں سے بہت پہلے بوڑھے ہو جاتے ہیں انسان روز و شب کے سست حوالے سے اور عہد سوچ کی رفتار سے بوڑھا ہوتا ہے۔

مسافر صبح کی سیر کو نکلا تو نئے بجلی گھر تک جا پہنچا۔ یہ چھوٹا سا کھلونا ہے جسے دریا گذار میں لوگ دو چار ماہ میں جوڑ لیتے مگر ان دشوار گذار پہاڑوں میں یہ قابو سے باہر

ہے۔ کئی سال گذر چکے ہیں چند اور گذریں گے پھر کہیں نئی روشنی کی جھلک دیکھنے کو ملے گی۔ اس کی تعمیر کے لئے سارا ساز و سامان نیچے سے لایا گیا۔ سیمنٹ، لوہا، مشین اور ڈپلومہ انجینئر۔ سامان کی ہر شے کو لانے کے لئے لاکھوں جتن کئے تب وہ ہنزہ تک پہنچ پائی۔ ایک ماہر معاشیات نے کہا تھا کہ سامان ڈھونے میں سب سے زیادہ مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب وہ انسانوں پر مشتمل ہو۔ اس مقولہ کی حقیقت اس وقت کھلی جب محکمہ کو اس بجلی گھر کی تعمیر کے لئے ہنزہ بھیجنے کی ضرورت پڑی۔ کوئی ماہر اس منصوبہ پر کام کرنے کے لئے اپنی خوشی سے یہاں آنے اور چند سال رہنے کو تیار نہ تھا۔ جسے ناخوشی کے باوجود بھیجا اس نے استعفا دے دیا۔ بالآخر ایک ایسا ڈپلومہ مہندس مل گیا جسے اب یہاں سے واپس بلاتے ہیں تو وہ جانے سے انکار کرتا ہے۔ محکمہ اصرار کرتا ہے تو وہ استعفا کی دھمکی دیتا ہے۔ چین کی سرحد سے لیکر گلگت کے مضافات تک اس سے زیادہ تعلیم یافتہ مہندس مشکل سے ملے گا۔ یہ دھان پان سا کم عمر لڑکا اس ماحول میں سب سے مختلف نظر آیا۔ یہاں کے لوگ خوش رنگ، بھرے جسم، نکلتے قد، ڈھیلے کپڑوں اور چترالی ٹوپیوں والے۔ رفتار میں آہستہ، گفتار میں خاموش، تعلیم میں کورے۔ یہ ڈپلومہ یافتہ، سانولا، اکہرا بدن، میانہ قد، پھرتیلا اور باتونی لڑکا تھا جس نے بش شرٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس علاقہ سے لاکھ اپنائیت جتانے کے باوجود وہ کسی صورت اس منظر میں کھپتا نہ تھا۔ لیکن اس نے مسافر کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ اب ہمیشہ کے لئے ان پہاڑوں اور برف کے تودوں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس نے یہاں اپنا مکان بھی بنا لیا ہے۔ مسافر اس کا مکان دیکھنے گیا۔ شفاف چشمہ سے ایک چھوٹی سی نہر نکال کر وہ اپنے صحن میں لایا ہے جہاں وہ ایک چکر لگانے کے بعد باورچی خانہ سے ہوتی

ہوئی غسلخانہ میں جانکلتی ہے اور وہاں سے ہمہ وقتی طہارت کا دھارا مکان کی پشت پر
کھڈ میں جا گرتا ہے۔ صحن میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کرکے بیٹھیں تو اس چلّوبھر نہر کا ترنم
لوریاں دیتا ہے۔ آنکھیں کھولیں تو خنک آب رواں سے ان میں ٹھنڈک پہنچتی ہے مسافر
نے لوریاں سننے کے بعد آنکھیں کھولیں تو برآمدے میں شکار کی کھالیں، سینگ اور بندوقیں
پڑی ہوئی تھیں۔ رخصت ہونے کا وقت آیا تو مسافر کو مارخور کے سینگوں کی ایک خوبصورت
جوڑی تحفے میں ملی۔ ڈپلومہ مہندس نے راکاپوشی کے برف سے ڈھکے ہوئے وسط کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ شکار اس مقام پر کیا تھا۔ پھر شرما کر بولے کہ اس سے ذرا نیچے
جو زمین برف میں دبی ہوئی ہے وہ انہیں جہیز میں ملنے والی ہے۔ ایک بار مسافر نے
کسی علاقہ میں ایک ایسا درخت دیکھا تھا جس کی موجودگی جغرافیہ کی رو سے وہاں غیر امکانی
تھی۔ ماہر نباتات سے رجوع کیا اور اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا بیج کی سخت
جانی ہے اور چیل کی کارستانی۔ نہ جانے کہاں سے چگ آئی، بیج ہضم نہ ہوا تو یہاں گرا
دیا۔ انسان کو بھی روزگار چیل کی طرح پیٹ میں لے کر اڑتا رہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے
گرا دیتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ نام نقوی ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ پیدائش امروہہ کی ہے، یہ
خاطر میں نہیں لاتا کہ تعلیم کراچی میں حاصل کی ہے۔ اس کی بلا سے کوئی آسمان سے گرے
اور کھجور کے بجائے ہنزہ کی خوبانی کے خوشوں اور نا گر کی زلف خوباں میں اٹک کر رہ جائے
نقوی نے مسافر کو بتایا کہ رخصتانہ کی منتظر ناگری منکوحہ اردو سیکھنے کی کوشش کر رہی ہے مگر گیسوئے
اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔ زلف کے سر ہونے تک اسے بہت دیر جینا ہوگا۔
مسافر چند سال بعد پھر ہنزہ پہنچا۔ اس مرتبہ اہل و عیال اور عملہ بھی ہمراہ
تھا۔ شاہراہ ریشم کی ہموار راہوں اور پاک چین دوستی کے کنکریٹ پلوں سے ہوتا ہوا خنجراب

جا پہنچا۔ راستہ پر پیشتر مال روڈ کا گمان ہوتا تھا۔ نہ دوری کا احساس ہوا نہ مجبوری کا خیال آیا۔ دن بھر میں گلگت سے خنجراب پہنچ گئے۔ راستہ میں تازہ دم ہونے کیلئے گرم چائے ملتی رہی اور وائرلیس سے جا بجا رابطہ قائم رہا۔ششکٹ پر فیری کے ذریعہ دوسری طرف جا اترے۔ بچوں نے جگہوں کے نام لکھنے شروع کر دیئے، گل متھ، جیسنی، پسو، خیبر، مورخن، سست، خدا آباد، بل، دہ، گوسشں گل۔ اس کے بعد پیا پے بارہ موڑ آئے اور سڑک ساڑھے دس ہزار سے تقریباً ساڑھے چودہ ہزار فٹ کی بلندی تک جا پہنچی اس سفر سے پہلے کچھ ایسے لوگ ملے تھے جو اپنی قیمتی رائے مفت تقسیم کر رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دس ہزار فٹ کے بعد آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے اس لئے باتوں میں یا جیپ سے اتر کر دوڑنے بھاگنے میں آکسیجن ضائع کی تو بیہوش ہو جانے کا خطرہ ہے۔ درہ خنجراب میں پاک چین سرحد پر دس پندرہ منٹ سے زیادہ کھڑے رہنے میں بھی اسی قسم کا خطرہ ہے۔ مشورہ دینے والوں نے مثال بھی دی اور بتایا کہ نوجوان وزیر تعلیم چند روز پہلے آئے تھے اور خنجراب پہنچ کر چاروں شانے چت ہو گئے۔ مسافر مشوروں کے نرغے میں تھا۔ اس نے گھیرا توڑنے کے لئے جیپ خود چلانی شروع کر دی، راستہ میں باتیں بھی ہوتی رہیں، ترنم سے شعر بھی پڑھے گئے، کئی بار رک کر پہاڑیوں پر چڑھے اور تصویر کشی بھی کی خنجراب پہنچے تو چند تنومند مگر پالتو یاک نظر آئے۔ بچوں نے ان کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ سرحد پہ جو رہنما کھمبا اور اطلاعاتی تختہ تھا وہ گرا ہوا تھا۔ اسے نصب کرنے میں کچھ وقت لگا۔ اس کے بعد چائے اور تصویر کشی کا ایک دور چلا۔ سرحد پر سجدہ کرنے کے بعد گھڑی دیکھی تو پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ ہمراہیوں کی طرف دیکھا تو سب واپسی کے لئے چاک و چوبند تھے۔

اس سفر کے دوران بہت سے لوگ ملے، بھانت بھانت کے لوگ اور

دور دور سے آئے ہوئے لوگ، مقامی اور ملکی اور غیر ملکی لوگ۔ چینی باشندے بھی نظر آئے۔ سر جھکائے سڑک پر کام کر رہے تھے۔ اس علاقہ میں اب کئی نئی سڑکیں بن گئی ہیں، اور کئی نئی بستیاں بس گئی ہیں۔ کشادہ اور بارونق بازار ہیں۔ ہسپتال، مدرسے، دفاتر اور ریسٹ ہاؤس ہیں بس کا اڈا بھی ہے اور دو چار روز پرانا اخبار بھی مل جاتا ہے۔ بجلی کا انتظام وسیع پیمانہ پر ہے۔ بجلی گھر میں ڈپلومہ اوورسیر کے بجائے ڈگری انجینئر اور فوجی افسر لگے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک بھی نقوی نہیں۔ ہنزہ کی ریاست ختم ہو چکی ہے اور آخری میر آف ہنزہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ تاشش محل آباد ہے۔ اس میں ذیلی عمارتوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ وہاں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں ایک بھی میر جمال خاں نہیں۔ ہنزہ کا ماحول بدل چکا ہے، منظر نہیں بدلا۔ مسافر نے ہوائی جہاز کے دریچہ سے دیکھا تو راکاپوشی کا بھاری بھرکم پہاڑ اپنا سفید برفانی چوغہ پہنے کلاہ میں نقرئی سیمرغ کے پر سجائے اس جشن نوبہار کی صدارت کر رہا تھا۔

(۸)

پہاڑ کی چوٹی پھن پھیلائے چوکس اور ساکت کھڑی ہے، کان آہٹ پر لگے ہیں۔ آج کوئی غیر اس کے علاقہ میں گھس آیا ہے اور اس کی خاموش زندگی میں مخل ہو رہا ہے۔ یہ ہوائی سفاری کا جہاز ہے جو نزدیک آتا چلا گیا اور جب بہت قریب پہنچ گیا تو اس کے گرد چکر لگانے لگا۔ جیٹ انجن بین کی دو ننھی تھوتھنی کی طرح پھن کے گرد گھومنے اور گونجنے لگے۔ چوٹی جھوم اٹھی، یہ راکاپوشی ہے۔

ہوائی جہاز پہاڑ کی چوٹی سے اونچا ہے پھر بھی چوٹی اس سے اونچی لگ رہی ہے۔ جہاز کی بلندی وقتی اور عارضی ہونے کی وجہ سے کمتر لگتی ہے۔ پہاڑ اس نے

قدآور لگتا ہے کہ اس میں استقلال اور استواری ہے۔ یہ کل پرزوں کا ڈھانچہ ایک روز چند لمحوں کے لئے مہانوں کو رے کرادھر نکل آیا ہے مگر راکا پوشی تو صبح ازل سے اپنے پیروں پر کھڑا کسی حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ مسافر اس چوٹی سے راہ ورسم رکھتا ہے۔ وہ جب بھی اس راہ سے گذرا اس برفانی تودہ نے رسم شناسائی نبھائی اور اس کے دل کو شاد اور گرم کیا۔ مسافر نے کئی بار اس پہاڑ کے دامن کو ہاتھ لگایا اور کم از کم ایک بار عالم خیال میں بلند ہو کر اسے چوما ہے۔ خیال اور منظر کے ہر نئے زاویے سے مسافر کو اس کا ایک نیا رخ نظر آیا۔ ڈھلتے سورج میں وہ سفید ریش بوڑھا لگتا ہے۔ چڑھتے سورج میں نوجوان ولیعہد معلوم ہوتا ہے۔ عصر کے وقت عہد کا دلی نظر آتا ہے۔ ایک دوپہر ہوائی جہاز کے دریچہ سے جھانکا تو اسے مائل پرواز پایا۔ یہ سارے رنگ اور رخ ایک پہاڑ کے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ہونگے جو نظر نہیں آئے۔ قدرت کے کارخانہ میں کوئی شے یک رنگی نہیں، کوئی چیز یک رخی نہیں۔ نظر سے آگے بھی رنگ ہوتے ہیں۔ فہم سے آگے بھی رخ ہوتے ہیں۔ پرواز خیال کتنی بلند ہی کیوں نہ ہو حقیقت اس سے کہیں زیادہ بلند ہوتی ہے۔

بوئنگ سات سو سات نے رخ تبدیل کیا۔ اب وہ جنوب مشرق کی طرف پرواز کر رہا ہے۔ راستہ کا کچھ حصہ ایسا ہے کہ ایک طرف برف سے ڈھکے سفید پہاڑ ہیں دوسری طرف دھوپ سے جلی سیاہ پہاڑیاں۔ اور ان دونوں کے سایہ تلے چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں۔ یہ راہ میں ایک چوٹی سب سے الگ تھلگ اپنی ذات میں مگن کھڑی ہے۔ ہوائی جہاز اپنی دھن میں ہے سو اسے نظر انداز کرتا ہوا بلند فصیلوں کے دائرہ میں گھری ہوئی سکردو کی کشادہ وادی میں جا نکلا ہے۔ پہلے اس نے وادی کا جائزہ لینے کے لئے پہاڑوں کے گھیر پر اڑنا شروع کیا۔ یوں لگا جیسے مٹی کا بڑا سا کٹورہ ہے اور جہاز اس کے کنارے پر چیونٹی

کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ جہاز گول گھومتا ہوا نیچے ہوتا جا رہا ہے۔ پہاڑوں کا نصف آگیا ہے اور یہ چکر ایسے لگ رہا ہے جیسے کوئی لکڑی کے کنوئیں کے اندر دیوار پر موٹر سائیکل چلا رہا ہو۔ یہ ہوائی جہاز بہت بڑا ہے۔ اس کے چار طاقتور جیٹ انجنوں میں کئی ہزار گھوڑوں کا اصطبل ہے۔ مسافر جب پہلی بار اس وادی میں آیا تھا تو اس کا جہاز ایک حقیر ڈکوٹا تھا جس میں دو پنکھا انجن لگے ہوئے تھے۔ کوئی تیس نشستیں جن میں سے آدھی نکال کر فرش پر سامان رکھا ہوا تھا۔ جہاز دھات کے رنگ کا تھا مگر دونوں پروں کے سرے سرخ رنگ کے تھے۔ گھنٹہ بھر تک وہ جہاز نو اور دس ہزار فٹ کی بلندی کے درمیان جھٹکے کھاتا رہا۔ نیچے دریائے سندھ کی ٹیڑھی لکیر بہہ رہی تھی اور عین اس کے اوپر یہ لکیر کا فقیر اڑ رہا تھا۔ دونوں جانب پہاڑیاں تھیں، پہلے اونچی نیچی اور پھر صرف اونچی اونچی۔ جہاز اس درہ میں اڑتا ہوا ایسے حصہ میں پہنچ گیا جہاں پہاڑیاں جہاز سے اسی قدر بلند تھیں جتنا جہاز دریا سے بلند تھا۔ اس علاقہ میں نہ جہاز کے اترنے کے لئے طول میسر تھا نہ مڑنے کے لئے عرض۔ اور آگے بڑھنے میں خطرہ بڑھتا جاتا تھا۔ ہر لحظہ درہ تنگ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہاڑوں کی کھردری دیواروں اور پروں کے سرخ نشان کے درمیان جہاز کی رفتار کے مطابق دونوں طرف صرف ایک سیکنڈ کا فاصلہ رہ گیا۔ ایک مسافر فرش پر اوندھا لیٹا ہوا تھا، دو تصویریں کھینچ رہے تھے، تین قے کر رہے تھے۔ باقیماندہ مسافر آنکھیں بند کیے کرسیوں پر ڈھیر تھے۔ جہاز ایک پر جھکا کر ترچھا ہوا تو کھڑکی سے اتنا نظر آیا کہ سامنے ایک پہاڑ راستہ روکے کھڑا ہے۔ جیسے کوئی تنگ گلی کے آخری سرے پر بلا نقشہ منظور کرائے گھر بنا کر اسے اندھا کنواں بنا دے۔ سامنے والی پہاڑی دیوار کے پاس پہنچ کر ہوائی جہاز تیزی سے اس طرف مڑ گیا جدھر جھکا ہوا تھا اور موڑ کاٹتے ہوئے یکدم مخالف سمت میں

جھک کر دوسرا موڑ کاٹنے لگا۔ اس پرخطر اور پُرپیچ راستہ سے گذرتے ہی وہ سیدھا ہو گیا۔ درے کا اندھیرا چھٹ گیا، سورج اوٹ سے باہر نکلا اور آنکھوں کو چندھیانے لگا۔ پہاڑ یکایک پیچھے ہٹ گئے۔ سامنے سکردو کی فراخ وادی دامن پھیلائے مسافروں کی خیریت کی دعا مانگ رہی تھی۔

سکردو دو دریاؤں کا سنگم ہے اور دو نیلوں کا مسکن۔ ایک سندھ دوسرا شیگر۔ ایک گورا دوسری سمت پڑا۔ دریائے سندھ سے ملاقات کے لئے سر راہ بہت سے موقع اور مقام مل جاتے ہیں مگر دریائے شیگر کی جھلک کے لئے چلہ کشی کی محنت اٹھانی پڑتی ہے۔ سنگم پر کھڑے ہوئے تو پتہ چلا کہ شیگر نام کی ایک وادی ہے، ایک بستی ہے، ایک دریا ہے اور ان تینوں سے مل کر اس نام کا ایک راجہ بن جاتا ہے۔ شیگر کے شفاف پانی میں پیر بھگوئے اور اس زمانہ کو یاد کیا جب ایسے دور دراز علاقہ میں پہنچنے والے سیاح کو دریافت کنندہ کا مرتبہ ملتا تھا اور دریا کا نام اس کے نام پر یا اس کی خواہش کے مطابق رکھ دیا جاتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ ملک کے کسی دور افتادہ علاقہ میں پہنچ کر مقامیوں سے اپنی ہمت کی داد مانگیں تو وہ بھی نہیں ملتی۔ کوئی بڑا بوڑھا ہنس کر کہے گا آپ کو یہاں آنے کی فرصت کیسے مل گئی۔ ہوائی جہاز اور جیپ کے ہوتے ہوئے ہمارے افسروں کو فرصت کی کمی کا رونا پڑا رہتا ہے۔ سال میں دو ایک صورتیں نظر آتی ہیں اور جو ایک بار بھولے بھٹکے آ گیا وہ دوسری بار آنے کا نام نہیں لیتا۔ ایک انگریز ہوا کرتے تھے کہ سو برس پہلے یہاں باقاعدگی سے سال میں دو بار آ نکلتے تھے۔ جتنا راستہ سواری پر طے ہوا کر لیا، جہاں ٹٹو رک گیا وہاں اتر کھڑے ہوئے اور باقی پینڈا پیدل طے کر لیا۔ انہیں واپسی کے لئے شتابی کرتے کسی نے کب دیکھا ہو گا۔ سہج سے رہتے تھے اور واپس جانے کے بجائے

ادھر سے کہیں دور نکل جاتے تھے۔ ایک صاحب آیا تھا اور اس جگہ کو اتنا پسند کیا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ بستی کے باہر ٹیلہ پر اس کی قبر بنی ہوئی ہے۔ مسافر نے ایسی ڈانٹ کئی بار کھائی ہے اور وہ کبھی بے مزہ نہیں ہوا۔ بات سچی ہے اور اتنی کڑوی بھی نہیں۔

سکردو کے کچے اور کھلے ہوائی اڈے میں ایک کوٹھڑی بنی تھی اور ایک شامیانہ تنا تھا۔ دونوں کے اندر باہر مسافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی جو واپسی کا راستہ نہ ملنے کی وجہ سے پریشان اور ناراض تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور دوپہر کو ہوا اتنی تند اور بدمزاج ہو جاتی کہ جہاز کو ہلکا رکھنے کے لئے سکردو سے اکثر خالی ہی واپس لے جاتے تھے۔ ہوائی اڈے میں خاک کے فرش پر چند ہی پھسکڑا مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کو دیکھ کر ڈھارس بندھی کہ اگر پرواز بند ہو جانے کی وجہ سے پورا گرمیوں کا موسم ہمراہ لائے ہوئے دو جوڑ ڈل میں یہاں گذارنا پڑا تو حلیہ ان سے پھر بھی ہر حال میں بہتر ہوگا۔ ہوائی اڈے سے شہر جاتے ہوئے باتیں صرف سفر کی دشواری کے بارے میں ہوتی رہیں۔ اس گفتگو کے دوران مسافر کو ایک ہم جماعت کی یاد آئی۔ وہ دو چار برس ساتھ رہا پھر اسکول چھوڑ کر چلا گیا اس سے قلمی دوستی کچھ عرصہ تک قائم رہی۔ اس کا ڈاک کا پتہ مسافر کو آج بھی یاد ہے ۳۰ الگن روڈ۔ اس کے بعد ایک شہر کا نام تھا جو سکردو کی طرح دو دریاؤں کا سنگم ہے۔ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ دوست پاکستان کی فضائیہ میں شامل ہے اور ایک بے حیثیت مشین کو سکردو اور گلگت کی پہاڑیوں میں چلایا کرتا ہے۔ آزادی سے پہلے رمزنا سٹیٹسمین کا جو آخری انگریز مدیر تھا وہ آزادی کے بعد اس علاقہ کی سیر کے لئے آیا۔ اس نے اپنی کتاب میں مسافر کے ہم جماعت کی مہارت اور بے خوفی کی تعریف لکھی ہے اور سفر کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے خطرات کا ذکر اسی طرح کیا ہے جیسے حادثہ سے۔ بچ

رہنے والے گواہ کیا کرتے ہیں۔ وہ ہواباز ان بڑے بڑے پہاڑوں میں اُڑتا رہا اور اُس کا بال بیکا نہ ہوا مگر ایک دن سلسلہ کوہ نمک کی ایک چھوٹی سی پہاڑی سے ٹکرا کر اس کا جہاز پاش پاش ہو گیا۔ اس کے ہمراہ ہوائی جہاز میں پاکستان سپیشل پولیس کے انسپکٹر جنرل تھے اور ان کے ہمراہ ملک کے پہلے وزیر اعظم کے قتل کی تفتیش کے کاغذات۔ ہر شے کان نمک میں داخل ہو گئی۔

سکردو سے جھیل کی طرف جاتے ہوئے گاڑیاں ایک جھنڈ سے گذریں۔ تھوڑے سے درخت تھے۔ کہنے کو باہم کھڑے تھے مگر اتنا فاصلہ چھوڑ کر جیسے ایک دوسرے سے ناراض ہوں۔ اس علاقہ میں اتنے چھدرے جھنڈ کو گھنا جنگل کہتے ہیں۔ سارے درخت ایک قسم کے تھے اور ان کے پتے سفیدی مائل سبز تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ عناب کا درخت ہے اور اس کے علاوہ یہاں قدم قدم پر ایسی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ جن کے سہارے طب یونانی ابھی تک بوڑھا نہیں ہوا۔ اگلے زمانہ کی کہانیوں میں ایک راجہ ہوا کرتا تھا جو ایک نہ ایک دن کہانی کو آگے بڑھانے کی خاطر بیمار ہو جاتا تھا۔ سیانے اس کی صحت کی بازیابی ہمیشہ ایسے درخت کے پھل سے وابستہ کر دیتے جسے حاصل کرنے کے لئے ناقابل عبور گھاٹیوں کو عبور کرنا پڑتا۔ جب بہت سی کہانیوں میں اسی مضمون اور موضوع کی تکرار ہوئی تو راجاؤں نے صحت کا گر پا لیا اور بنفس نفیس ان گھاٹیوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ گلگت اور سکردو میں ہر اس مقام پر جہاں شہریوں کی سوچ کا گذر بھی نہیں ہو سکتا وہاں ایک مقامی راجہ کا محل مل جاتا ہے۔ شاید ان عمارتوں کو محل کہنا بے محل ہو گا، انہیں زیادہ سے زیادہ حویلی کہہ سکتے ہیں۔ مسافر نے اس علاقہ میں راجاؤں کے بہت سے گھر دیکھے ہیں مگر وہ حویلیاں ایک چھوٹی سی رہائش گاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو انہی پہاڑوں کے دامن

میں جھیل کے کنارے بنی ہوئی ہے پرپیچ اور تنگ راہوں پر جیپ چلانے اور چند قدم پیدل چلنے کے بعد مسافر جھیل کے کنارے پہنچا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں ایک ہوائی جہاز کھڑا ہوگا، صحیح اور سالم، اصلی اور درست، لیکن اس سے سفر کے بجائے قیام کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ ہوائی جہاز ایک بار سکردو کی دریائی ریت پر اتر گیا۔ اڈے تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہاں سے پرواز کا کوئی امکان نہ تھا اور چند دنوں بعد دریا کا پانی چڑھنے والا تھا۔ محکمہ کے سامنے یہ ٹیڑھا سوال تھا کہ اس ہوائی جہاز کو مفت میں دریا برد ہو جانے دے یا مبلغ ایک سو روپیہ کی واحد بولی دینے والے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ خریدنے والے نے اپنی ہشیاری کی بنا پر اسے کوڑیوں کے مول خرید لیا۔ پھر اپنی طبع مشکل پسند کے سہارے اسے لب دریا سے جھیل کنارے کھینچ لایا۔ اور آخر الامر اپنی جدت پسندی کی بدولت جہاز کی نشستیں نکال کر اس کے اندر ایک گھر بلکہ گھروندا بسا لیا۔ ہوائی سفاری کا جہاز محو پرواز ہے اور اس میں بیٹھا ہوا مسافر ایک رہائشی اور نمائشی جہاز کی یاد میں محو ہے۔

ہوائی سفاری کے جہاز نے رخ تبدیل کیا، مسافر نے نقشہ پلٹا، ہمراہیوں نے پہلو بدلے، تبصرہ کرنے والے کا لہجہ بدل گیا۔ تبصرہ ابھی تک معلوماتی اور جغرافیائی تھا۔ محل وقوع، عرض البلد، طول البلد، طبقات الارض کی ساخت اور پہاڑوں کی عمریں۔ گاہ بگاہ ایک آدھ جملہ نظارے کے بارے میں بھی ہو جاتا۔ مگر اب بات ہی کچھ اور ہے۔ رواں تبصرہ کی روانی بڑھ گئی ہے، اعداد کی جگہ الفاظ نے لے لی ہے، بے تعلق لہجہ میں اپنائیت آ گئی ہے، مبصر کی کھڑی فوجی بولی اب پنشن یافتہ لشکری کی نرم بول چال میں بدل گئی ہے۔ اشتیاق کا یہ عالم ہے کہ آواز کانپ رہی ہے اور جذبات کا یہ عالم ہے کہ آواز گلے کے بجائے

دل سے نکل رہی ہے۔ اعلان ہوا کہ چند لمحوں میں آپ لوگ حیران کن عجائبات عالم دیکھنے والے ہیں۔ یہ عجائبات دو طرح کے ہیں، گلیشئرز اور کنکارڈیا یعنی برف کے انبار اور انبوہِ کہساراں۔

ہنزہ اور نا گر سے ذرا آگے ہسپر نام کی بستی ہے بستی سے لیکر اس نام کی چوٹی تک ساٹھ کیلو میٹر کا فاصلہ ہے۔ اس راستہ کی ساری مسافت کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک برف کے ایک تودہ نے پاٹ دیا ہے۔ یہ دنیا کے طویل ترین اور عظیم ترین برفانی تودوں میں شامل ہے۔ میلوں لمبا اور ٹنوں وزنی ہونے کے باوجود یہ تودہ حرکت اور سفر میں ہے۔ پہاڑوں پر پڑی ہوئی برف اور اس برف کی چٹان میں فرق ہے، وہ منجمد اور جامد یہ مسافر اور متحرک۔ اس مسافر کی رفتار اتنی سست ہے کہ دیکھنے میں بالکل بے حس لگتا ہے۔ لیکن یہ رواں بلکہ دواں ہے اور ہر سال دس بارہ انچ کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔ چلنے کا انداز یہ ہے کہ سر کے بل چلتا اور پیٹ کے بل رینگتا ہے۔ برف کی جو سطح ہوائی جہاز سے نظر آرہی ہے اس پر دھوپ سے زیادہ سردی پڑیگی اور یہ پگھلنے کے بجائے تازہ گرنے والی برف کے نیچے دب جائے گی۔ اس کا سب سے گرم حصہ تہہ میں واقع ہے جہاں سے پانی رس کر بہہ نکلتا ہے اور زمین کے تر اور ڈھلوان ہونے کی وجہ سے تودے کو پھسلنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔

ایک روز مسافر بتورہ گلیشئر کے ایک سرے کو ہاتھ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ چونسٹھ کیلو میٹر لمبی برف کی چٹان کے پائیں کھڑے ہو کر حساب لگایا کہ اگر دوسرے طبیعاتی عمل اسے راستہ ہی میں نہ روک لیں تو یہ اندازاً سات لاکھ سال میں کراچی پہنچ جائے گی۔ اس سفر کی مدت بہت طویل ہے۔ اتنی طوالت کے بکھیڑے میں وہ لوگ کیسے

پڑ سکتے ہیں جو زلف کے سر ہونے تک بھی نہیں جیتے۔ کیوں نہ کوئی ایسا حساب لگایا جائے جو انسانی زندگی کی میزان کے مطابق ہو۔ اس مرتبہ مسافر نے یہ سوال حل کرنا شروع کیا کہ وہ برف جو سطح پر نظر آ رہی ہے اسے تودہ کی تہ تک پہنچنے کے عمل اور پگھل کر دریائے سندھ کے راستہ کراچی کے ساحل تک سفر میں کتنے سال لگیں گے۔ جواب صدیوں میں نکلا۔ بڑا اطمینان ہوا کہ یہ جواب پہلے سوال کے جواب کے مقابلہ میں مدت قریب کہلانے کا مستحق ہے۔ کنڈلی دار تودہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ کبھی حساب کا کبھی جغرافیہ کا، کبھی طبیعات کا کبھی مابعد الطبیعات کا۔ ایک بار مسافر کے ہمراہ آبپاشی کے ایک مہندس اس پہاڑی علاقہ میں گھوم رہے تھے۔ ان کو یہ سوال ستا رہا تھا کہ اگر کوہ قراقرم کے سلسلہ کی ساری برف اور سارے برف کے تودوں کو جو پہاڑ کے سینے سے ضدی اور ریچھ کے بچوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں نچوڑیں تو سندھ طاس کے کھیتوں کے لئے کتنے ایکڑ فٹ پانی دستیاب ہوگا یہ راز جو پہاڑ کے سینے میں دفن تھا ایک پہاڑے کی مدد سے نکلا۔ وہ پہاڑہ صرف کمپیوٹر کو یاد تھا۔ جواب میں ایک عدد تھا اور لاتعداد صفر۔ اس ہندسہ کو الفاظ میں تبدیل کیا تو صورت یہ بنی کہ اگر سارا برفانی ذخیرہ آب یکا یک سیال پانی بن جائے تو ادھر پنجاب کے پانچوں دریا بے کنار ہو کر دریائے سندھ سے ہمکنار ہو جائیں گے اور ادھر دریائے سندھ اور بحر عرب میں من و تو کا جو فرق ہے وہ مٹ جائے گا۔ قدرت برف جمانے اور برف پگھلانے میں قطرہ قطرہ کا حساب رکھتی ہے۔ حساب میں چند قطرے یا جواب میں چند صفر ادھر سے ادھر ہو جائیں تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے۔ نوح کا طوفان قطرہ لایا تھا صفر قیامت ڈھائیں گے۔ وہ دنیا جو چھ دن میں بنی تھی اس کے بگڑنے کے لئے صرف ایک گھڑی کافی ہوگی۔ صور پھونکنے سے عناصر کی ترتیب

اور توازن میں فرق آجائے گا کسی ایک عنصر کا ذرا سا حصہ بڑھا یا گھٹا دیا جائے گا۔ باقی عمل یک بہ یک اور خود بخود پورا ہو جائے گا۔ پہاڑ جو میخوں کی طرح گڑے ہیں رُوئی کے گالوں کی طرح دھنکے جائیں گے اور اپنی جگہ چھوڑ کر چلنے لگیں گے۔ اس روز ان کی رفتار اتنی سست نہ ہوگی کہ مسافر بتورہ کے نیچے کھڑا ہو کر آفرنیش اور قیامت پر غور کر سکے۔

چند سال ہوتے ایک قیامت صغریٰ بتورہ گلیشیر نے اٹھائی تھی۔

اس کا ایک چھوٹا سا حصہ جسم سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوا اور بے لگام ہو کر نشیب کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کی ٹاپوں کی آواز میلوں دور پہاڑوں اور وادیوں میں گونجنے لگی۔ اس کی راہ میں آنے والی پہاڑیاں جو اس کا زور اور بوجھ برداشت کرنے سے قاصر تھیں دو چار دنا چار اس کے ہمراہ ہولیں۔ یہ سارا ملبہ وادی کے نشیب میں جا کر ٹھہرا۔ اس کے نیچے خنجراب کا دریا، ایک بڑا پل اور شاہراہ ریشم کے چند میل دب کر رہ گئے۔ اب اس مقام پر فیری چلتی ہے۔ ششکٹ پر رک کر مسافر نے لائف جیکٹ پہنی اور اس فیری پر سوار ہو گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر مسافر نے اس بلندی کی طرف دیکھا جہاں سے برف کا پہاڑ گرا تھا۔ وہاں سے لیکر دریا تک اس نے پہاڑیوں کو ہموار کیا، ان پر ہل چلایا اور ساتھ ہی سہاگہ پھیر دیا۔ اس سیل یخ نے اپنے لئے جو شاہراہ تعمیر کی وہ شاہراہ ریشم سے زیادہ کشادہ ہے اور اس سے زیادہ دشوار گذار علاقہ سے گذرتی ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک دہائی صرف ہوئی اور یہ چشم زدن میں عدم سے وجود میں آگئی۔ جس دم یہ برف کی چٹان ٹوٹی ہوگی یہ پہاڑیاں مسمار ہوئی ہونگیں اور یہ سیل بے پناہ حرکت میں ہوگا اس وقت اس کی راہ میں اگر کوئی آدمی ہوتا تو کیا کرتا۔ اس کا جواب مسافر نے سعدی کی گلستاں سے مانگا۔ لکھا تھا کہ جب چٹانیں گر رہی ہوں اور ان کی راہ میں بیٹھا ہوا درویش اٹھ کھڑا ہو تو وہ عارف نہیں۔

مسافر نے روس میں جمے ہوئے سمندر کا کنارہ دیکھا ہے، جرمنی میں جمے ہوئے دریا پر موٹر سائکل چلتے ہوئے دیکھی ہے، چین میں جمی ہوئی جھیل پر فٹ بال کا میچ دیکھا ہے۔ یہ سب برف کے ہموار میدانوں کی صورت تھے۔ گلیشیر کی سطح ناہموار ہے۔ اس میں دراڑیں پڑی ہوئی ہیں اور لکیریں بنی ہوئی ہیں۔ جیسے یہ منجمد پانی کا پانی پت ہے اور تینوں لڑائیاں ابھی ایک ساتھ ختم ہوئی ہیں۔ پرواز ذرا نیچے آئی تو یہ تریڑیں ٹینکوں کے آہنی زنجیری پہیوں کے نشانات میں تبدیل ہوگئیں۔ گلیشیر ایسے لگا جیسے جنگ بندی کے بعد چونڈہ کے کھیت لگتے تھے۔ جہاز اونچا ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ درزیں مدھم ہوتے ہوتے دھوپ اور سایہ سے پر ہوگئیں۔ گلیشئر کی سطح ہموار مگر چتکبری نظر آنے لگی۔ اس بلندی سے سارے گلیشئر پر نظر ڈالی۔ برف کا ایک اندھا اژدھا ہے جو پہاڑوں میں پھنسا ہوا ہے جگہ تنگ ہے اس لئے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ موسم اتنا سرد ہے کہ بس کھال سکیڑ کر یونہی پڑا گرمیوں کا انتظار کر رہا ہے۔ مثنوی مولانائے روم میں حکایت ہے کہ ایک شخص سردی میں ٹھٹھرے ہوئے اژدھے کو مردہ سمجھ کر جنگل سے اپنے گھر لے آیا۔ گرمیاں آئیں تو اژدھا اس کو نگل گیا۔ وہ اژدھا دراصل نفسِ انسانی تھا۔ برفانی تودے بھی مولانا کے تمثیلی اژدھے سے ملتے جلتے ہیں۔ ہر انسان کے دل میں وہ ہزاروں خواہشیں جن پر دم نکلتا ہے منجمد ہو کر ایک برفانی تودے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اقتدار کی گرمی ملے یا شباب کی حرارت یہ تودے پگھل کر تیزی سے نشیب کی طرف جاتے ہیں۔ جو کچھ ان کی راہ میں آتا ہے سب خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔ اقتدار ہو کہ اقدار، اسلاف کی شہرت ہو کہ سادات کی عزت بعض برفانی تودے اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ جب وہ ٹوٹیں تو بہت کچھ ٹوٹ جاتا ہے آئین اور اتحاد، حکومت اور ملک۔

ہوائی جہاز بلند ہوتا جا رہا ہے۔ ہسپر کا گلیشیئر سکڑتا جا رہا ہے۔ پہاڑی سلسلہ کے کٹے پھٹے حصہ میں جمی ہوئی برف نظر آ رہی ہے۔ گلیشیئر اب ایک ہزار پا کی طرح نظر آ رہا ہے۔ اس کے جسم سے ہزاروں نوکیلے پیر نکل کر پہاڑ کے ہر شگاف، ہر درے اور وادی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ جب یہ سارے پاؤں بہ یک وقت اٹھائے گا تو قیامت کے آثار سب کو نظر آنے لگیں گے۔ ہوائی جہاز اور بلند ہوتا جا رہا ہے۔ نظر اب پہاڑ کے دونوں جانب کام کر رہی ہے۔ تصویر کے دونوں رخ نظر آ رہے ہیں۔ اس طرف پہاڑ کے کندھے پر ہسپر گلیشیئر سر رکھے گہری نیند سو رہا ہے۔ اس طرف دوسرے کاندھے پر بیافو گلیشیئر کا سر یوں دھرا ہے جیسے جاگ رہا ہو۔ ماں پہاڑ ہوتی ہے۔ یہ پہاڑ ماں ہے۔ دونوں برفانی تودے اس کے جڑواں بچے ہیں۔ ہوائی جہاز اب چکر لگا رہا ہے۔ یہ بالتورہ ہے اور وہ پاکستان کا سب سے بڑا گلیشیئر سیاچن۔ ایک چکر مکمل ہوا اور تصویر بھی مکمل ہو گئی۔ سلسلہ کوہ قراقرم کے گلے میں برف کا بڑا سا ہار پڑا ہے جس کے وسطی جھکاؤ میں چار چمکدار موتی جڑے ہوئے ہیں۔ ہسپر، بیافو، بالتورہ اور سیاچن۔ دوپہر کی دھوپ ہر ایک موتی پر پڑ رہی ہے

ع اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن۔

جہاز اب سلسلہ قراقرم کے اس حصے پر پرواز کر رہا ہے جہاں دنیا کی چند بلند ترین چوٹیاں اور چند طویل ترین گلیشیئر واقع ہیں۔ مسافر برف کے ان لمبے لمبے تودوں کی سیر میں ایسا کھویا رہا کہ پہاڑ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ یوں بھی جب سے یہ پرواز شروع ہوئی تھی وہ پہاڑیوں اور پہاڑوں کو مسلسل ٹکٹکی جما کر دیکھتا رہا تھا۔ نظر تھک گئی ہو گی۔ اس نے لمحہ بھر کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ چشم خیال کے سامنے پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے کوہک، چھوٹے بڑے کہسار اور بڑے بڑے کوہ و جبل۔ سارے

پہاڑ گرد و پیش سے اونچے ہیں، مضبوط میخوں کی طرح گڑے ہیں۔ جسم بھاری ہے جو ہلکا ہوتا
ہوا ایک چوٹی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ ہر پہاڑ نے کھردرا اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہنا ہوا ہے۔
دامن لمبا ہے جو اس کے پاؤں میں الجھ جاتا ہے۔ ہر سلسلہ کوہ میں پہاڑ قطار اندر قطار
ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوتے ہیں۔ بس ابھی پاؤں اٹھا چاہتا ہے اور
پھر یہ سارے پہاڑ ایک نئی زرت دکھائیں گے۔ سب پہاڑ یکساں بھی ہیں اور ہر پہاڑ یکتا
بھی ہے یکسانیت کے باوجود کسی ایک پہاڑ کی شکل دوسرے پہاڑ سے نہیں ملتی۔ اصل
ایک مگر صورت جدا، ساخت ایک مگر سانچہ مختلف۔ تسمانیہ کا کوہ ولنگٹن، نیوساؤتھ ویلز
کا کوہ کوزی آسکو، جنوبی جاوا کا دہکتا ہوا اور جنوبی اٹلی کا بجھا ہوا آتش فشاں، یورپی اور
آسٹریلوی ایلپس، چراپونجی کی بارش میں بھیگی ہوئی چوٹی اور بادلوں میں چھپا رہنے والا
نانگا پربت، یونانی دیوتاؤں کا مسکن اولمپیا اور جاپان کا اوتار فیوجی یاما، ارارت اور
احد، صفا اور مروہ یہ سب ان ان گنت پہاڑوں میں شامل ہیں جنہیں مسافر نے دور و
نزدیک سے دیکھا ہے۔ یہ تو مشہور اور منفرد ٹھہرے مگر اسے پانچوں براعظموں کے سفر کے
دوران کبھی ایک پہاڑ یا اس کا ذرا سا حصہ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو ہو بہو کسی دوسرے پہاڑ
سے ملتا ہو۔ قدرت کے پاس اتنے سانچے کہاں سے آئے کہ جو شے بھی ان میں ڈھالی
صرف ایک بار ڈھالی خواہ وہ پہاڑ ہو یا انسان، صورت شکل ہو یا انگوٹھے کا نشان۔

مسافر نے آنکھیں کھولیں اور ہوائی جہاز کے دریچہ سے باہر جھانکا۔ سامنے
ایک بلند برفانی سطح مرتفع کے طشت میں تین بلند پہاڑ ایک قطار میں رکھے ہوئے ہیں۔
پہلے دو بہت بڑے مگر ایک برابر، تیسرا اس قطار میں سب سے آگے اور سب سے بڑا،
اتنا بڑا کہ پہلی نظر میں اعتبار نہ آیا تو مسافر کو عین الیقین کے لئے آنکھیں جھپکنی پڑیں۔

روئے زمین پر صرف ایک چوٹی سرفرازی میں اس کی حریف اور حسن قامت میں اس کی رقیب ہے۔ باقی تمام بلندیاں اس کے سامنے پست ہیں اور ان کی ہیبت اس کے سامنے ہیچ ہے۔ ایورسٹ کے علاوہ دنیا بھر میں زمین کی سطح کہیں بھی اتنی اونچی نہیں لہذا جہاز بھی اونچا ہو گیا اور مبصر کی آواز بھی اونچی ہو گئی۔ مسافروں میں ہلچل مچ گئی۔ تصویروں والے زیروزبر ہونے لگے۔ خبروں والے بے خبر نظر آنے لگے۔ جہاز کے باہر ایک نقطہ اوج تھا اور جہاز کے اندر ایک نقطہ ہیجان۔

بلند گو پر مبصر کی آواز گونجی' مجھے اس منظر کے بیان کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔

اس جہاز میں دانشور، ہنرور اور ہفت زبان موجود ہیں' اگر کسی کو یارا ہے تو وہ تبصرے کے لئے سامنے آئے۔ یہ اعتراف بھی تھا اور صلائے عام بھی۔ لیکن پہاڑوں سے کون ٹکر لیتا۔ سب چپ ہو رہے۔ مبصر نے دوبارا صدا لگائی اور جہاز میں خاموشی بڑھ گئی۔ اس مرتبہ اس نے کچھ لوگوں کے نام بھی لئے۔ قہوہ خانوں کے طرار' ادبی محفلوں کے بیباک، مشاعرے لوٹنے والے اور کبھی خاموش نہ ہونے والے۔ ایک شخص کے بارے میں کہا کہ میں نے انہیں تبصرہ میں شامل ہونے کی دعوت سفر کے آغاز میں دی تھی مگر وہ تبصرہ کرنے پر سفرنامہ لکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس اعلان سے اس شخص کی بے زبانی کی لاج رہ گئی ورنہ سر کوہ بھرم کھل جاتا۔ مسافر نے کے۔ ٹو کی چوٹی کو دیکھا اور سوچا' جہاں مناظر خود ہم کلام ہوں وہاں تبصرہ کی حاجت نہیں رہتی۔ ضرورت اس گوش ہوش کی ہے جو مناظر کی زبان سمجھتا ہو اور اس چشم بینا کی جو برف پر لکھی ہوئی تحریر کو پڑھ سکتی ہو۔ ہم نشیں نے ہولے سے کان میں کہا، کس سوچ میں پڑے ہو۔ وہ دیکھو سامنے برف کی چوٹی پر زبور کے اشعار درج ہیں۔ ایک دل نشیں لہجہ میں اس نے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا۔

وہ اپنا حکم زمین پر بھیجتا ہے
اس کا کلام تیز رو ہے
وہ برف کو اون کی مانند گراتا ہے
وہ پالے کو راکھ کی مانند بکھیرتا ہے
وہ یخ کو لقموں کی مانند پھینکتا ہے
اس کی ٹھنڈ کون سہہ سکتا ہے

آخری دو مصرعے پہاڑ کی برفانی ڈھلوان پر لکھے ہوئے ہیں۔

وہ اپنا کلام نازل کرکے ان کو پگھلا دیتا ہے
وہ (حکم اور) ہوا چلاتا ہے، پانی بہنے لگتا ہے

ہوائی جہاز دیر سے انہوں کہساراں پر اڑ رہا ہے۔ کبھی گھڑی کی سوئیوں کے رخ چکر لگاتا ہے اور کبھی ان کے مخالف سمت۔ کبھی ایک پر جھکا کر ترچھا اڑتا ہے کبھی دوسرا گاہے سیدھا اڑتا ہے اور گاہے پرواز اریب ہو جاتی ہے۔ ہوا باز چاہتا ہے کہ دیکھنے والے جی بھر کر اس بام عالم کا نظارہ کر لیں۔ مگر دیکھنے والوں کا جی کہیں ایسے نوع بنوع نظاروں سے بھرا کرتا ہے۔ وہ تو اور حریص ہو جاتا ہے۔ کے ٹو کے جس رخ پر سایہ ہے وہ چاندی کا پہاڑ ہے اور جس رخ پر دھوپ پڑ رہی ہے وہ پہاڑ نہیں سورج کا ٹکڑا ہے جو یہاں آن گرا ہے۔ عجیب منظر ہے۔ علاقہ ناقابل تسخیر، راستہ ناموجود وادی غیر ذی زرع پہاڑ کنج خلوت میں سر بجیب۔ عجیب و غریب منظر ہے کہ خیال کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ یہاں ابد سے خاموشی طاری ہے۔ دور دور تک برف کے اہرام بنے ہوئے ہیں۔ ان میں خاموشی اور تنہائی کی حنوط شدہ لاشیں محفوظ ہیں۔ ہوائی جہاز کے ہر نئے چکر کے ساتھ ایک نیا منظر

سامنے آجاتا ہے۔ ایک چکر اور مکمل ہوا۔ منظر میں جان پڑگئی۔ اس میں زندگی اور حرکت پیدا ہو گئی۔ اب یہ برف پوش پہاڑوں کا سلسلہ نہیں رہا بلکہ سفید اونٹوں کا ایک کارواں ہے جو سفر میں ہے۔ برفانی کوہان حرکت میں ہیں گلیشیئر پر ان کے پاؤں کے تازہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ پھر ایک سیل تند آیا جیسے ریگزار میں آندھی اور کارواں اس میں گم ہو گیا۔ سیل تھما تو نیا نقشہ جما۔ کوئی دھیمی لے میں مثنوی روم پڑھ رہا ہے۔ سفید دستار فضیلت باندھے اور سفید چوغے پہنے درویشوں کا حلقہ دھیرے دھیرے دھمال ڈال رہا ہے۔ یکایک دھمال رک گئی۔ درویش اپنے پیروں پہ کھڑے کھڑے ان پہاڑوں میں تبدیل ہو گئے جنہیں قرآن نے زمین کی میخیں کہا ہے۔ ایک درویش جس کی قامت سب سے بلند تھی آگے بڑھا اور پاکستان کے خیمہ کی طنابیں ان میخوں سے باندھ دیں۔

اعلان ہوا کہ اب ہوائی جہاز واپسی کے سفر پر روانہ ہوا چاہتا ہے مسافر کو فکر لاحق ہوئی کہ وہ یہاں سے خالی ہاتھ واپس نہ جائے۔ وہ فتح کیسی جو خراج سے عاری ہو وہ سفر کیسا جو سوغات سے خالی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اونچے اونچے پہاڑ یاسمین کی سفید کلیوں کے گلدستہ میں تبدیل ہو گئے۔ مسافر نے ہاتھ بڑھایا اور ایک کلی کو توڑ کر اپنے سفر نامہ میں سجا لیا۔

ہوائی جہاز نے رخ پھیرا مسافر نے مڑ کر انبوہ کہساراں پر الوداعی نظر ڈالی۔ بلند تر جہاز کا سایہ اس سے جدا ہو کر بلند چوٹیوں سے ہمکنار ہو رہا ہے۔ جہاز کہیں ہے، سایہ کہیں اور زمین کی سطح پر رہیں تو جسم اور سایہ دونوں ایک نقطہ پر یکجان ہو جاتے ہیں۔ بلندیوں کی طرف پرواز کی تو سایہ پیچھے رہ گیا۔ کیا عجب کہ ذرا اور بلند ہو جائیں تو جسم بھی ساتھ نہ دے سکے۔ پھر جو باقی بچے اس کا جو جی چاہے نام رکھیں۔ وہم، گمان یا عکس۔ روح، جان یا نفس۔

(۹)

ہوائی جہاز برف کدہ قراقرم کا چکر لگا کر واپس اسلام آباد کی فضائی حدود میں داخل ہو چکا ہے اور اترنے کیلئے ترچھا ہو کر پوٹھوار کی پہاڑیوں پر ایک دائرہ بنا رہا ہے۔ خیال کی پرواز البتہ ابھی جاری ہے اور پس بینی کے نئے نئے دائرے بنانے میں مصروف ہے۔ کارِ جہاں دراز ہے لہٰذا خیال کے دائرے بیشمار اور پیچدار ہیں۔ سفر کا آغاز تربیلا کی پہاڑیوں سے ہوا تھا اور اب جہاز کہوٹہ کی پہاڑیوں پر پرواز کر رہا ہے۔ اس وقت مسافر کو معاشیات کا ایک دلندیزی پروفیسر یاد آیا تھا اور اس وقت معاشیات کا ایک علیگ پروفیسر یاد آرہا ہے جو ان پہاڑیوں میں واقع قصبہ کہوٹہ کے گاؤں مٹور کا رہنے والا تھا۔

طیارہ کے پہیے زمین سے آن لگے ہیں۔ ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور ذرا دور تک ربڑ کے ٹائر گھسٹ کر چلے اور پھر رواں ہو گئے۔ انجن کی ہیکل آوازیں یکدم اونچی ہونے کے بعد خاموش ہو گئیں جیسے تال پڑی اور سر ضبط ہو گیا۔ اسفالت کی پٹی پر جہاں ہوائی جہاز کے پہیوں نے زمین کو پہلی بار چھوا تھا وہاں ربڑ کی رگڑ سے جو کالی لکیریں بنی ہوئی تھیں ان میں دو لکیروں کا اضافہ ہو گیا۔ مسافر نے ان کی طرف دیکھا۔ یہ سطر کی لکیریں نظر آئیں۔ ان پر وہ مضمون کتابت شدہ ہے جس میں لکھنے والے نے ایک استاد کی یاد کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ عنوان ہے "پس انداز"۔

۷۹-۱۹۷۸ء

پس انداز

طویل اور کشادہ برآمدہ میں ایک بلند روغنی پیل پایہ سے ٹیک لگائے فرش پر اکڑوں بیٹھے سامان کی فہرست بناتے ہوئے تھکے ماندے سیکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ نے حیرت اور حسرت سے مغلوب ہو کر کہا، زندگی ہو تو ایسی ہو۔ ہمارا جینا بھی کوئی جینا ہے پیدا نہ ہوتے تو کسی کو خبر تک نہ ہوتی، پیدا ہوئے تو کونسا فرق پڑ گیا۔ دیوار کے ساتھ دور تک اوپر تلے سامان چنا ہوا تھا۔ کیبن ٹرنک، ساگوانی صندوق، کشمیری تخ دان، چمڑے کے بیگ اور لکڑی کے کھوکھے۔ بار سفر میں بوریا بھی تھا مگر اس میں نرم ترکستانی غالیچے نیم کے پتوں سمیت لپٹے ہوئے تھے۔ سامان کیا ہے گویا بھانمتی کا پٹارا یا عمرو کی زنبیل، اسے کھولا تو سوغات اور مصنوعات کی نمائش لگ گئی۔ ترشا ہوا شیشہ، ڈھلی ہوئی چاندی، زیبائشی مرقعے، آرائشی مجسمے، سیتل پاٹی پر بنی ہوئی جاپانی سینریاں، یورپی روغنی نقاشی، آبدار تلواریں، بدرنگ ڈھالیں، توڑے دار بندوقیں، مغرب کی پوستینیں اور مشرق کے قالین۔ چینی مٹی کے برتنوں میں ایک نیلگوں اور ٹھوس روسی ڈنر سیٹ کی کشتیاں اور ڈونگے اس جہازی قالب کے تھے کہ ان پر بادبان لگا دیں تو بحری بیڑا تیار ہو جائے۔ یہ سامان نہ جہیز ہے اور نہ خراج۔ یہ تو ملک الموت کا مال غنیمت ہے۔

رحیم بخش بوچہ کی نگرانی میں دو تین پیشکار کئی دن تک سامان کی فہرست بنانے میں لگے رہے۔ ایک وقت میں ایک ٹنگ کو لیتے اور اس میں سلیقہ سے تہ بہ تہ اشیا کو ایک ایک کر کے نکالتے، جوہری کی طرح پرکھتے اور تفصیل فہرست میں اور تحقیق تو سین میں درج کر لیتے۔ دستاویزات تعلیمی (اسنادو سرٹیفکیٹ ہا از کیمبرج) دستاویزات سرکاری (مشمولہ فرمان شاہی دستخطی جارج پنجم) تمغہ جات اعزازی (قلزئی) کتابچہ (دربارہ آداب زیب تنی تمغہ جات)۔ سامان میں ایک ریشمی خریطہ بھی تھا۔ اس نکاح نامہ پر خطبہ مسنونہ عربی میں چھپا ہوا، کوائف فارسی میں درج شدہ اور دستخط انگریزی میں ثبت تھے۔ نکاح کے گواہ اور وکیل بیشتر وائسرائے کی مجلس عاملہ کے رکن تھے یا اسی مرتبہ کے مشہور شہری۔ سامان میں ایک مٹیا رنگ تصویر بھی تھی۔ نو تعمیر نئی دلی کے ایک جدید بنگلہ کے بیل منڈھے پورچ کے سامنے زور پھرے مسطح سبزہ زار میں کرسی پر ڈاکٹر ایل کے حیدر بیٹھے ہیں۔ پاس ہی مسز سٹیفنی حیدر کھڑی ہیں۔ دونوں کے درمیان پانچ چھ برس کی ایک بچی ہے جس کا نام برلن کی ننھیال اور کہوٹہ کی ددھیال کی دوغلی روایات کے مطابق ڈوروتھی اگنس فاطمہ حیدر رہے۔

سامان کی فہرست اور فہرست کی نقلیں بنانے میں کوئی چار ہفتے لگے اور کئی دستہ کاغذ صرف ہوا۔ کہاں وہ دن کہ یہ سامان نئی دلی کے بنگلہ میں عمدہ اور خوشحالی اور علی گڑھ کی پھوس والی کوٹھی میں دردیشی اور بے رغبتی کا عینی گواہ تھا۔ کہاں یہ دن کہ ڈاکٹر حیدر کے انتقال کے برسوں بعد یہ سامان میری سرکاری رہائش گاہ کے برآمدہ میں لاتعلق اجنبی عملہ کے ہاتھوں میں فہرست مال منقولہ متروکہ متعلقہ ہو کر رہ گیا۔ سامان کا مالک پُرنظر تھا اور شاکر، سامان کی وارث بیوہ ہے اور بے نیاز۔ رہی ان دونوں کی بیٹی

تو اس نے بچپن کے چند سالوں کے بعد نہ یہ سامان دیکھا تھا اور نہ یہ برعظیم۔ لہذا یہ مال متاع سالہا سال تک لاہور میں کوپر روڈ پر اب جہاں رائٹرز گلڈ کا دفتر ہے اس سے ملحق رہائشی عمارت کے ایک کمرے میں بند پڑا رہا۔

مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ معاشیات کے صدر ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو جب میں نے پہلی بار غور سے دیکھا تو وہ بڑے بارعب نظر آئے۔ یہ شروع کے دنوں کی بات ہے اور اب اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ میں لڑکپن کی سرحد کے پار زمین پہ یاری کا مسافر تھا۔ جسم دبلا، نرخرہ بے قابو، آواز بے سری اور قد لانبا۔ لمبے ہونے کی رفتار یہ تھی کہ ہر تین چار ماہ کے بعد ٹخنے پائنچوں سے جھانکنے لگتے۔ ادھر ایک عمر رسیدہ، سنجیدہ اور جہاں دیدہ آدمی۔ ایک فربہ کم گو اور بھاری بھر کم شخصیت۔ یورپ میں پڑھا ہوا اور انگریز حکومت کا مانا ہوا ماہر معاشیات۔ ہیرس ٹویڈ کا چارخانہ کوٹ اور برجس نما پلس فور پہننے والا شخص جو عید کے روز شلوار قمیص اور مشہدی کلاہ و دستار میں نظر آتا۔ ایک سہ پہر گالف سٹک لے کر بال اٹھانے والے پیش خدمتی کے ساتھ پیدل چلنے والا اور دوسری سہ پہر جرمن میم کے ہمراہ گھڑسواری کرنے والا صاحب۔ بہت سے لوگ جنہیں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا وہ انہیں نرا صاحب سمجھتے تھے۔

انگریز کے زوال کے دنوں میں صاحب کا لفظ اپنی سابقہ عزت کھو کر صرف ایک پھبتی بن گیا تھا۔ وہ لوگ جن کو صاحب کی شکل نظر آتے ہی سانپ سونگھ جاتا تھا ان کی اولاد صاحبوں کو دیکھ کر زیر لب تبسم فرمانے لگی۔ رائج الوقت اصطلاح کے مطابق جو دیسی انگریز پرست تھا وہ ٹوڈی، جو انگریز دوست تھا وہ صاحب، جو پانی کی

جگہ کاغذ استعمال کرے وہ نرا صاحب۔ صاحب لوگ کی ایک پہچان یہ بھی تھی کہ وہ کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک اور عمارت کے درمیان پان کی شکل کا ہرا بھرا سبزہ زار ہوتا تھا جس کے ایک طرف سے ادھ کٹی بجری کی سڑک پورچ میں داخل ہوتی اور دوسری طرف سے بے نیل مرام واپس چلی جاتی۔ کوٹھی عام طور پر گہری خاموشی میں ڈوبی ہوتی۔ عمارت یوں لگتی جیسے ایک مُہرِ سکوت جو کسی نے اس قطعہ زمین پر ثبت کردی ہو۔ اس خاموشی کو مقررہ اوقات پر انگریزی اردو کے مخلوط جملے اور مشرق کی اینٹ اور مغرب کے گارے سے بنے ہوئے بچے توڑا کرتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی کوٹھی میں خاموشی قدرے زیادہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب اور سٹیفنی دونوں خاموش طبع اور کم آمیز تھے۔ جملہ اولاد ایک بچی پر مشتمل تھی جسے پانچ سال کی عمر میں انہوں نے شملہ بھیج دیا اور دس سال کی عمر میں انگلستان۔ شملہ کانونٹ میں داخل ہونے کے بعد اس بچی کا تعلق ہر اس چیز سے ٹوٹ گیا جو اسے باپ کی میراث میں مل سکتی۔ زبان، ملک، روایات اور مذہب۔ البتہ شہسواری میں اس نے جلد ہی اتنا نام پیدا کیا کہ ایک ہاتھ میں کپ لئے اور دوسرے سے لگام تھامے اس کی تصویر ایک انگریزی روزنامہ میں چھپی۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ سرپٹ لندن پہنچ گیا۔ ادھر ڈاکٹر حیدر کی کوٹھی میں خاموشی اور گہری ہوگئی۔ یہاں تک کہ نئے طلبا انہیں بے اولاد شمار کرتے اور ان کی الگ تھلگ اور بے تعلق زندگی کا سرا اس محرومی سے جوڑ دیتے۔ اگنیس کو انگلستان بھیجتے وقت والدین کا خیال تھا کہ وہ اسے ہر سال بلایا کریں گے یا اس کے پاس جایا کریں گے۔ حالات پر کب کسی نے اپنی مرضی کے مطابق قابو پایا ہے۔ ولایت بھیجنے کے بعد وہ کوسوں دور بچی سے سالوں دور ہوتے چلے گئے۔ دوسری عالمی جنگ ان

کے درمیان حائل ہو گئی۔

برطانوی ہند کی حکومت نے شاہی زرعی کمیشن کے لیے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی خدمات علی گڑھ سے مستعار لیں۔ یہ غالباً ۱۹۲۶ء کی بات ہے۔ خیال تھا کہ وہ سال دو سال میں واپس آجائیں گے۔ حالات کروٹ بدلتے رہے، واقعات رونما ہوتے رہے، واپسی کا خیال سال بہ سال باطل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ انہیں گیارہ برس تک واپس لوٹنے کی فرصت نہ مل سکی۔ ایک کمیشن کے بعد دوسرا اور اس کے بعد تیسرا اور مابعد فیڈرل پبلک سروس کمیشن کی رکنیت یوں ملی جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ان دنوں برطانوی ہند میں سرکاری عہدہ کے ساتھ انعام و اکرام بہت ہوا کرتا تھا۔ عہدہ دار کا نصف رعب بلحاظ اختیارات ہوتا اور نصف بلحاظ مواجب۔ زمانہ سستا، تنخواہ وافر، خاندان مختصر، اخراجات محدود، بیگم رئیس مگر سادہ۔ ان حالات میں بچت لازم تھی جسے معاشیات کے استاد نے بیج سمجھ کر زرخیز زمین میں بودیا۔ فصل بہت اچھی ہوئی مگر برداشت کے وقت جاپانی فوجیں آگئیں اور بٹائی میں انہیں بھی حصہ دار بنانا پڑا۔

شاہی زرعی کمیشن کے انداز بڑے شاہانہ تھے۔ تھوڑا سا کتابی کام کرنے کے بعد اس کے اراکین ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گئے۔ وہ موقع پر زراعت کا جائزہ لینا چاہتے تھے قصہ زمین برسرزمین۔ ان کے سفر کے لئے ایک اسپیشل ٹرین چلائی گئی جس کے سفید رنگ کے ڈبے ایک کالے بھجنگ شور مچاتے پتھر کا کوئلہ پھانکتے دھواں چھوڑتے انجن سے اسی رشتہ میں منسلک تھے جو سفید فام برطانیہ اور سیاہ فام برطانوی ہند کے درمیان قائم تھا۔ حاکم و محکوم میں یہ سفیدی اور سیاہی کا فرق پوست کے رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ سورج کی گردش کی بنا پر تھا۔ ان دنوں سورج نہ امپیریل برطانیہ پر غروب ہوتا اور نہ کولونیل ہند پر طلوع ہوتا۔

وہاں خوشحالی کا دن چڑھا ہوا تھا اور یہاں قحط کی رات تھی۔ شاہی زرعی کمیشن کے ذمہ یہ کام لگا کہ وہ قحط کو دور کرنے کے لئے تجاویز پیش کرے۔ ان تجاویز کی تلاش میں کمیشن کا ہر ممبر اپنے آٹھ پہیوں اور چار کمروں والے سیلون میں بیٹھا برعظیم کی وسعتوں میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ریل جگہ جگہ ٹھہرتی اور ممبر سج سج سے وہاں کی زراعت کے مسائل اور وسائل کا جائزہ لیتے۔ ریل آخری اسٹیشن پر جا کر رکی تو راہ آہن کے خانہ بدوشوں کو سفر میں ایک سال بیت چکا تھا۔ اس مرحلہ پر کمیشن کے ممبر دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک بلادِ مغرب میں زرعی ترقی کے مشاہدہ کے لئے بھیجا گیا اور دوسرے کو ارضِ مشرق میں زرعی پسماندگی کے مطالعہ کا کام تفویض ہوا۔ اس سفر میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کا منہ طرف قبلہ شریف کے تھا۔

عارضی کمیشن ختم ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک مستقل کمیشن کی میعادی رکنیت پر فائز ہوئے اور اسپیشل ریل گاڑی کا سفید ڈبہ چھوڑ کر ایک خوشنما بنگلہ میں منتقل ہو گئے۔ یہ عالمی کساد بازاری اور بیروزگاری کا زمانہ تھا۔ اس دورِ بے اماں کا دل خراش ذکر تاریخ اور معاشیات کی کتابوں کے علاوہ اخباروں اور شعروں میں بھی محفوظ ہے۔ اخبارات میں گاہے بی۔ اے پاس بے روزگار کی خودکشی یا بوٹ پالش کرنے کی خبر شائع ہوتی۔ مشاعروں میں محروم نوجوانوں کی ترجمانی ٹیپ کے اس مصرع سے ہوتی ع اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں۔ بیروزگاری کے ان دنوں میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر برطانوی ہند کی مرکزی پبلک سروس کمیشن کے واحد مسلمان ممبر تھے۔ دوسری اعلیٰ ملازمتوں کے علاوہ وہ نوآبادیاتی دور میں خدمت گزاری کی معراج یعنی آئی۔ سی۔ ایس کے امیدواروں کے انٹرویو لیا کرتے تھے۔ چونکہ رو رعایت کے قائل نہ تھے اور سفارش سے نفرت کرتے

لہٰذا وہ اس عہدہ کے لئے نہایت موزوں تھے۔ تاہم عہدہ ان کے لئے موزوں ثابت نہ ہوا۔ بہت سے بے ہنر سفارشی اور بارسوخ سازشی ناامید ہو کر ناراض ہو گئے۔ لوگوں نے طرح طرح کی باتیں ان سے منسوب کر دیں۔ ایک افواہ کے مطابق کمیشن نے مسلمان ممبر کی موجودگی میں امیدواروں کو عید کے دن انٹرویو کے لئے بلایا تھا۔ ایک روایت کے مطابق خواجہ حسن نظامی نے منادی کے روزنامچہ میں ان کے پرزے اڑا دیئے۔ کہنے والوں کا کہنا تھا کہ تعلیم کے لئے جس طالب علم کو انگلستان بھیجا وہ پوٹھوار کا کریم حیدر، لودھی تھا مگر وہاں سے جو صاحب بہادر واپس آئے وہ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر (لودھی کریم حیدر) کہلواتے ہیں نئی دلی سے جو خبریں وقتاً فوقتاً علی گڑھ پہنچتیں انہیں قیاس آرائیوں کی بنیاد بنا کر لوگوں نے اندازہ لگایا کہ رکنیت کی میعاد ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ یعنی سر کا خطاب ملے گا اور وہ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین یا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن بن جائیں گے۔ دس سال پہلے قائم ہونے والے شاہی زرعی کمیشن کے سکاچ صدر کا تقرر برطانوی ہند کے وائسرائے کی حیثیت سے ہو چکا تھا یا اس کی نامزدگی کی خبر آ چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے لارڈ لنلتھگو سے ذاتی تعلقات اسی ریل گاڑی میں استوار ہو چکے تھے جس میں وہ سال بھر تک باہم شریک سفر رہے تھے تاہم ایک دن ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر خاموشی اور خوشی سے رئیس شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی کی حیثیت سے علی گڑھ واپس آ گئے۔ ظرف اتنا بڑا کہ نئی دلی اس میں سما گئی تو چھلکا نہیں اور علی گڑھ کی مدرسی ملی تو بھی شکر سے لبریز رہا۔ واپسی کے بعد ایک سوال فطری طور پر پیدا ہوا۔ کیا ایک شخص ایسے عہدے پر فائز رہنے کے بعد جو ذمہ داریوں کے حساب سے گرانبار مشاہرہ کے اعتبار سے گراں قدر اور دائرہ کار کے لحاظ سے برعظیم کی وسعتوں پر پھیلے

ہوئے تھے چندہ سے چلنے والی جامعہ کے ایک شعبۂ تدریس کی مختصر کائنات پر قانع رہ سکتا ہے یا وہ احساس برتری اور یاد ماضی میں ایسا الجھ جائیگا کہ اس کی الجھن دوسروں کے لئے تفریح اور عبرت کا سامان پیدا کرے گی۔ یہ سوال ایک خدشہ تھا جسے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کے رویے نے پنپنے کا موقع ہی نہ دیا۔

مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر کو رہائش کے لئے ایک پھوس والا بنگلہ ملا۔ سامنے لان تھا، شمال میں شاگرد پیشہ اور باقی دو طرف جھاڑ جھنکار۔ بنگلہ اور شاگرد پیشہ (جو ان دنوں اچھی خاصی کالونی ہوا کرتا تھا) کے درمیان گھنے درختوں کے سایہ میں گھوڑوں کے لئے چوبی کٹھرے بنے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے فاصلہ پر ایک پکا اصطبل تھا۔ ایک مدت تک وہاں سواری کے دو تین جانور بندھے رہتے۔ گرمیوں میں جب بہت سے ساتھی پہاڑوں کا رخ کرتے ڈاکٹر ایل، کے، حیدر ہاتھ کا پنکھا جھلا کرتے اور کھدر کا موٹا کرتہ پہن لیتے کہ وہ پسینہ چوس لیتا ہے۔ جو لوگ پہاڑ پر نہ جاتے وہ گھر کو خس خانہ بنا لیتے۔ یہ اہتمام بھی ڈاکٹر صاحب کو پسند نہ تھا۔ البتہ اصطبل میں برف کی سلیں باقاعدگی سے لگائی جاتیں تاکہ بے زبان جانور کو تکلیف نہ ہو۔ سردیوں میں لوگوں نے دیکھا کہ اصطبل سے ذرا فاصلہ پر برگد تلے لکڑی کے دو چار گدے پڑے ہوتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر صبح سویرے کلہاڑی سے کر لکڑی پھاڑنے کی ورزش کیا کرتے۔ چھپٹیاں ملازموں کے حصہ میں آتیں تاکہ وہ آگ تاپ سکیں اور چولہا گرم کر سکیں۔ صاحب بہادر کے حصہ میں صرف وہ صحتمند خوشی آتی جو مسامات سے پسینہ کی صورت پھوٹتی ہے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ایک نیکدل اور سادہ لکڑ ہارے تھے۔

حیدر صاحب کے یہاں جو کھانا دونوں میاں بیوی کے لئے پکایا جاتا وہی

ان تمام ملازمین میں تقسیم ہوتا جو تنخواہ مع خوراک پر ملازم تھے۔ ان کا سفید ریش باتمیز خانساماں ہمیشہ دھوبی کے دھلے کلف لگے اجلے کپڑے پہنا کرتا۔ باورچی خانہ کا بیشتر کام اس کے نائب کے سپرد تھا۔ وہ ہنڈیا کو دم دیتا اور فارغ ہو کر بٹلر بن جاتا۔ گھر کی چابیاں بھی اسی کے پاس رہتیں۔ حساب بھی وہی رکھتا۔ دوسرے ملازمین پر بھی اسے اختیار حاصل تھا۔ عہد مغلیہ کے خان ساماں کی ایک گھریلو صورت۔ حیدر صاحب نوکر کو آواز دینے کے خلاف تھے۔ وہ خود وقت پر حاضر ہوتا یا اس وقت تک صاحب صبر سے کام لیتے اور انتظار کھینچتے۔ مسز سٹیفنی حیدر البتہ ملازم کو بلانے کے لئے آہستہ آہستہ دو بار پکارا کرتیں۔ خدمتگار، مسز حیدر جرمنی کے ایک رئیس گھرانہ کی بڑی شائستہ خاتون تھیں۔ حیا ان کے چہرے پر یوں چھائی رہتی جیسے وہ کوئی بات چھپا رہی ہوں اور وہ چھپتی نہ ہو۔ انہی دنوں علی گڑھ میں ایک نوجوان انگریز میم کا اضافہ ہوا۔ اس کے آتے ہی سرگوشیوں اور افواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ وہ خوش شکل اور خوبصورت ضرور تھی مگر اسے خوش اطوار اور خوب سیرت کہنا مبالغہ ہو گا۔ محترمہ نے اپنا گھر برباد کیا اور دوسروں کا بھی۔ میاں نے عین جوانی میں ان کی حرکتوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی اور یہ آجکل بیچ بڑھاپے کے قحبہ چوں پیر شود پر عمل کر رہی ہیں۔ مسز حیدر علیگڑھ میں ہمیشہ کھلے اور لمبے کپڑے پہنتی تھیں اور سر کبھی ہیٹ سے ڈھکا رہتا اور کبھی سکارف سے بندھا ہوتا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے انہیں کبھی بھڑکیلے رنگ چست لباس یا لپ اسٹک استعمال کرتے دیکھا ہو۔ ایک بار میں نے ان کی تصویر لینی چاہی۔ وہ ان دنوں انگلستان کی سفوک کاؤنٹی میں ایک ستر سالہ بوڑھی بیوہ کی حیثیت سے زندگی گذار رہی تھیں۔ کہنے لگیں مجھے تیار ہو لینے دو، یوں کھلے بالوں تصویر اترواتے مجھے شرم آتی ہے۔ پھر وہ اندر گئیں اور ایک ہیٹ پہن کر کاٹیج کے پچھلے صحن میں امرود کے درخت کے پاس کھڑی ہو گئیں

مہینہ میں تین چار بار نمبر چار ذکا۔ اللہ روڈ کے پردے والے صحن کے دروازے پر گالف اسٹک سے کھٹکھٹانے کے بعد مسز حیدر دروازے میں کھڑی ہو کر باریک آواز اور بدیسی لہجہ میں کہتیں، بیگم شیخ عطا اللہ کیا میں اندر آجاؤں۔ ان کے لئے حسب خواہش دفتری کرسی بچھائی جاتی، عام طور پر صحن میں اور گاہے باورچی خانہ میں۔ آفس چیئر پر بیٹھ کر جب وہ توے سے روٹی اتارنے کی مشق کرتیں تو بے حد سنجیدہ ہوتیں تجربہ ناکام ہو جاتا تو وہ اپنے اناڑی پن پر دیر تک کھلکھلا کر بچوں کی طرح ہنستی رہتیں۔ یا باورچی خانہ میں گفتگو کا موضوع مختلف دیسی کھانے پکانے کی ترکیب ہوا کرتی، جسے وہ اکثر لکھ لیتی تھیں۔ صحن میں جب فراغت سے نشست ہوتی تو وہ سادہ گھریلو باتیں کرتیں جن میں ڈورتھی اگینس فاطمہ حیدر کا ذکر بار بار ہوتا جسے وہ پیار سے اگی کہتی تھیں۔ اگینس میری ہم عمر تھی اور مجھے سال بہ سال بڑا ہوتے دیکھ کر وہ اندازہ لگایا کرتی تھیں کہ اب انگلستان میں اگینس کتنی بڑی ہو چکی ہو گی۔ وہی کلکتہ کے کابلی والا کی میگو ربانی۔

ایک دن مسز حیدر نے دو پردہ دار سہیلیوں کو دعوت پر بلایا اور دوسرے دن ان کے چھوٹے بچوں کی علیحدہ دعوت کی۔ پہلے روز کھانے میں اٹلی سے آئی ہوئی میکرونی بھی تھی جسے مسز حیدر نے بڑے شوق سے خود پکایا اور اصرار کے ساتھ کھلایا۔ کھانے والوں نے ان کا دل رکھنے کے لئے پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن گھر پہنچ کر صاف اقرار کیا کہ اگر کچھ مقدار پلیٹ میں اور ڈال دی جاتی تو عین ممکن ہے کہ جی خراب ہوتا اور متلی آجاتی۔ دوسرے دن کی دعوت میں ایک بچے نے معصومیت کے ساتھ پوچھا آنٹی آپ نے کل میری امی کو کیا کھلایا تھا کہ وہ کہتی تھیں .... اور بچے نے اسی طرح بے دھڑک سچ بول دیا۔ جیسے تمام بچے ہمیشہ بولتے آئے ہیں۔ جب بچے سچ بولنا چھوڑ

دیں گے تو قیامت آجائے گی۔ لوگ ناحق آثار قیامت کے لئے ضعیف روایتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

احباب کے مختصر حلقہ میں سال بہ سال انگلش کے ایک اور جماعت پاس کر لینے کی خوشخبری سنائی جاتی۔ یہاں تک کہ اس نے ادبیات باستانی یونان و روم میں ڈگری حاصل کر لی۔ اب وہ چھ سات زبانوں کی ماہر تھی۔ ایک زمانہ میں ڈاکٹر حیدر کی خواہش تھی کہ فاطمہ زبان شناس کی حیثیت حاصل کرے اور لیگ آف نیشنز جیسے ادارہ میں مترجم بن جائے۔ لیکن جب اس خواہش کے پورا کرنے کا وقت آیا تو لیگ آف نیشنز ختم ہو گئی اور دوسری جنگ عظیم کسی طور ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ اس نے دوبارہ ثانوی جماعتوں میں داخلہ لیا اور سائنس کا کورس پورا کرنے کے بعد میڈیکل کالج میں داخل ہو گئی۔ چند سال اور گذرے اور وہ لیڈی ڈاکٹر بن گئی۔ تعلیم کا یہ ولائتی دور کم و بیش ایک دہائی پر مشتمل تھا۔ یہ والدین اور اکلوتی پردیسی بیٹی کی جدائی کے دس سال تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے ان دنوں جب لڑنے کے لئے اتحادیوں میں سے صرف ایک اتحادی تنہا باقی رہ گیا اور رلفٹ وافے نے مشق ستم کے لئے لندن کا انتخاب کیا ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کے ذکا اللہ روڈ کے پھیرے بڑھ گئے۔ یوں وہ ہفتہ میں دو تین بار آنکلتے تھے مگر ان دنوں یہ معمول روزانہ میں تبدیل ہو گیا۔ سوکھی گھاس کے اس گنجے قطعہ میں جو ہمارے اور پروفیسر غلام سرور کے گھر کے درمیان واقع تھا وہ مونڈھے یا ڈیک چیئر پر بیٹھ جاتے اور دیر تک دوستوں سے گفتگو کرتے رہتے۔ شام پڑتی تو بی بی سی کی خبریں سنتے اور بوجھل قدموں اپنے بنگلہ کی طرف روانہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر

کے پاس ان ایام میں ریڈیو نہیں تھا۔ وہ اپنا قیمتی مگر از کار رفتہ ریڈیو تحفہ میں دے چکے تھے اور نیا خریدنے کے روادار نہ تھے۔ جنگ کا زور کم ہوا تو مسز حیدر نے یہ راز افشا کیا کہ ان دنوں حیدر صاحب گھر پر ریڈیو رکھنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا "آخر کس دل سے میں اپنے گھر کے محفوظ مگر اداس ماحول میں اُس وحشت کی تازہ ریڈیائی تفصیل سن سکتا ہوں جو ایک ایسے شہر پر برس رہی ہے جہاں میری اکلوتی کمسن بچی تنہا رہتی ہے" لوگ تھے کہ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو پتھر دل کا آدمی سمجھتے کیونکہ وہ عام زندگی میں جذبات کی نمائش سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ ضبط اور ضابطہ کے آدمی تھے اور قول و فعل کے مرد با اصول ایسے کہ اپنی نظروں میں سبکسار ہونے کو سب سے بڑی سبکی سمجھتے تھے۔ وہ منافقت کو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ جانتے تھے اور جب اسے عام ہوتے دیکھا تو اپنے خول میں سمٹ کر رہ گئے۔ مسلم یونیورسٹی کے ایک وائس چانسلر کی دنیا داری کو دیکھا تو اپنے شعبۂ تدریس کے کالبد میں سکڑ کر رہ گئے۔ کچھ پروفیسر جبری فارغ کئے گئے۔ دوسرے ان کے سائے سے ڈرتے تھے۔ ڈاکٹر حیدر نے اٹھ کر الوداعی تقریر کر ڈالی۔

جنگ ختم ہوئی تو ایک روز اپنے احباب کی مختصر محفل میں اس کے دور رس اثرات کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے۔ یوں لگتا ہے جیسے دوسری عالمی جنگ فرد کی دولت کے خلاف جنگ تھی۔ پھر مسکرائے اور کہا "ثبوت کے طور پر میری مثال لے لیجئے۔ ہانگ کانگ پر قبضہ کرنے سے پہلے جاپانیوں نے شہر کے سلسلۂ آب رسانی کو بمباری سے تباہ کر دیا کیونکہ اس نظام کی سرمایہ کاری میں کچھ حصہ میرا بھی تھا۔ سنگاپور فتح ہوا تو شہر کا بجلی گھر تباہ ہو گیا۔ کیونکہ اس کے کچھ حصص میں نے خرید رکھے تھے۔ رنگون انگریزوں کے ہاتھ سے گیا تو میرے ہاتھ سے وہ رقم بھی گئی جو میں نے وہاں کی چند کمپنیوں میں لگا رکھی تھی۔ پھر سنجیدہ ہو گئے

اور بولے جس تجربہ سے میں دوچار ہوا ہوں اس نے سودو زیاں کا معیار بدل دیا ہے۔ دولت کا نقصان صبر کا نفع ہوتا ہے۔ بلندی کی طرف ہلکے پھلکے ہو کر پرواز کرنے کا نام صبر ہے۔ دولت ایک بوجھ ہے۔ ہر روز کتنے ہی لوگ قارون کی طرح اس بوجھ کے نیچے دبے ہوئے زمین میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بات بدلی اور کہا کچھ دعائیں ساری عمر مانگنی چاہئیں اور کچھ عمر کے مختلف حصوں میں۔ مَیں تو اب یہی دعا کرتا ہوں کہ خدایا اگر عمر لمبی دے تو بڑھاپا خوشگوار دینا۔ اس کے بعد وہ مسکراتے۔ ان کی مسکراہٹ ہمیشہ شیر خوار بچے کی مسکراہٹ ہوتی تھی۔ معصوم بے اختیار اور لمحاتی۔

۴۷-۱۹۴۶ء کا تعلیمی سال پروفیسر ایل۔ کے۔ حیدر کی مشغولی عمر کا آخری سال اور ایم۔ اے معاشیات میں میرا پہلا سال تھا۔ وہ کلاس میں اپنے نوٹس کی کاپی لاتے اور بیشتر وقت اس میں سے پڑھتے رہتے، آہستہ مگر پختہ لہجہ میں۔ گاہے سر اٹھاتے اور ذرا سی دیر تشریح کرنے کے بعد سر جھکا لیتے۔ رعب اتنا کہ پچلا نہ بیٹھنے والے شوخ لڑکے بھی ان کے پیریڈ میں پہلو بدلنے سے احتراز کرتے۔ ایک آدھ بار وہ ناراض ہوتے ناخوشی چہرے پر اس شدت سے نمایاں تھی کہ اسے کسی فقرے یا لفظ کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ ساری جماعت دم بخود رہ گئی۔ بلڈ پریشر بڑا موذی ہوتا ہے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ فراغتی دور کی رہائش کے لئے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر علی گڑھ نئی دلی یا لندن کا انتخاب کریں گے۔ بیشتر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ علی گڑھ میں رہیں گے جہاں ان کی عمر کا بڑا حصہ گذرا ہے۔ مدت ہوئی کریم حیدر نامی ایک لڑکا پوٹھوار کے قصباتی سکول میں پڑھتا تھا۔ ایک روز سکول جاتے ہوئے وہ کچے دیہی راستہ میں آنے والے مٹی کے ڈلوں کو قدم قدم پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار ایک انگریز ادھر

سے گذرا۔ اس نے گھوڑا روک کر اس لڑکے کو ایک نصیحت کی۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ جذبہ کو اظہار کیلئے بہترین موقع فراہم کرے۔ ٹھوکر مارنے کو جی چاہتا ہے تو جاؤ فٹ بال کھیلو۔ وہ لڑکا پڑھنے اور کھیلنے کیلئے ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخل ہوا۔ کالج میں فٹ بال کا کپتان بنا۔ طلبا کی یونین کا صدر منتخب ہوا۔ امتحان میں اول آیا۔ آغا خانی سکالرشپ ملا۔ کیمرج سے ڈاکٹریٹ ملی۔ اب وہ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کی حیثیت سے ریٹائر ہو رہا تھا اور ایک بار پھر لوگوں کے اندازے اس کے بارے میں غلط ثابت ہوئے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ نوجوانی میں جہاں سے چالیس برس پہلے چلا تھا بڑھاپے میں واپس اسی جگہ جا کر رہنا چاہیئے۔ پوٹھواری مٹی کے ڈوں کی کشش نہ گئی۔ کہوٹہ کے چھوٹے سے قصبہ میں جہاں ان دنوں بجلی تک نہ تھی اور مکان بھی کچے پکے تھے انہوں نے رہائش کے لئے جگہ حاصل کر لی۔ ایک خوبصورت ویلا مری میں خرید لیا۔ لودھی کریم حیدر اور سٹیفنی حیدر نے یہ طے کیا کہ وہ گرمیاں مری میں اور سردیاں کہوٹہ میں گذارا کریں گے۔

عام طور پر خدا حافظی کا منظر بڑا ہنگامی جذباتی اور مضحکہ خیز ہوتا ہے۔ الوداع پر تکلف، الفراق پر تصنع۔ ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر تکلفات سے اتنا دور تھے کہ جب برعظیم کے ماہرین معاشیات کی انجمن کے سالانہ اجلاس کے صدر مقرر ہوئے اور خطبہ استقبالیہ سننے کے بعد خطبہ صدارت کے لئے کھڑے ہوئے تو تقریر کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔ حضرات، صدارت کے اعزاز کا شکریہ، آئیے اب کام کی باتیں کریں۔ اس خطبہ کے آغاز کی طرح ان کی ملازمت کا انجام بھی بے تکلف اور سادہ تھا۔ آخری دن بھی وہ ہمیں پڑھانے آئے اور معمول کے مطابق تلے بندھے انداز میں اپنے نوٹس پڑھے اور گھنٹہ بجنے پر رخصت ہو گئے۔ البتہ سہ پہر کے وقت طلبا اور اساتذہ جمع ہوئے اور گروپ فوٹو لئے گئے۔ ایک تیس برس پرانی کاپی

میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ اس میں مہمان خصوصی شعبہ معاشیات کے چپراسی اسماعیل کے ساتھ کھڑے ہیں تصویر کشی کے بعد ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر نے دامن جھاڑا اور گھر کی راہ لی۔ وہ سارا ساز و سامان جو سالہا سال کے بعد رحیم بخش بوچہ سیکرٹری ڈسٹرکٹ بورڈ کے سامنے ڈی سی ہاؤس ملتان کے برآمدہ میں پھیلا ہوا تھا وہ ان کے دامن جھاڑنے پر ہی تو نکلا تھا۔ لیکن یہ ملتان کیسے پہنچا اور کیوں پہنچا؟

ایک روز ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر ریلوے مال گودام پہنچے اور اپنا سامان بک کرایا۔ مال گاڑی کے دو ڈبوں میں سامان چڑھا، تالے لگے، اور مہر بند ویگنوں پر از علی گڑھ تا راولپنڈی کا شناختی پرچہ لگایا گیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف کھولا۔ فال نکلی "اور ہم تم کو کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے۔ تو صبر کرنے والوں کو خدا کی خوشنودی کی بشارت سنا دو۔"

ابا جان سے کہنے لگے میں اس آزمائش کے لئے بالکل تیار ہوں۔ میں نے اثاثے سے کہیں زیادہ بڑا ذخیرہ صبر کا جمع کر رکھا ہے۔ سامان بک کئے ہوئے زیادہ دن نہ گذرے ہونگے کہ آزمائش شروع ہو گئی۔ یہ ۱۹۴۷ء کی بات ہے اور اس سال جس پیمانہ پر خوف بھوک جان مال اور میووں کے نقصان سے آزمائش ہوئی اس کا حال لکھتے لکھتے فرشتوں کی انگلیاں تھک گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کھوٹہ پہنچ گئے اور سامان راستہ میں گم ہو گیا۔ جہاں سے سامان بھیجا تھا وہ جگہ ہندوستان میں رہ گئی اور جہاں بھیجا تھا وہ پاکستان میں شامل ہو گئی دریافت کریں تو کس سرے سے اور یادداشت بھیجیں تو کس مملکت کو۔ انقلابات میں معمولات کو کون پوچھتا ہے۔ کئی مہینے گذر گئے۔ پھر ایک دن پاکستان کے کسی چھوٹے سے بے نام اسٹیشن کے یارڈ میں مال گاڑی کے دو لاوارث ڈبے کھڑے ہوئے ملے۔ مہریں سلامت،

سامان جوں کا توں۔ جسے اللہ رکھے۔ حق بحقدار۔

کھوڑہ اور مری کے گھروں کو آباد کئے ابھی چند ماہ گذرے ہونگے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا پیرس اجلاس شروع ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ پہلا اجلاس تھا اور اس ادارہ کی رکنیت کی پاکستانی درخواست اس میں پیش ہونی تھی۔ اقوام متحدہ کے اس اجلاس کے لئے جو پاکستانی وفد بھیجا گیا اس میں ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر شامل تھے قائداعظم اور قائد ملت دونوں ان سے واقف تھے۔ آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ڈاکٹر صاحب کو مسلم لیگ کی معاشی منصوبہ بندی کی کمیٹی کا رکن بھی مقرر کیا گیا تھا۔ مگر ان حشری دنوں میں سیاسی محاذ پر وہ گھمسان کا رن پڑا کہ معاشی خاکہ کشی کی طرف توجہ کرنی ممکن ہی نہ تھی یوں بھی ڈاکٹر حیدر جی چھوڑ چکے تھے اور ان میں جوش اور لگن کی کمی تھی۔ عملی زندگی کا بہترین حصہ وہ انگریز انتظامیہ کی خدمت میں صرف کر چکے تھے۔ اعلانیہ تو شاید وہ مسلم لیگ کے ممبر بھی نہ تھے۔ ہنگامی سیاست ان کے معتدل مزاج کے خلاف تھی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ۱۹۴۶ء کی سرما میں جس دن دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہو رہے تھے اچھو میاں مسلم لیگ کے یومیہ اجرت پر لئے ہوئے سالم تانگہ پر رائے دہندگان کی تلاش کر رہے تھے۔ یونیورسٹی کی ایک سڑک پر ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کو پیدل جاتے دیکھا تو تانگہ روکا اور پولنگ اسٹیشن تک لے جانے کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے تانگہ میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے، رائے دہندگی کا حق اپنی خوشی سے استعمال کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں مسلم لیگ سے کسی قسم کی آسائش حاصل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے فرض کی ادائیگی کا معاوضہ وصول کیا اور اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔ جملہ ختم کیا اور پولنگ اسٹیشن کی طرف قدم مارنے شروع کر دیئے۔ اس روز یوں قدمے اور سخنے خدمت کے علاوہ انہوں نے مسلم لیگ کا کوئی اور کام شاید ہی کیا

ہو۔تاہم مسلم لیگ نے یاد رکھا کہ وہ جرمن فرانسیسی اور انگریزی جاننے سفارتی رکھ رکھاؤ سے واقفیت اور اعلیٰ سطح پر کام کرنے کے تجربہ کی بنا پر اقوام متحدہ کے ایک اہم اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی کے لائق ہیں۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا کہ اعتراف سزاواری کے لئے گھونہ کی گدڑی بھی چھان پھٹک لیتے تھے۔

پیرس میں اقوام متحدہ کا اجلاس ختم ہوا۔ پاکستان کو ادارہ کی رکنیت مل گئی اور وفد کا ایک رکن بچھڑی بیٹی سے ملنے کے لئے انگلستان چلا گیا جہاں اسے فالج ہو گیا۔ شفیقی حیدر کو خبر ملی تو وہ بھی بیٹی سے ملنے اور شوہر کی تیمارداری کے لئے انگلستان جانے کی تیاری کرنے لگیں۔ قیمتی سامان بند کر کے ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کے بھائی بیرسٹر حیدر کے یہاں کوپر روڈ لاہور پہنچا دیا اور باقی سامان اسی طرح مری کی کوٹھی میں لگا لگایا چھوڑ کر اس کی چابی بیرسٹر صاحب کے حوالے کر دی۔ ماں بیٹی نے شوہر اور باپ کی دو تین سال بڑی خدمت کی۔ بالآخر ڈاکٹر حیدر انگلستان میں انتقال کر گئے۔ کچھ عرصہ بعد بیرسٹر حیدر کا پاکستان میں انتقال ہو گیا۔

مری کے وائیکٹ ویلا کو خالی پڑے پڑے آٹھ دس سال گذر گئے۔ چھت کا روغن پھیکا پڑتے پڑتے بالکل اتر گیا۔ دیواروں کی سفیدی اڑ گئی۔ شیشے چٹخ گئے لکڑی تڑخ گئی۔ نالی دار ٹین میں سوراخ ہو گئے۔ لوہے کی ہر شے زنگ آلود ہو گئی اور باقی سب چیزیں گرد آلود۔ ادھر لاہور میں بیرسٹر مرحوم کے پسماندگان کی حالت بگڑ گئی۔ ایک جوان لڑکے کی بینائی جاتی رہی۔ ایک جوان لڑکی کے شوہر نے علیحدگی اختیار کر لی۔ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ گذر اوقات مشکل ہو گئی۔ وہ لوگ چاہتے تو ڈاکٹر ایل۔ کے۔ حیدر کا سامان فروخت کر کے اس مشکل کو آسان کر لیتے مگر بیرسٹر حیدر کی بیوہ پرانے خیال کی تھیں۔ ایسے

لوگ زندگی کو ناپائدار اور نیکی کو پائدار سمجھتے ہیں۔ اس اثنا میں انگلستان سے ابا جان کے نام ڈاکٹر حیدر کی بیوہ کے خطوط اور نیک خواہشات والے تہواری کارڈ باقاعدگی سے آتے رہے۔ خاوند کی یاد، بیٹی کا حال، زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشگوار باتوں کا ذکر۔ میں دیسی کھانوں کی مشق کرتی رہتی ہوں، قاضی یونس ملنے کے لئے آتے رہتے ہیں، گلہریوں سے امرودوں پر میری جنگ جاری ہے، میں نے اطالوی زبان سیکھنے کے لئے ہفتہ واری کلاس میں داخلہ لے لیا ہے، دوسرے ہم جماعتوں کی اوسط عمر میری عمر سے کوئی چالیس پینتالیس سال کم ہوگی، میں کلاس میں درمیانہ درجہ کی طالب علم شمار ہوتی ہوں۔ اپنی سکنی جائداد اور منقولہ سامان کا ذکر تو علیحدہ رہا کبھی بھولے سے اس طرف اشارہ بھی نہ کیا۔ کوئی دس سال کے بعد ایک خط اس مضمون کا آیا کہ جو سامان کوپر روڈ پر پڑا ہے اگر آپ اسے لندن بھجوا سکیں تو مجھے خوشی ہوگی۔ یہ چیزیں فاطمہ کو ہماری یاد دلاتی رہیں گی۔

سامان بھیجنے میں کئی دشواریاں تھیں۔ مالک کا انتقال بیرون ملک ہو چکا تھا، جرمن بیوہ پاکستانی شہریت چھوڑ چکی تھی، بیٹی نے پاکستان دیکھا بھی نہ تھا۔ چاندی کے سامان کی اجازت سٹیٹ بنک سے لینی تھی اور جملہ سامان کے لئے ضمانت نامہ داخل کرانے کے بعد چیف کنٹرولر امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کا اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کئی دیگر دفاتر کو واقعہ کی اصلیت، مال کی ملکیت اور بھیجنے والے کے اختیارات کے بارے میں تشفی کرانی ہوگی۔ لیکن ان تمام مراحل سے پہلے ایک کٹھن مرحلہ اس سامان کا حصول تھا۔ کیا مسز حیدر کا ایک ہوائی ڈاک سے آیا ہوا نجی خط دکھا کر ایک دوست اور ان کا لڑکا یہ تمام سامان ڈاکٹر حیدر کے مرحوم بھائی کے پسماندگان سے حاصل کر سکتے ہیں۔ بیرسٹر صاحب کی بیوہ سے ڈرتے ڈرتے رابطہ قائم کیا گیا۔ انہوں نے بات سنی اور کہا، سو بسم اللہ۔

کرم شاہ سے ٹرک لئے اور سامان لاہور سے ملتان پہنچا دیا۔ خط و کتابت کے ذریعہ ضمانت دی اور اجازت نامے بنوائے۔ رحیم بخش بوچ نے فہرست بنوائی اور دوبارہ حفاظت سے باندھا۔ ٹرک آئے اور کراچی لے گئے۔ عملہ کے دو آدمی ہمراہ گئے۔ سامان ٹامس کک اینڈ سنز کے حوالے کیا۔ کل خرچ موازی ایک ہزار دو سو سینتیس روپیہ سات آنے۔ چند ہفتوں میں سامان لندن پہنچ گیا۔ بارہ نومبر ۱۹۵۹ء کا لکھا ہوا شکریہ کا خط ۲۴ ولیسٹ واک، ایسٹ بارنٹ، ہرٹ فورڈ شائر سے میرے نام آیا جس کے اختتام پر درج تھا۔ تمہاری بوڑھی آنٹ، ایس۔ ایچ۔
سامان ٹھکانہ لگا تو بیرسٹر صاحب کے خاندان کی آزمائش بھی ختم ہو گئی۔ لڑکی کے ناراض اور غائب شوہر کے ترکہ سے کئی مربعے زرخیز زرعی زمین کی یافت ہوئی۔ نابینا بھائی نے زمینوں کا انتظام سنبھال لیا۔ مسز حیدر نے مری کی کوٹھی بھی بیرسٹر صاحب کے پوتوں کے نام لکھ دی۔ یہ لوگ کرائے کی بوسیدہ کوٹھی چھوڑ کر بہتر جگہ منتقل ہو گئے۔ سنا ہے لڑکی نے حسب منشا نئی شادی بھی کر لی۔

ایک بار میں مسز حیدر کے گھر گیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق لندن سے پہلے چار نمبر کی بس پکڑی پھر چھ نمبر کی اور آخر میں دو نمبر کی۔ بس سٹاپ کے چوراہے سے جنوبی سڑک پر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک وسیع مضافاتی سبزہ زار کے چاروں طرف بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروں میں سے چونتیس نمبر کے دروازے پر دستک دی۔ اس گھروندے کا کل رقبہ اس اصطبل سے کم تھا جس میں کبھی برف کی سلیں لگائی جاتی تھیں۔ مسز حیدر ڈاڑی کھولے عینک چڑھائے باورچی خانہ میں پلاؤ دم کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ ان کا دم پھولا ہوا تھا۔ پلاؤ پکانے کے آخری مرحلہ کی ہدایات ان کے لئے آخری معرکہ کے مانند تھیں جسے سر کرنے کے لئے وہ خاصی بے حال ہو رہی تھیں۔ اتنے میں گھنٹی بجی اور اتی آ پہنچی۔ ماں کا چہرہ کھل گیا اور آنکھیں روشن ہو گئیں۔ فرط محبت سے ماں کے منہ سے

کوئی لفظ بھی نہیں نکلا۔ بس یونہی دیکھے اور نہال ہوئے جارہی تھیں۔ یہ عمل اتنی دیر جاری رہا کہ پلاؤ کے آخری معرکہ میں انہیں شکست ہوگئی۔ اگینس باپ کی طرح بھاری ماں کی طرح لمبی اور مزاج میں دونوں سے مختلف نکلی۔ آواز اونچی اور باتیں مسلسل۔ خوشی کے اظہار کیلئے کبھی قہقہہ لگاتی کبھی چیخ مارتی۔ نچلا بیٹھنا تو اس نے سیکھا ہی نہ تھا جب سے وہ آئی تھی یوں لگتا تھا جیسے کاٹیج میں بھونچال آگیا ہو۔ وہ چلتے پھرتے کوئی واقعہ سنا رہی تھی۔ کبھی اِس کمرے میں تو کبھی اُس کمرے میں۔ کبھی سیڑھیوں پر تو کبھی بالائی بیڈ روم میں۔ بیان جاری تھا اور ماں کو وہ کہانی باورچی خانہ میں تسلسل سے سنائی دیتی رہی۔ دو ایک بار وقفہ آیا۔ میں سمجھا کہانی ختم ہوگئی یا گلا خشک ہوگیا۔ مگر ایسی کوئی بات نہ تھی' وہ اس وقت سگریٹ سلگانے یا کش لگانے میں مصروف تھی۔ کھانے کی میز پر جب اس سے گفتگو ہوئی تو سمجھ میں آیا کہ وہ شور مچا کر اپنے آپ کو بہلانے اور مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اگر وہ خاموش ہو تو کوئی اس کے کانوں میں زور زور سے پکارتا ہے۔ تم ڈر تھی اگینس فاطمہ حیدر ہو۔ مساحت کا ایک نشان۔ ایک ایسا سرحدہ جہاں دو واضح راہیں مل کر ایک تیسری مگر غیر واضح سمت میں نکل جاتی ہیں۔

لندن سے بروک وڈ کا فاصلہ ریل گاڑی نے کوئی ایک گھنٹہ میں طے کیا۔ میں جب بروک وڈ کے اسٹیشن پر اترا تو ایک مضافاتی شہر کا خیال ساتھ لے کر اترا آ چھوٹا اور صاف ستھرا شہر جس کے اکلوتے بازار میں ساری رونق سمٹی ہوگی۔ بازار کے ارد گرد رہائشی بستی ہوگی۔ دو منزلہ گڑیا گھر صف بہ صف۔ ڈھلواں کھپریلی چھتوں کا سرخ رنگ ہر گھر کے مرلہ بھر کے سبزہ زار سے مل کر منظر کو خوشنما بنا رہا ہوگا۔ بستی کے گرد میلوں تک ہرے بھرے کھیت ہی کھیت ہونگے۔ گاہے جرسی گایوں کا گلہ نظر آئے گا۔ اسٹیشن کی

عمارت سے باہر نکلا تو اس شہر کا نام و نشان بھی نہ پایا جو میرے اندازے نے وہاں بسایا تھا۔ ایک اور ہی شہر آباد تھا۔ بہت بڑا اور بے جان جسے شہرِ خموشاں کہتے ہیں میلوں میں پھیلا ہوا وسیع قبرستان جس کی چمن بندی کی ہوئی ہے۔ سرسبز قطعے، روشیں۔ روش روش اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن والے پھولوں کے بجائے سنگ مرمر کی لوحیں قطار اندر قطار قبروں کے سرہانے سوگوار کھڑی ہیں۔ میل بھر پیدل چلنے کے بعد مڑ کر دیکھا۔ تاحدِ نگاہ قبریں ہی قبریں، تاحدِ خیال موت ہی موت۔ حشر کا پھیلا ہوا میدان ہے۔ مُردوں کی حاضری لگ رہی ہے۔ ہر ایک نے سنگ مرمر کا سرد اور بے جان ہاتھ اٹھایا ہوا ہے۔ حاضر جناب۔ ذرا دیر پہلے میں لندن میں تھا۔ اس میں اور اس میں کتنا فرق ہے۔ شاید کوئی ایسا بڑا فرق بھی نہیں۔ لندن اگر زندوں کا بروک ووڈ ہے تو بروک ووڈ مُردوں کا لندن ہے۔ دونوں گنجان اور آباد۔ ہر عمر، مرتبہ اور اقسام کے لوگوں سے بھرے ہوئے۔ ہر انسانی خوبی اور خامی کو اپنے پہلو میں لئے ہوئے۔ ایک خواہشوں کا مسکن، دوسرا حسرتوں کا مدفن۔ دونوں جگہ مختلف محلے آباد ہیں اور سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ اس قبرستان میں کچی سڑک کے دوسری جانب مسلمانوں کا محلہ واقع ہے۔ غریب اور ویران۔ نہ قطعہ بندی نہ چمن آرائی۔ سبزہ خشک اور زرد۔ جھاڑیاں خودرو اور بے تراش۔ اس حصہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک قطار میں ترک فضائیہ کے چند افسروں کی قبریں ہیں۔ ان کے بعد اس پہاڑی پر اگے ہوئے تنہا درخت کے نیچے حسب وصیت ڈاکٹر الٰہی کے حیدر دفن ہیں۔ میں نے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے اور اس شخص کو یاد کیا جس نے ایک بار خود الزامی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر اپنی بظاہر کامیاب دنیاوی زندگی کی بےثمری اور پس اندازی کی بے مائگی کا یوں اعتراف کیا تھا۔ میں نے ساری زندگی تعلیم سے فراغت تک فاصلہ طے کرنے

میں گنوا دی۔ برِعظیم کے مسلمانوں کے لئے کچھ بھی نہیں کیا حالانکہ میں اس کی اہلیت اور استطاعت رکھتا تھا۔ اولاد ایک اور وہ بھی غیر ملکی۔ مَیں نے قوم کو کچھ بھی نہیں دیا۔ ایسی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے۔

زندگی ایک موج ہے۔ دریا سے اٹھنے کے بعد اگر وہ ساحل سے نہ ٹکرائے تو بھنور کی آنکھ اور مرنے والے کی آنکھیں دونوں اس کے ماتم میں روتی رہتی ہیں مَیں قبرستان سے سر جھکائے خاموش یہ سوچتا ہوا واپس چلا۔ کیا اس کا بھی کوئی مداوا ہے۔

آواز آئی۔ ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے۔ مَیں نے آرزو کا ایک چھوٹا سا چراغ روشن کیا اور مڑ کر دیکھا۔ تا حدِ نگاہ چراغ ہی چراغ۔ تا حدِ خیال روشنی ہی روشنی۔

طرفہ تماشا

یہ دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی بڑائی میں مردم شماری کے علاوہ اور بہت سی باتوں کو دخل ہے۔ لوگ بے حد مصروف ہیں۔ فراغت صرف آزادی کے مجسمہ کو حاصل ہے۔ عمارتیں بہت اونچی ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے لئے ناموزوں، خودکشی کرنے کے لئے شایانِ شان۔ گلیاں سرِ شام غیر محفوظ ہو جاتی ہیں۔ البتہ وال سٹریٹ میں دن کے وقت خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔ سڑکیں ہیں جن پر ٹریفک روک کر عمر رواں کو پہلے گذرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ سرنگیں ہیں جو یہاں سے نکل کر دوسرے ملکوں میں نقب لگاتی ہیں۔ تجارت اس شہر کا پیشہ ہے۔ یہاں ہر شے قیمت یا کرایے پر مل جاتی ہے، بالخصوص حال اور مستقبل۔ البتہ ماضی کا اس شہر کے گودام میں توڑا ہے۔ باشندے یہاں کے خود پسند ہیں۔ شہر کی خاکروبی کا خرچ بادشاہوں کی آمدنی سے زیادہ ہے۔ سو یہاں کے باشندوں پر خاک کسی کا رعب ہوگا۔ وہ کسی کی بھی نہیں سنتے، خواہ معاشرہ ہو یا قانون۔ شہر کیا ہے اسے ملک کہنا چاہیئے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک نوع کی دنیا ہے۔

نیویارک کا شہر بساتے ہوئے ہر ممکن تدبیر سے کام لیا گیا کہ سبزہ کو پاؤں پھیلانے کی جگہ اور درخت کو سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ کئی مربع میل کے جس قطعہ

پر شہر واقع ہے پہلے اس پر کنکریٹ کا فرش بچھایا گیا اور جب وہ خشک ہوا تو اس پر تارکول کا لیپ کر دیا۔ سبزہ اب پاؤں رکھے تو کہاں رکھے۔ پھر شہر کے نیچے اَن گنت چھوٹی بڑی نالیاں کھود ڈالیں۔ کچھ تازہ پانی کی شریانیں کچھ نکاسی کی وریدیں۔ جو نالیاں ذرا بڑی بن گئیں ان میں زمین دوز ریلیں دوڑا دیں۔ ایسی کھوکھلی کوکھ میں درخت جڑ پکڑے تو کیونکر پکڑے۔ درخت دشمنی میں اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ لوہے اور شیشے کے سر بفلک ڈھانچے پہلو بہ پہلو بنا دیئے تاکہ زمین سے ساٹھ ستر منزل بلند سطح پر رہنے والے کو کھڑکی سے اگر بفرضِ محال درخت نظر آ بھی جائے تو وہ قابلِ توجہ نظر نہ آئے۔ شہر بسانے والے بڑے دور اندیش تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس شہر کے لوگوں کی پوری توجہ اور ساری توانائیاں دولت پیدا کرنے میں صرف ہوں اور کوئی چیز بھی اس مقصد کی راہ میں حائل نہ ہو۔ سبزہ اور درخت کے بارے میں یہ خدشہ تھا کہ اگر انہیں پھولنے پھلنے کا موقع ملا تو لوگ کام کاج چھوڑ کر صرف غزلیں کہنے پر کمر باندھ لیں گے۔ اس پس منظر میں جب نیویارک عالمی میلہ کے میدان میں ایک قد آور گھنے چھتنار درخت کے گرد تماشائیوں کا ہجوم دیکھا تو مسافر کو تعجب نہ ہوا

یہ عجیب درخت ہے۔ نہ ہریالی نہ چھاؤں۔ نہ وہ سبز پتے جنہیں ہر ورقے دفتر معرفت کردگار کہیں اور نہ وہ ٹھنڈی چھاؤں جس کے نیچے بیٹھ کر غریب الوطنی کی دھوپ سے پناہ لیں۔ نہ یہ کیلیفورنیا کے مہاگنی کے اس چوڑے درخت کی طرح ہے جس کے تنہ میں سے سڑک آر پار نکل جاتی ہے اور نہ یہ کینیا کے ان قد آور درختوں میں سے ہے جن کی شاخوں پر آشیانوں کی طرح شکاری سیاحوں کے لئے ہوٹل کے رہائشی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ تو اصلی درخت لگتا ہی نہیں۔ گویا اس کا تنہ زمین سے اگنے کے بجائے اس میں گاڑا گیا ہے۔ شاخیں پھوٹنے کے بجائے جوڑی گئی ہیں۔ پتے نکلنے کے بجائے ٹانکے

گئے ہیں۔ اور یہ بات سچ ہے۔ لسے کارگاہ میں نقشہ کی مدد سے تیار کیا گیا اور پیش ساختہ ٹکڑوں کو یہاں نمائش میں لاکر باہم جوڑ دیا ہے۔ اس میں عام درختوں کا حسن بے پروا نہیں۔ س کی شکل اقلیدسی سی ہے۔ یہ سراسر مصنوعی لگتا ہے۔ اس کے باوجود یہاں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہیں۔ ایک خلقت ہے کہ اس درخت کو دیکھنے کے لئے امڈی آرہی ہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ للچائی نظروں سے دیکھتی ہے۔ حیرت اور حسرت سے دیکھتی ہے۔ منہ سے بے اختیار ہائے اور کاشکے کے ہم معنی انگریزی الفاظ یا لغات میں نہ ملنے والی امریکی آوازیں نکل جاتی ہیں۔ بعض تماشائیوں کی آنکھوں میں اتنا تقدس ہے جیسے زیارت کے لئے آئے ہوں۔ یہ درخت عالمی میلہ میں ایک مشہور مالی ادارہ کی طرف سے نصب کیا گیا ہے۔ یہ دولت کا درخت ہے۔ اس پر پتوں کی جگہ کرنسی نوٹ لگے ہوئے ہیں جن کی مالیت ایک کروڑ روپیہ کے برابر ہے۔ اس کا نام ملین ڈالر درخت ہے۔

ہوا کا جھونکا آیا۔ اصلی درخت ہوتا تو سبز پتوں کی سرسراہٹ سے وہ سریلی لے نکلتی جو بہتے پانی کی گنگناہٹ سے ملتی جلتی ہے۔ جسے سن کر اعصاب کو سکون ملتا ہے۔ مگر یہاں معاملہ بالکل الٹا نکلا۔ ملین ڈالر درخت کے مصنوعی کاغذی پتوں سے درشت اور ڈراؤنی آوازیں آنے لگیں، جیسے بھوت پریت آدھی رات کو مرگھٹ میں ادھ جلی ہڈیوں سے گتکہ کھیل رہے ہوں۔ اس درخت سے آخر اور کونسی آواز پیدا ہو سکتی ہے جس کی آبیاری خون اور پسینہ سے ہوتی ہے اور ہڈیوں بلکہ زندگیوں سے اس کے لئے کھاد کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ ایک مسافر کی رائے ہے جس سے دوسرے تماشائیوں کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساتھ کھڑی ہوئی ایک لڑکی کہہ رہی ہے "میں نے اس سے زیادہ سریلی آواز اپنی زندگی میں نہیں سنی۔ اس درخت کے پتوں کی تال پر کپڑے پھاڑ کر ناچنے کو جی چاہتا ہے" وہ

ہجوم کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہی ہے۔ مسافر کو احساس ہوا کہ موسیقی دل میں کانوں کے راستہ داخل ہونے کے بجائے گا ہے خواہش کے زینہ سے نیچے اترتی ہے۔

ایک تماشائی کہہ رہا ہے' آج کا دن میری زندگی کا سب سے بڑا دن ہے۔ آج میں نے ملین ڈالر کی رقم اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے میرے اور اس رقم کے درمیان صرف چار قدم کا فاصلہ ہے۔ اس فاصلہ کو طے کرنے کے لئے میں ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں بلکہ جان دینے کے لئے تیار ہوں تاکہ مرنے کے بعد لوگ کہہ سکیں کہ یہ ایک کروڑپتی کا جنازہ ہے۔ دوسرا تماشائی اشارہ سے ہمراہی کو سمجھا رہا ہے۔ وہ جو ایک چھوٹی سی شاخ نظر آ رہی ہے وہ ہماری زندگی بھر کی کمائی ہو گی۔ خرچ نکالنے کے بعد جو کچھ بچے گا وہ سب سے چھوٹی شاخ کی مالیت سے بھی کم ہو گا۔ تین حرف اس زندگی پر۔ ہمراہی نے کہا' میں ناامید نہیں ہوں۔ کیا پتہ لاٹری نکل آئے۔ دینے والا چھپر پھاڑ کر دے دے۔ چھوڑنے والا اپنی جائداد لاوارث بلیوں کے نام وقف کرنے کے بجائے میرے نام لکھ جائے۔ تماشائی نے جل کر جواب دیا۔ جسے تم امید کا نام دیتی ہو وہ لالچ ہے جو اندھا کر دیتا ہے اور اندھوں کو معاشرہ کی ناانصافیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ ایک تماشائی نے بآواز بلند کہا، اتنی دولت مجھے مل جائے تو مارے خوشی کے میرا دم نکل جائے۔ مسافر نے زیر لب کہا اسی لیے تو غنی کا درجہ سخی سے بلند ہے۔ سخی وہ جسے مال کے جانے کا غم نہ ہو اور غنی وہ جسے مال کے آنے کی خوشی نہ ہو۔ کچھ تماشائی ایسے بھی ہیں جنہیں ملین ڈالر درخت دیکھ کر چپ لگ گئی ہے۔ اتنی دولت دیکھ کر ان کے دل پر آرہ چل گیا! اور کتنے ہی تماشائی دل ہی دل میں اس درخت کو آری سے کاٹ کر اپنے ہمراہ گھر لے گئے۔ یہ درخت پھر بھی ڈیڑھ سال تک ہرا بھرا رہا۔ دراصل نمائش گرمیوں کے چھ ماہ کھلی رہنے کے بعد سردیوں میں بند ہو گئی اور اگلی گرمیوں میں دوسری

اور آخری بار کھلی۔ مسافر نے اسے پچھلے سال بھی دیکھا تھا اور اس سال آج پھر وہ اس ملین ڈالر درخت کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے پوچھا کہ موسم خزاں میں جب اس درخت کے پتے جھڑتے اور نیچے گرتے تو انہیں کون کون سمیٹ کرلے گیا۔ جواب ملا' دولت کا درخت سدا بہار ہے۔ پت جھڑ میں اس کے پتے شاخوں سے جدا نہیں ہوتے بس دعوے دار اور حقہ دار بلندیوں سے زمین پر منہ کے بل گرتے رہتے ہیں۔ خزاں دولت پر نہیں دولتمند پر آتی ہے۔

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ o

اس پرکشش درخت کی وجہ سے مسافر نے اس عمارت کی طرف کوئی توجہ نہ کی جس کے صحن میں یہ لگا ہوا ہے۔ کسی نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ یہ ایک پناہ گاہ ہے۔ محنت اور حاجتمندی والی دنیا اس کے باہر ٹھہر جاتی ہے۔ اس کے اندر ایک اور دنیا آباد ہے' بے احتیاج اور پراسرار۔ مسافر نے تفصیل چاہی۔ معلوم ہوا یہ ایک کلب ہے جس کا رکن بننے کے لئے واحد شرط یہ ہے کہ آپ ایک ملین ڈالر کے مالک ہوں۔ مہمانوں کے داخلہ کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں جو اتنی کڑی نہیں۔ مسافر نے انہیں پورا کیا اور اس دولت خانہ میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ کلب ہرگز اس نقشہ کے مطابق نہیں جو باہر رہ جانے والوں نے اپنے تخیل اور اپنی حسرتوں کی مدد سے کھینچا تھا۔ نہ لاؤ لشکر نہ ہاتھی گھوڑے' نہ افواج خدم وحشم' نہ عیش کے ساز نہ عشرت کے سامان۔ عام سی عمارت ہے اور معمولی سجاوٹ۔ صرف دو چیزیں اسے دوسری جگہوں سے ممتاز کرتی ہیں' ایک اس کی فضا اور دوسرے اس کے مکین۔ فضا خاص الخاص اور تنہائی خالص اور انتہائی۔ یہ عدم مساوات کی آخری منزل اور خود مطلبی کی حد آخر ہے۔ یہاں وہ معدودے چند لوگ پہنچ سکتے ہیں جن کے پَر راستہ میں نہ جل جائیں۔ مسافر نے کلب میں بیٹھے ہوئے دو چار آدمیوں کی طرف

دیکھا۔ اسے کوئی بھی سلامت نظر نہ آیا۔ پونے، آدھے اور تہائی آدمی تو موجود ہیں مگر پورا آدمی کوئی بھی نہیں۔ ان سب کا رنگ ایک جیسا نیلا ہے۔ ایک ہی فکر کا زہر ان کے خون میں تیزی سے سرایت کر رہا ہے۔ یہ سب وقت کے ہاتھوں نالاں ہیں کہ نہ اسے خرید سکیں اور نہ اسے روک سکیں۔ کل ان کا وقت ختم ہو جائے گا اور وہ رخصت ہو جائیں گے مگر اپنے ساتھ اپنے درخت نہ لے جا سکیں گے۔ کتنے جتن کے ساتھ پتہ پتہ جمع کیا تھا۔ آنکھیں بند ہوئیں تو کیسی لوٹ مچے گی۔ لوگ آری کلہاڑی لے کر اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیں گے۔ شاخ شاخ علیحدہ کریں گے اور پتہ پتہ نوچ لیں گے۔ زندگی بھر کی محنت رائگاں جائے گی۔ ملین ڈالر کلب کے اراکین خاموش بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور ایک فکر ان سب کو کھائے جا رہا ہے۔

کروڑ پتیوں کے کلب میں بیٹھا ہوا مسافر انکشاف کے تجربہ سے گزر رہا ہے۔ ملین ڈالر ایک عدد نہیں ایک نظریہ ہے۔ یہ ایک محاورہ ہی نہیں ایک نصب العین بھی ہے جس کی خاطر بے دھڑک اپنے آپ کو ہلکان کرنے اور بے دریغ دوسروں کو ہلاک کرنے کی اجازت ہے۔ دولت کا درخت اس جنتِ ارضی کا شجرِ ممنوعہ بھی ہے سانپ بھی اور شیطان بھی۔ وہاں جو سانپ تھا وہ یہاں دولت پر اژدہا بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ جنت میں اس نے ایک ہی بار بہروپ بھرا تھا، اس دنیا میں اس کے ہزاروں روپ ہیں۔ ایک صورت زرِ قانونی کی ہے۔ کاغذی پیراہن پہنے نقش و نگار سجائے معصوم اور نورانی شکل لئے ہر وقت ہر ایک کے سامنے حاجت روا بن کر کھڑا رہتا ہے۔ صورت کچھ کچھ فرشتوں سے ملتی ہے۔ دل نے کہا، کبھی وہ فرشتہ بھی تو رہا ہے۔ اس کے دھوکہ میں نہ آنا۔ ایک اصول بتا دوں۔ گرہ میں باندھ لو عمر بھر کام آئے گا۔ دولت حلال ہو تو فرشتہ،

حرام ہو تو شیطان۔

مسافر پناہ گاہ سے باہر نکل آیا۔ دولت کے درخت کی طرف پشت کی
اور اردن کے پویلین کی طرف چل کھڑا ہوا جہاں ان دنوں دولت غم کی نمائش لگی ہوئی
ہے۔ پویلین چھوٹا سا ہے۔ ملک ہی کتنا بڑا اور کونسا پرانا اور کہاں کا رئیس ہے مسائل
اس کے البتہ بڑے بڑے ہیں، دشمن بہت پرانا ہے اور دولت غم ہے کہ اس میں فلسطینی
بے گھروں کی شکل میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسافر کو اردن کا سفر یاد آیا۔ وہ بیت المقدس
کے ہوائی اڈہ کی مختصر پٹی جو کئی چھٹی پہاڑیوں میں چھپی ہوئی تھی۔ وہاں سے ایک لمبیسر
ساتھ لیا اور شہر کی سڑک پر روانہ ہوئے۔ دور سے وہ دیوار نظر آئی جس نے شہر کو عرب
اور اسرائیلی حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ وہ گنبد الصخرہ اور مسجد اقصےٰ۔ وہ ان کے آس پاس
کا تاریخی چپہ چپہ۔ وہ تنگ اور پتھریلی گلیوں میں کھیلتے ہوئے عرب بچے جن کی پوری نسل
کی قسمت میں بے آرامی اور خوں چکانی لکھی ہے۔ شاید کو چہ ڈولوروسا کی ہمسائیگی کا اثر ہے
کہ اس میں یسوع مسیح کو اپنے کاندھے پر صلیب اٹھا کر چلنا پڑا تھا یا دیوار گریہ کا اثر ہے کہ
یہاں آکر رونے والے جب تک دوسروں کو روتا نہ دیکھیں ان کی عبادت نامکمل رہ
جاتی ہے۔ مسافر بیت المقدس سے الخلیل گیا۔ ایک سڑک پہاڑیوں کے اوپر جاتی تھی جس
پر اسرائیلی مورچے بنے ہوئے تھے اور دوسری نیچے سے نکالی گئی تھی جس پر ابھی عرب
قابض تھے۔ جامع الخلیل کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے دست فروش سے مسافر نے ایک
طرحدار کلاہ خریدی جسے کئی بار تہواروں پر نکالا اور فخر سے پہنا۔ پھر ایک جنگ ہوئی اور ہارنے
والے یہ سارا علاقہ ہار گئے۔ مسافر نے وہ ٹوپی اتار دی اور سنبھال کر رکھ دی۔ ایک دن ایسا
آئے گا کہ اسے پہن کر سر اٹھا کر چل سکیں۔ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں۔

مسافر نے اس سفر کا بہت سا حصہ سطح سمندر سے نیچے واقع سطح زمین پر طے کیا۔ دو چار جگہ سیاحوں کے انوکھے پن کے جذبہ کی تسکین کے لئے تفصیلات درج تھیں لیکن زمین کی سطح بالکل عام علاقوں کی طرح تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ایک عجوبہ تھا مگر سارے عجوبے دیدنی کہاں ہوتے ہیں۔ گاہے دیدہ سے شنیدہ زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔

کرایہ کی موٹر رات کے گیارہ بجے بحر مردار کے ساحل پر ایک بارونق مقام پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ لب ساحل کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ پانی گاڑھا اور سرمئی تھا۔ چاند کا عکس گدلا اور نامیزان نظر آیا۔ ریستوران میں مدھم رنگین بلب جل رہے تھے۔ مسافر نے وہاں رات کا کھانا کھایا۔ یکایک کسی نے ریڈیو لگا دیا۔ گانے کے الفاظ سمجھ میں نہ آئے مگر ایک باوقار غم زدہ آواز تھی کہ جگر کے پار ہو گئی۔ ہر شے اس نیم روشن ماحول میں بحر مردار میں ڈوب گئی۔ چاند ستارے ساحل عرب عمارتیں اور مستقبل قریب کی بہت سی امیدیں۔ مسافر کو نیویارک کے عالمی فیئر میں اردن کا پویلین جو سیمنٹ کنکریٹ کا ایک تنبو ہے اپنی یادوں کی طنابوں کے سہارے کھڑا نظر آیا۔ اس میں الصخرہ اور الاقصے کے سیپیوں کے بنے ہوئے ماڈل کے علاوہ اور بہت سی دیکھنے کی چیزیں ہیں مگر مسافر تو اس کے تہ خانہ کی پیشانی پر لکھی ہوئی عبارت اور پس منظر میں بجنے والی موسیقی کی خاطر وہاں گیا ہے۔ تہ خانہ میں بحر مردار سے ملنے والی دستاویزات کی نمائش لگی ہے مگر اس میں اترنے کے لئے جو دروازہ بنایا ہے اس پر ایک عربی نظم کا انگریزی ترجمہ لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک فلسطینی عورت کی فریاد ہے۔ مدھم سروں میں کوئی مغنیہ اس مرثیہ کو گا رہی ہے۔ ایک غم زدہ، بے گھر، بے ملک اور بے قرار آواز جسے رہنے کے لئے جب کوئی اور جگہ نہ ملی تو اس نے دلوں میں گھر کر لیا۔

مسافر نے جب پہلی بار ایک فلسطینی کیمپ دیکھا تو اسے بنے ہوئے سولہ

سال ہو چکے تھے۔ ہر گھرانے کو اقوام متحدہ کی فیاضی کی بدولت ٹین کی چار چادریں ملی تھیں۔ دو چوڑائی کے رخ دیوار کی طرح کھڑی کیں اور دو ان پر ڈال کر چھت بنالی۔ دونوں جانب پردے لٹکا لئے اور گھر مکمل ہو گیا۔ نہ بارش سے بچاؤ نہ دھوپ سے پناہ۔ آسودہ حالی نے مدت ہوئی ان پناہ گزینوں کے گھروں پر دستک نہیں دی۔ جن گھروں کے دروازے نہ ہوں ان پر کوئی کیسے دستک دے سکتا ہے۔ اس عارضی بستی میں پیدا ہونے اور آنکھ کھولنے والے بچے بدرو کا پانی ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ثورہ ثورہ حتیٰ ثورہ۔ یہ بچے ان کتابوں کے بکھرے ہوئے اوراق تھے جو ایک زمانہ میں مسافر کے والد کے جہازی آبنوسی میز کے ایک حصہ پر قابض رہتی تھیں۔ ان دنوں فلسطین انگریزی انتداب کا علاقہ تھا اور مسئلہ فلسطین کی آئندہ صورت کو بہت سے لوگ صاف دیکھ رہے تھے۔ والد محترم اس مسئلہ پر چھپنے والی نئی پرانی چیزیں جمع کرتے۔ انہیں پڑھتے اور گڑھتے کبھی خود لکھتے کبھی ترجمہ کرتے۔ ایک فرانسیسی کی لکھی ہوئی کتاب انہیں بہت پسند آئی۔ کہنے لگے اگر میں مفتی ہوتا تو اس کتاب کے مصنف کو مُؤَلَّفَۃِ قُلُوبُہُم کے زمرہ میں شامل کرتا۔ صاحب اختیار ہوتا تو زکوٰۃ کی آمدنی سے عالمی پیمانہ پر اس کی اشاعت کا حکم دیتا۔ پھر خود ہی کہتے یہ بات آج دہاں کون سنے گا اور کون سمجھے گا جہاں قرآن مجید کی اشاعت اس لئے ایک اچھا کاروبار ہے کہ مصنف کا حق تالیف ادا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ صورت حال بالآخر بدل جائے گی۔ ایک دن فلسطین کا مسئلہ حل ہوگا۔ ایک زمانہ میں مسلمان ملکوں میں قرآن مجید فروخت ہونے کے بجائے بلا معاوضہ تقسیم کیا جائے گا۔ مسافر ان یادوں کو لئے پاکستان پویلین میں داخل ہوا۔ بوئے وطن آرہی ہے اور بہت تیز ہے۔ دراصل پویلین پر ایک ریستوران حادی ہے۔ دہاں حسب دستور بختاوری کے لئے

ایک لڑکی کھڑی ہے۔ اس کی رہنمائی میں میز تک پہنچے۔ کسی نے ولدیت دریافت کی۔ جواب ملا' ن۔ م۔ راشد۔ مسافر نے کہا میرا سلام کہنا۔ شاید انہیں یاد ہو کہ جب مادرا چھپی تھی تو وہ ایک بوری میں کتابیں بھر کر دہلی سے علیگڑھ آئے تھے اور ہمارے گھر ٹھہرے تھے۔ ساری کتابیں انہوں نے تحفہ میں تقسیم کی تھیں۔ اور ان دنوں آزاد شاعری کی مفت تقسیم کے لئے بھی بڑی جرأت کی ضرورت تھی۔

نیویارک کی عالمی نمائش میں ملکوں ملکوں کے پویلین لگے ہوئے ہیں۔ ریاستوں اور تجارتی کمپنیوں کے پویلین ان کے علاوہ ہیں۔ ہر ایک دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کھینچ تان میں تماشائی کا دامن تار تار ہے۔ اس کے چہرے پر کیا دیکھے اور کیا چھوڑے کی کشمکش نے اپنا پویلین سجا لیا ہے۔ نمائش میں جگہ جگہ تماشائیوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اس بحث میں الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہیں جمہوریت کا دور دورہ ہے، جدھر ووٹ زیادہ پڑے گروہ ادھر کا رخ کرتا ہے۔ کہیں پدریت اپنا رنگ جماتی ہے، خاندان کا سربراہ غصہ میں آگے چل دیتا ہے اہل وعیال چاروناچار اس کے پیچھے چل دیتے ہیں۔ یہ بحث مسافر کے ہمراہیوں میں بھی چھڑ گئی۔ ایک بولا سیر کے لئے ایک اصول بنا لیتے ہیں۔ ہر براعظم کے دو پویلین دیکھے جائیں۔ ایک سب سے بڑے ملک کا اور دوسرا سب سے چھوٹے ملک کا۔ نیز وہ تمام پویلین نظر انداز کر دیئے جائیں جو تجارتی ہیں اور ہر تین پویلین کی سیر کے بعد کسی ریستوران میں سستایا جائے۔ دوسرے ساتھی نے شدت کے ساتھ اس تجویز کی مخالفت کی۔ بولے، تعجب ہے کہ عالمی نمائش میں پہنچ کر بھی آپ کی فکر کوٹہ سسٹم کی سطح سے بلند نہیں ہوتی۔ مسائل کو حل کرنے کا یہ انداز نرا حسابی ہے حالانکہ اسے اجتہادی ہونا چاہیئے۔ اور آپ تجارت کو حقارت کی نگاہ سے کب تک دیکھتے رہیں گے حالانکہ آپ خود دنیا

ی نظر میں اس لیئے حقیر ہیں کہ اس کی تجارت میں آپ کا کوئی مقام نہیں۔ ذرا ایک چکر اس نمائش کا لگا کر دیکھئے کہ تجارت اور صنعت کے اداروں نے جو اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں کھڑی کی ہوئی ہیں وہ بیشتر ملکوں کی جامع مسجدوں سے بڑی اور بہتر ہیں آخر کیوں نہ ہو بڑے ملکوں کا بڑا پن بھی ان کے دم قدم سے ہے۔ رہا سستانے کا سوال تو وہ ترقی کی دوڑ میں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہاں وسائل اور ترقی کی نمائش لگی ہے۔ لہذا وقت اسے دیا جائے جو اس دوڑ میں دوسروں سے آگے ہو اور ہمارے وقت کی پوری قیمت ادا کر سکتا ہو۔ اس وعظ اور دلیل کے بعد ہمراہیوں کا یہ چھوٹا سا دستہ نقشہ اور کاغذ لیکر ایک چوک میں کھڑا ہو گیا اور اپنی دھن میں مست تماشائیوں کو روک کر بہترین دیدگاہوں کا پتہ پوچھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں فہرست تیار ہو گئی۔

نمائش کو شروع ہوئے کوئی ایک مہینہ گذرا ہو گا مگر دس بارہ پویلین ایسے ہیں کہ ان کی شہرت دور تک اور ان کے دروازے پر منتظر تماشائیوں کی قطاریں دور دور تک پہنچ چکی ہیں۔ مسافر ایک دوہری اور پیچدار قطار میں کھڑا ہو گیا۔ قطار کی اس رسی کے بل نکلنے میں دو گھنٹے لگے اور مسافر عمارت کے اندر ایک وسیع انتظارگاہ میں داخل ہو گیا۔ یہاں انتظار کی تکلیف کو دور کرنے کا کام موٹر کے پرزوں سے لیا جا رہا ہے جو ایک اسٹیج پر آرکسٹرا کے سازوں کی طرح علیحدہ علیحدہ سجے ہوئے ہیں۔ سازندہ کوئی بھی نہیں اور ساز خود بخود بج رہے ہیں۔ ہر پرزہ اپنی جگہ حرکت میں ہے اور ہر ایک پرزہ سے کسی ساز کی آواز آ رہی ہے۔ یہ انوکھے خودکار ساز مل کر بیتھوون کی سمفنی بجا رہے ہیں۔ تماشائیوں کی قطار حرکت میں ہے اور مسافر صرف اتنا دیکھ سکا کہ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ قطار کو ایک خودکار زینہ لے اڑا اور زینہ کو ایک تاریک سرنگ نگل گئی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی

نہیں دیتا۔ تماشائی خود تماشا بن گئے ہیں۔ یکایک آواز آئی۔ میں فلاں بن فلاں آپ سے مخاطب ہوں۔ اس کے بعد موصوف نے بتایا کہ ان کے جد اور خاندان نے کس طرح تاریکی میں اجالا کیا ہے۔ اس تعارف کے دوران گاہ بگاہ زینہ روشن طاقچوں کے پاس سے گذرتا رہا جن میں اہل خاندان اور ان کی مصنوعات کی رنگین تصویریں جڑی ہوئی ہیں۔ موصوف نے مسافروں کو خدا حافظ کہا اور زینہ ایک بلندی پر جا نکلا جہاں اس کمپنی کی موٹریں ایک پٹڑی پر چل رہی ہیں۔ مسافر نے ایک موٹر کا دروازہ کھولا اور اس میں بیٹھ گیا۔ نصف گھنٹہ سے موٹر پراسرار اور پرپیچ گاہ روشن اور گاہ تاریک راہوں پر چل رہی ہے۔ نہ جانے کل کتنی منزلیں ہیں اور کتنے پیچ وخم۔ بالآخر یہ سیر ختم ہوئی۔ حیرت کا غلبہ ہے لہٰذا یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کل کتنے غرفے آئے جن میں سجے ہوئے نمونے اور قالب انسان کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔ یہ کہانی غاروں میں رہنے والے آدمی سے شروع ہوئی اور کاروں پر چڑھنے والے آدمی پر ختم ہوئی۔ کہانی سنانے بلکہ دکھانے کا انداز ایسا تھا جیسے تماشائی الٹے پاؤں چل رہا ہو اور تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہو۔

ٹولی ایک اور طویل قطار میں جا کھڑی ہوئی اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے تقریباً دو کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد عمارت کے اندر داخل ہو گئی۔ یہ عمارت بھی ایک موٹر کمپنی کی ہے۔ اس کا سفر بھی پٹڑی پر چلنے والی گاڑی میں کیا جاتا ہے مگر اس کی شکل ویز انسپکٹر کی اس سواری سے ملتی جلتی ہے جسے باد بہاری بنانے کے لئے میٹ کو ننگے پاؤں راہ آہن پر بھاگنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی ایک کہانی سنائی اور دکھائی جا رہی ہے۔ وہاں عنوان انسان تھا اور یہاں مضمون کائنات ہے۔ اس بیان کے لئے کچھ اور وسعت چاہیئے۔ یہ غرفہ اور طاقچہ میں نہیں سما سکتا۔ یہاں لاتعداد صفر والے اعداد بھی عاجز

ہیں۔یہاں سال نوری کا پیمانہ بھی چھوٹا پڑ جاتا ہے۔یہ فضا اور خلا کی کہانی ہے۔یہ ازل اور ابد کا قصہ ہے۔ہنروروں نے نظر بندی کا انتظام کر رکھا ہے اور اس چار دیواری میں جا بجا ایسے مناظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو بے کراں کائنات میں افشاں اڑاتے سیاروں اور مقیشی ستاروں کی نظیر لا سکیں۔ایک منظر ایسا ہے کہ دودھیا شفقی اور نیلگوں روشنیوں کی تین بل کھاتی تہیں اندھیرے کی تہہ کے ساتھ غلطاں اور پیچاں ہیں اور اس اندھیرے اجالے میں وہ جہاں گردش کر رہے ہیں جو ستاروں سے بھی آگے واقع ہیں۔ایک اور منظر میں نظام شمسی سے بھی بڑے نظام خلا میں خوار و زبوں پھر رہے ہیں۔جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے وہاں تک یہی نظم نظر آتا ہے۔اس سے آگے نظر کام نہیں کرتی یا وہ سواری جس میں تماشائی سوار ہیں اس سوال کا جواب ملنے سے پہلے آگے بڑھ جاتی ہے۔ایک دن ابن حسن برنی نے غالب کی طرح دشت امکان کی حد بندی کرنی چاہی۔گول گھومتے ہوئے کرۂ خاک کے اردگرد پورا نظام شمسی ہے۔اس کے اردگرد اسی طرح کے ان گنت اور ان جانے نظام ہیں۔ان کے اردگرد کیا ہے۔مسافر نے کہا' خلا۔بولے اس کے بعد کیا ہے' جواب دیا' مزید خلا۔ادھر سے سوال داغا گیا کہ خلاؤں کے بعد کیا ہے۔مسافر نے بہت سوچا اور جواب دیا' خلاؤں کے بعد شش جہات میں اوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر مقام پر ایک ذات محیط اور حاوی ہے۔اسے اَلْمُحْصِیُ اور اَلْوَاسِعُ کہتے ہیں۔

کائناتی وسعتوں میں کچھ دیر گم رہنے کے بعد مسافر اس عمارت سے باہر نکلا اور نمائش کے وسط میں فولاد کے بنے ہوئے کئی منزلہ کرۂ زمین کے پاس منڈیر پر بیٹھ کر فوارے کا نظارہ کرنے لگا۔بہتا پانی دیکھ کر مسافر کی آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی ہے اور اچھلتا پانی دیکھ کر اس کے دل میں امید کی کرن روشن ہو جاتی ہے سلہ اس کے لیے قرۃ العین اور کرن اس

کے لئے نور جہاں۔ مسافر نے کرہ کی طرف دیکھا جو فولادی عرض البلد اور طول البلد کا جال ہے۔ خشکی والے تہائی حصہ کا برجستہ نقشہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ اس آہنی دنیا کے مدار میں لوہے کے دو چار حلقے تیر رہے ہیں۔ یہ گلوب اس سے کتنا مختلف ہے جو تہران میں شاہراہ فردوسی کے کنارے بنک ملی کے تہ خانہ میں رکھا ہوا ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں ذرا سا ہے اور ذرا زیادہ اہتمام سے بنایا گیا ہے۔ اس میں ساری سطح زمین ہیرے جواہرات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ سارے سمندر زمرد کے ہیں۔ خط استوا ہیروں سے بنا ہوا ہے۔ بیشتر ملکوں کے رقبہ میں لعل جڑے ہیں مگر وسطی افریقہ میں وہاں کے سیاہ پوست باشندوں کی رعایت سے نیلم لگے ہوئے ہیں۔ اس گلوب میں پچاس ہزار قیمتی پتھر جڑے ہیں جنہیں چمڑے کی تھیلیوں میں بند رکھنے اور گاہے کھول کر معائنہ کرنے کی زحمت سے بچنے کے لئے ناصر الدین قاچار نے حکم دیا تھا کہ کوئی ایسی چیز بناؤ جو دیدہ زیب بھی ہو اور سارے جواہرات کو یکجا محفوظ کر دے۔ تعمیل حکم میں ایک نئی دنیا تعمیر ہوئی جس کی سرزمین جوہر دار ہے۔

انسان کا جہاں بس چلتا ہے وہ ایک دنیا بسا لیتا ہے۔ یہ عالمی نمائش بھی تو ایک طرح کی دنیا ہے۔ ہر ملک کا پویلین اور ہر ملک کا تماشائی یہاں موجود ہے۔ ہر طرح کی سواری یہاں دستیاب ہے۔ پٹری پر چلنے والی، بیٹری سے چلنے والی اور تار پر کنڈہ سے لٹکنے والی۔ ہر سواری کے اسٹیشن پر مسافروں کا جوار بھاٹا نظر آتا ہے۔ ایک ریلا آتا ہے اور دوسرا جاتا ہے۔ اس ریلے میں ہجوم ایک شخصیت ہے اور بھیڑ ایک چہرہ۔ فرد کی نہ کوئی حیثیت ہے نہ کوئی شناخت۔ مسافر ایک بار پھر نمائش جانے کے لئے گاڑی پکڑنے والے ہجوم میں بہا جا رہا ہے۔ مخالف سمت سے آنے والے ہجوم میں اسے ایک شخص سب سے علیحدہ نظر آیا۔ جوان مگر کمر میں جھکاؤ۔ سب نے

سوٹ پہن رکھے ہیں یہ اچکن اور پاجامہ میں ہے۔ سب نے خط بنا رکھا ہے اور اس نے بال بڑھا رکھے ہیں۔ مسافر اور وہ شخص دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور بغل گیر ہو گئے۔ مسافر نے فرطِ شوق کی لگامیں کھینچ لیں تاکہ زین العابدین کے جسم کو زور سے دبانے میں کہیں آبگینہ کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ زین اور مسافر دونوں ہم جماعت تھے اور عزیز دوست۔ ایف اے میں ساتھ، بی اے میں ساتھ، ایم اے میں وہ انگریزی کی کلاس میں چلے گئے اور یہ معاشیات میں۔ ایم اے کا نتیجہ نکلا۔ دونوں اپنے اپنے مضمون میں اول آئے۔ مسافر نے زین العابدین کو پاکستان میں ہونے والے مقابلے کے اولین امتحان کے داخلہ کا فارم بھیجا۔ ادھر سے دیر تک کوئی جواب نہ ملا اور تاریخ گذر گئی۔ بہت دنوں کے بعد خط آیا کہ یہ امتحان کے فارم میرے لئے کاغذ کے پھول ہیں۔ ایک تکلیف دہ اور صبر آزما بیماری میرا امتحان لے رہی ہے لہٰذا سول سروس کی خوشبو اور خواہش میرے لئے ختم ہو چکی ہے۔ مسافر نے خط کو کئی بار پڑھا اور اسے اعتبار نہ آیا۔ وہ زین کو چند ہفتہ پہلے ایک خوبصورت اور خوب سیرت نوجوان کی حیثیت سے علیگڑھ میں چھوڑ کر آیا تھا۔ کھلتا سفید روشن چہرہ، خوش اخلاق اور خوش مذاق، متین اور محنتی۔ قدرے نازک مگر اس کے باوجود گھڑ سوار۔ پتہ چلا کہ زین کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اکیس بائیس برس کے نوجوان کی کمر جھک گئی ہے۔ وہ نوجوان باہمت نکلا۔ بستر، بیساکھی اور پہیہ والی گاڑی کے صبر آزما مراحل سے گذرتا ہوا اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ تعلیم کا شوق تصنیف تک لے گیا، وہاں سے دو قدم آگے چلے اور تبلیغ کی منزل تک پہنچ گئے۔ مسافر نے سولہ برس کے بعد جب زین العابدین کو نیویارک میں عالمی نمائش کی خصوصی گاڑی کے پلیٹ فارم پر ایک پرنشاط ہجوم میں سینے تلے قدموں چلتے دیکھا تو اسے ذوق سے شکایت پیدا ہوئی جس

نے ہمدم دیرینہ کے ملنے کو مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر بتایا ہے۔ استاد کو چاہیئے تھا کہ اس دورِ بے اماں کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسی ملاقاتوں کے لئے کم از کم فریقین کی صحت و عافیت کی شرط لگا دیتا۔

میڈم توسو کی مومی مورتوں کی نمائش میں کئی بت زندہ آدمیوں سے زیادہ جاندار نظر آتے ہیں۔ لندن کی اس تفریح گاہ کی نقل اتارنے کی کوششیں کئی بڑے شہروں میں کی گئی ہیں مگر سبھی ناکام ہیں۔ عالمی نمائش کی اور ہی بات ہے۔ یہاں ایک پویلین میں صرف ایک مومی بت رکھا ہوا ہے مگر اس کے درشن کے لئے ہر وقت ٹھٹ لگا رہتا ہے۔ ایک چھوٹا سا ہال ہے جس میں تماشائی بیٹھ جاتے ہیں تو اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔ ہلکی سی روشنی اسٹیج کے بل دار سرخ مخملی پردے پر پڑتی ہے اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ اعلان ہوتا ہے۔ یہ تماشا سہی مگر اس کے باوجود ہم جو کچھ پیش کر رہے ہیں اس کا احترام آپ پر لازم ہے۔ پردہ آہستہ آہستہ چاک ہوتا ہے اور سمٹتا سکڑتا تہ بہ تہ اپنے آپ سے بغل گیر ہوتا بغلی ستونوں کی آڑ میں چھپ جاتا ہے۔ پس منظر میں امریکی کانگرس کی عمارت کا لمبوترا اور بے شمار دریچوں اور روشندانوں والا گنبد بنا ہوا ہے۔ اسٹیج کے وسط میں ایک سنہری آرائشی کندہ کرسی رکھی ہوئی ہے۔ کرسی پر ابراہم لنکن بت بنا بیٹھا ہے۔ لیکن یہ اس بت سے بہت مختلف ہے جو پوٹومیک کے کنارے لنکن میموریل میں پتھر کی ایک اونچی کرسی میں نصب ہے۔ جب مسافر نے اس مجسمہ کو پہلی بار دیکھا تو باہر برف پڑی ہوئی تھی اور پتھر کی یہ شبیہہ یخ سے بھی زیادہ سرد لگتی تھی۔ البتہ پشت کی طرف دیوار پر جو عبارت لکھی تھی اس نے لنکن کا کارنامہ یاد دلایا اور دل کو گرمایا۔ لکھا تھا' اس زیارت گاہ میں / جس طرح لوگوں کے دلوں میں / جن کے لئے اس نے وحدت مملکت کی پاسبانی کی / ابراہم لنکن کی یاد /

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ عالمی نمائش میں لنکن کا جو مومی بت ہے وہ میڈم توسو کے
صنم خانے میں رکھے ہوئے بتوں کی مانند کپڑے پہنے ہوئے ہو بہو زندہ آدمی کی نقل معلوم ہوتا
ہے۔ وہی لنکن کے چہرے کی اونچی ہڈیوں پر مڑھی ہوئی پچکی گالیں، کنوئیں میں تیرتے ہوئے
ڈول جیسی آنکھیں، کشادہ پیشانی، فراک کوٹ، واسکٹ میں لگی ہوئی گھڑی کی زنجیر اور کالی ٹوپی۔
توسو کے بت اپنی اپنی جگہ ساکت ہیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے لنکن کے اس بت میں حرکت
ہوئی۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دو چار قدم لوگوں کی طرف بڑھا۔ پھر لنکن نے مجمع کو مخاطب
کیا اور اپنی ایک مشہور تقریر کا مشہور ترین حصہ دہرایا: ہم اس مقام پر عہد واثق کرتے
ہیں کہ مرنے والوں کی موت رائگاں نہیں جائے گی۔ اس قوم کو سایۂ ذوالجلال میں آزادی
کی حیاتِ نو میسر آئیگی۔ عوام کی حکومت عوام کے وسیلے اور عوام کے واسطے زمین سے نابود نہیں ہوگی
عالمی نمائش کے جس پویلین میں امریکہ کے سولہویں صدر کی تقریر ہو رہی
ہے اس میں کوشش کے باوجود مسافر کو داخلہ نہیں ملتا۔ اس کے پاس وقت کم ہے اور وہ
طویل قطاروں میں کھڑا ہو کر اسے اور کم نہیں کرنا چاہتا۔ دنیا ایک بت خانہ ہے۔ لنکن کا بت نہ
سہی کوئی اور سہی۔ مسافر سفر میں ہے۔ نظارے، تماشے اور تجربے اس کی راہ میں بکھرے پڑے
ہیں۔ وہ انہیں سمیٹنے میں لگ جاتا ہے۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظارے خود چل کر اس
کی راہ میں آجاتے ہیں اور تماشے بہانہ بنا کر اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ وہ
مصروف اور مگن ہے۔ کوئی ایک دہائی اسی طرح گذرنے کے بعد وہ آج ڈزنی لینڈ کے
دروازہ پر کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ عدنان اور عامر بھی ہیں۔ یہ دونوں بچے ماموں کے گائیڈ
بنے ہوئے ہیں۔ چونکہ ان کا گھر اس تفریح گاہ کے نزدیک واقع ہے اس لئے انہیں راہنمائی
کا حق پہنچتا ہے۔ وہ بتا رہے ہیں کہ کس تماشا پر بے تحاشہ ہنسی آتی ہے، کہاں بڑا ڈر لگتا ہے

اور کہاں بےحد حیرت ہوتی ہے۔ وہ ان تماشوں کی فہرست بنانے میں مصروف ہیں جو آج دن بھر میں دیکھے جائیں گے۔ اس پر تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ فیصلہ کرنے والے کہتے ہیں، اس فہرست میں بچوں کی پسند کے علاوہ انکل کی دلچسپی کا بھی خیال رکھنا چاہیئے لہذا وہ پویلین ضرور دیکھا جائے گا جس کا نام ہے صدر لنکن کے ساتھ چند تاریخی لمحات۔

ساڑھے چھ ڈالر میں ایک کاپی ملی ہے۔ ایک ٹکٹ داخلہ کا اور چند ٹکٹ تماشوں کے ہیں۔ اگر تماشوں کے ٹکٹ کم پڑ گئے تو اور خریدنے ہونگے۔ اس تماشا گاہ کا وسیع رقبہ سات حصوں میں تقسیم ہے اور ہر حصہ کے تماشوں کا ایک عنوان ہے۔ تصورات کی دنیا، مہمات کی دنیا، کل کی دنیا، یہ دنیا اور وہ دنیا۔ یہ ہفت اقلیم ہے اور ہر اقلیم میں کئی تماشے ٹکٹ والے اور کئی بلا ٹکٹ ہیں۔ ناچ گانے، بہروپیے اور جشن دو صد سالہ کی فینسی پریڈ مفت کی مد میں شامل ہے۔ تختۂ گل اور اس کی مانند تماشائیوں کے کھلے ہوئے چہرے جو اس سیرگاہ کا حاصل ہیں ان پر بھی کوئی ٹکٹ نہیں۔ یہاں کی ساتوں دنیائیں تخیلاتی ہیں۔ ان سب سے مل کر خواب و خیال کی ایک دنیا بنتی ہے۔ بچوں کے خواب ہیں جنہیں بڑوں نے خیالی شکل دے رکھی ہے۔ تعمیر سے پہلے معمار نے کہا تھا، میں چاہتا ہوں دروازہ سے داخل ہونے کے بعد دنیا کی ذراسی جھلک بھی دکھائی نہ دے۔ جو کچھ ہو وہ عالم دیگری ہو۔ تعمیر کے بعد اس نے کہا، یہ دنیا کا سب سے خنداں اور شادماں قطعہ زمین ہے۔ "ڈزنی لینڈ میں چونکہ زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم، اس لئے خوشیوں کی مساوات ہے۔ ماموں کی حیرت اور مسرت کسی طرح بھانجوں سے کم نہیں۔

پروفیسر بوم کلاس لے رہے ہیں۔ ٹکی ٹکی طوطے مل کر کورس گا رہے ہیں۔

ریل گاڑی عہد قدیم میں داخل ہوتی ہے اور دیو قامت سوسمار پھنکارنے لگتے ہیں۔ آبدوز

سمندر میں غوطہ لگاتی ہے۔ راکٹ فضا میں پرواز کرتا ہے مسسی سپی بہہ رہا ہے۔ راستہ گرینڈ کنیان میں سے گذر رہا ہے۔ کشتی منہ کھولے بھاری بھرکم دریائی گھوڑوں کے پاس آ گئی ہے۔ ریڈ انڈین جھونپڑیوں کی آڑ سے تیر چلا رہے ہیں۔ ہاتھی دو ٹانگوں پر چل رہا ہے۔ ریچھوں کی جمبوری ہو رہی ہے۔ ہر ملک کی سجی سجائی گڑیا لوک ورثہ کا گیت سنا رہی ہے۔ چائے کی دیو قامت پیالیوں کے اندر بیٹھے ہوئے بچے جھولا جھول رہے ہیں۔ مکی ماؤس کو روک کر بچے اس کی سیاہ گیند جیسی ناک کو چوم رہے ہیں۔ سنو وائٹ' پیٹر پین' پی ناشیو اور سنڈریلا حاضر ہیں۔ ایلیس ونڈر لینڈ میں کھو گئی ہے۔

مسافر دن بھر سے تماشا گاہ میں گھوم رہا ہے۔ ایک تماشا سے نکلتا ہے اور دوسرے میں داخل ہو جاتا ہے جیسے وہ ہنڈولے میں بیٹھا ہو۔ جھولا لمحہ بھر کے لئے تیزی سے نیچے آتا ہے اور دوسرے لمحہ اسی تیزی سے ہوا میں بلند ہو جاتا ہے۔ زمین پر اترنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ نمائش کے بیچوں بیچ سوئٹزر لینڈ کا پہاڑ میٹرہارن کھڑا ہے۔ دو کوہ پیما اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسافر کا جی ان کے ساتھ پہاڑ کی ایک لگر پر اٹکا ہوا ہے مگر وہ خود دامن کوہ میں ایک قطار میں کھڑا ہے۔ یہ قطار اس رولر کوسٹر کے لئے ہے جو اس پہاڑ کے ارد گرد اور اس کے اندر بنی ہوئی سرنگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ اس کی باری آئی اور وہ رولر کوسٹر کی بچہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ پہلی بار مانچسٹر میں اس اندیشہ ناک تفریح کی تجربے دوچار ہوا۔ آنتیں ہلا دینے والے جھٹکے' کمر میں بل ڈال دینے والے اچانک موڑ' خوف زدہ کرنے والی چڑھائی' ہول لانے والے گرتے عمودی راستے' تیز ہوا میں پلکیں جھپکا دینے والی رفتار اور آئندہ کبھی رولر کوسٹر پر نہ چڑھنے کا تہیہ اسے خوب یاد ہے۔ مگر وہ عہد شکنی پر تلا ہوا ہے۔ موج ہوائے سیر ہے جو مسافر کو بہائے لئے جا رہی ہے۔ یہ موج اسے ایک

کشتی میں بٹھا کر اندھیری سرنگوں اور سمندری غاروں سے ہوتی ہوئی بحر کاریب کے قزاقوں کے ڈیرے پرلے گئی۔ بحری لیٹیرے لوٹے ہوئے خزانہ کی نمائش اور غلاموں کی نیلامی میں مصروف ہیں۔ محکوم شور و فریاد کر رہے ہیں۔ لال آنکھوں، خوفناک موچھوں، بڑی زلفوں، چوڑے ہیٹ اور فل بوٹ والا ڈاکو سکندر اعظم سے کہہ رہا ہے۔ کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی۔ مسافر اس دریائی تماشا کے بعد ایک میدانی تماشا دیکھنے کے لیے ایک گھر میں داخل ہوتا ہے۔ جونہی وہ گھر میں داخل ہوا بھوت نے دروازہ مقفل کر دیا۔ اس کے بعد کمرے کی چاروں دیواریں مسافر کی طرف بڑھنے لگیں۔ بھوت قہقہہ لگا رہا ہے۔ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔ اس میں نو سو ننانوے بھوت رہتے ہیں۔ ہر بھوت تماشائیوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ مسافر بمشکل پیچھا چھڑا کر اس جناتی گھر سے باہر نکلا ہے۔ اسے ڈزنی لینڈ ایک جناتی تماشا گاہ لگتی ہے۔

امریکہ کے مغربی ساحل کے سستے تماشوں، پست تفریح گاہوں اور سیاحی بے راہ روی کے ٹھکانوں کے مقابلہ میں یہ سیر گاہ اتنی عجیب لگتی ہے جتنا ڈزنی لینڈ کی خودکار الکٹرونی دنیا میں وہ دو گھوڑے جو ٹھنڈی سڑک پر چلنے والی ٹرام گاڑی میں جتے ہوئے ہیں یہ شائر نسل کے چوڑے چکلے بھاری بھر کم سترہ ہاتھ لمبے ایک ٹن وزنی تنومند گھوڑے جن پر زین ڈال کر سوار ہوں تو ٹانگیں چر جائیں بڑے وقار کے ساتھ سر اونچا کیے ہر قدم سوچ سمجھ کر پتھر کے فرش پر رکھتے ہیں۔ ان کے پیر گھٹنوں سے سموں تک گھنے لمبے بالوں سے یوں ڈھکے ہیں جیسے شاہ کے پاؤں میں پڑی ہوئی زلفوں کی زنجیریں۔ ان کی ٹاپوں کی دھمک یوں لگتی ہے جیسے قدم قدم پہ خوشیوں کے غبارے پھوٹ رہے ہوں۔

رنگین وردیاں پہنے ہاتھوں میں رنگ برنگ غباروں کے گچھے لیے ہرادل

دستہ ٹھنڈی سڑک پر مارچ کر رہا ہے جشنِ دو صد سالہ کی فینسی پریڈ شروع ہو گئی ہے۔ مسافر پیادہ رو پر رومال بچھا کر بیٹھ گیا ہے۔ سامنے سے فلوٹ گذر رہے ہیں۔ سجے ہوئے اور رنگے ہوئے۔ خوشنما غیر مسطح اور کئی منزلہ۔ ہر ایک تماشا گاڑی کا صرف تماشا نظر آتا ہے اور گاڑی اوجھل ہے۔ ہر تماشا کا موضوع مختلف ہے۔ قدرِ مشترک ناچ اور گانا۔ لڑکے اور لڑکیاں۔ گانے بجانے والے ادوھم مچانے میں مصروف ہیں۔ تھرکنے ناچنے والے دھما چوکڑی میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر تماشا گاڑی کے طبقہ اعلیٰ پر ایک ملکہ حسن بیٹھی ہے۔ ہر ایک کی قلمرو جدا ہے اور نقشہ پر کہیں نظر نہیں آتی۔ بھانت بھانت کی ملکہ موجود ہے۔ ملکہ امروز ملکہ فردا، ملکہ صبح ملکہ شام، ملکہ تبسم ملکہ ترنم۔ وہی جہان جو میر و سلطاں سے بیزار ہے ملکاؤں کا بڑا مشتاق ہے فینسی پریڈ دیکھنے والے نہال ہوئے جا رہے ہیں۔

وقت بھی ایک رنگا رنگ ملکہ ہے۔ صبح سے اس کی سواری مسافر کی نظروں کے سامنے ہے۔ سویرے وہ اس سیرگاہ میں داخل ہوا تو پھولوں سے لدی پھندی گنجان کیاریاں یوں نظر آئیں جیسے کسی نے دھنک رنگ دھاگوں سے زمین پر بیل بوٹے کاڑھے ہوں۔ اب وہ رخصت ہو رہا ہے تو شام پڑ چکی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہ دنیا خاک سے نہیں بلکہ رنگین روشنیوں سے بنی ہو۔

(۲)

تماشے کی تلاش مسافر کو ایک برفستان میں لے گئی۔ ہر طرف برف ہی برف جیسے یہ دنیا خاک سے نہیں برف سے بنی ہو۔ ہوائی جہاز گھنٹوں برف پر پرواز کرتا رہا اور جب اترا تو برف پر اترا۔ سواریوں کو دیر تک اترنے کی اجازت نہ ملی۔ برف صاف کرنے کی مشینیں کندھا لگا کر برف کو پرے دھکیلتی رہیں تب کہیں آدھ گھنٹہ کے بعد بس کو سیڑھیوں

کے پاس آنے کا راستہ ملا۔ جہاز کے زینہ سے بس کے پائیدان تک جو ذرا سا فاصلہ ہے اسے طے کرتے ہوئے مسافر کو پشکن یاد آرہا ہے۔ اس نے کہا تھا' میں تر سے بے رحم موسم سرما سے پیار کرتا ہوں' یہ منجمد ہوائیں' یہ تند و تلخ ژالے یہ ترشرد یوں اور بے رحمیوں کی افزونی یہ بے رحم موسم سفیر کے گھر کے باہر ٹھہر جاتا ہے۔ ٹھٹھرے ہوئے نووارد اس کی گرم آغوش میں دبک جاتے ہیں۔ زار روس کے زمانہ میں یہ گھر ایک نانبائی کی داشتہ کا گھر تھا۔ مسافر کو پالیولوگ کی ڈائری کا ایک اندراج یاد آیا۔ وہ آخری زار کے آخری دنوں میں فرانس کا سفیر تھا۔ زار قید خانہ کی سیڑھیوں پر پڑی ہوئی برف صاف کر رہا تھا کسی دیکھنے والے نے کہا جب اگلے برس برف پڑے گی تو اسے کون صاف کریگا۔

وقت کی برف بھلا کون صاف کر سکتا ہے۔ وہ سال بہ سال تہ بہ تہ پڑتی رہی اور بہت کچھ اس کے نیچے دب گیا' زار بھی اور لینن گراڈ کے لاتعداد باشندے بھی۔ پالیولوگ اور تانیہ کی ڈائریاں البتہ اس کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ مسافر جہاں جاتا ہے ان کا کوئی نہ کوئی ورق اس کی آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے خواہ وہ کوہ قاف سے آنے والے فنکاروں کا تماشا ہو یا مشہور عالم سرکس۔ تماشا پیپلز کانگرس ہال میں ہو رہا ہے جہاں چند دن پہلے پچیسویں کانگرس ہو رہی تھی۔ یہ ہال کریملن میں واقع ہے۔ مگر اسے خالی نہیں رکھتے استعمال میں لاتے ہیں۔ مغربی پاکستان اسمبلی کے برآمدہ میں ایک بار ادبی محفل ہوئی تو اسے ایوان کی توہین سمجھا گیا۔ باعمل اور بے عمل لوگوں کے یہاں توہین کا تصور مختلف ہوتا ہے اس کے لئے ان کی تاریخ بھی مختلف ہوتی ہے۔ اسمبلی ہال خالی پڑا رہتا ہے۔ خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ تاریخ کے صفحات خالی رہ گئے ہیں۔ انہیں بہتر آدمی آکر پر کرینگے۔ جارجیا کے طائفہ کا تماشا جاری ہے۔ کوہ قاف کے ساز ڈھول اور نفیریوں سے ملتے ہیں۔

ان کے ناچ خشک اور لڈی کی طرح ہیں ۔ ان کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے شلوار قمیص اور دوا سکٹ سے قریب ہیں ۔ فرق ہے تو صورت شکل کا ۔ اس سلسلہ میں کوہ قاف کی جو شہرت ہے وہ جائز ہے ۔ سرکس میں آج دو کہنہ مشق اپنا اپنا کمال دکھا رہے ہیں ۔ ایک بوڑھا آیا اور تالیوں کی گونج میں اپنے کام پر لگ گیا ۔ اس کا کام ذرا سا ہے بس فرش پر لیٹ جاؤ اور دونو ٹانگیں جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھاؤ ۔ اس کا کام ختم ہو گیا ۔ ایک شخص آیا اور اس نے مالیف کے پیروں پر سیڑھی رکھ دی ۔ اتنے میں مالیف کے چار بچے آئے جو پختہ عمر کے مرد عورت ہیں اور اس سیڑھی پر چڑھ گئے ۔ سیڑھی ہوا میں معلق ہے ۔ جس کے پیروں پر دھری ہے اس کا منہ سرخ ہے ۔ تماشائی ناخلف اولاد کی اس حرکت اور بوڑھے باپ کے حوصلہ کی داد تالیوں سے دے رہے ہیں ۔ وہ بوڑھا جس کی ٹانگیں فضا میں لٹکی ہوئی ہیں ان ٹانگوں پر ایک پوری نسل کا بوجھ اٹھائے ہوتے ہے ۔ تماشا جاری ہے ۔ ٹانگیں دیر سے ہوا میں بلند ہیں جیسے آسمانوں کو سہارا دے رہی ہوں ۔ اب دوسرا بوڑھا داخل ہوا ۔ یہ مشہور مسخرہ پاپوف ہے جو اس وقت دندان ساز کے بہروپ میں ہے ۔ مریض کو کرسی سے باندھا، اس کا منہ کھولا اور ایک تار جبڑے سے باندھ دیا ۔ تار کا دوسرا سرا زمین پر رکھے ہوئے چھوٹے سے راکٹ سے جوڑ دیا ۔ راکٹ کو دیا سلائی دکھائی ۔ شعلہ نکلا دھاکہ ہوا اور دھواں پھیل گیا ۔ راکٹ اڑا اور سرکس کی بلند چھت پر لگے ہوئے جھولے کے پاس جا کر پھٹ گیا ۔ ایک چھوٹا سا پیراشوٹ برآمد ہوا ۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے آ رہا ہے ۔ اس کے ساتھ ایک دانت بندھا ہوا ہے ۔ بس ہاتھی دانت سے ذرا چھوٹا ۔ ترقی کی دوڑ میں سب کو ہم قدم ہونا چاہیئے، کیا سائنس کیا فن اور کیا مسخرہ پن ۔

مسافر پسکاریو کے قبرستان میں بنی ہوئی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں کھڑا

ہے۔ اس قبرستان میں لینن گراڈ کے نو سو دن کے محاصرہ میں کام آنے والوں کی آدھی پوری لاشیں کھاد کے گڑھے میں بھرے جانے والے کوڑا کرکٹ کی طرح اجتماعی قبروں میں دفن ہیں۔ اس کوٹھڑی میں تانیہ کی ڈائری رکھی ہوئی ہے۔ پارہ صفر سینٹی گریڈ سے دس پندرہ درجہ نیچے ہے۔ قبرستان برف سے ڈھکا ہوا ہے بس ایک شعلہ ہے جو ان سب قبروں کا اکلوتا چراغ ہے۔ ایک تحریر ہے جو اس سے بھی زیادہ روشن ہے اور ان سب قبروں کا اکلوتا کتبہ ہے: ہم بھولنے والے نہیں / ہمیں یاد سب ہے ذرا ذرا / ہر فرد اور ساری واردات۔ تانیہ ایک کم سن بچی ہے جسے یہ معلوم نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کیوں ہو رہی ہے اور کب ختم ہوگی۔ اسے صرف یہ معلوم ہے کہ فاقہ اور بیماری، برف باری اور بمباری کی وجہ سے اس کا بھرا گھر خالی ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے ڈائری میں ہر چند صفحات کے بعد کسی نہ کسی عزیز کی موت کا اندراج کیا ہوا ہے۔ وقفہ وقفہ کے بعد ایک ایک کر کے سارے رشتہ دار رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایک اندراج کے مطابق دس سالہ تانیہ گھر میں تنہا زندہ رہ جاتی ہے۔ پھر وہ بھی مر جاتی ہے۔ اس کا ملک نیورمبرگ میں اس کی موت کا اندراج کرانے کے لئے اس ڈائری کو شہادت کے طور پر عدالت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ پسکاریو کے قبرستان میں اس ڈائری کے اوراق اور اندراج جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ اس قطعہ کی آبادی بڑے بڑے شہروں سے زیادہ ہے جتنی لاشیں یہاں ایک دوسرے پر رکھی ہیں اتنی منزلیں بڑی بڑی عمارتوں میں بھی کم ہوتی ہیں۔ اس ذرا سے احاطہ میں نصف ملین انسان دفن ہیں۔ پانچ لاکھ سر جو سوچ رکھتے تھے، پانچ لاکھ دل جو محبت کرتے تھے، دس لاکھ آنکھیں جو سب کچھ دیکھتی رہیں اور بند ہو گئیں۔ مسافر کو جھرجھری آئی۔ اس کا ہرگز کوئی تعلق نقطہ انجماد سے نہیں ہے۔

مسافر وانگا گراڈ کے افلاک نما میں بیٹھا ہے۔ اس شہر کا نام کبھی سٹالن گراڈ

ہوا کرتا تھا۔ اس زمانہ کی ایک اصل دستاویزی فلم دکھائی جا رہی ہے۔ کیمرہ اپنا کام کر رہا ہے اور بالکل غیر جانبدار ہے۔ اسے یہ غرض نہیں کہ فتح کس کی ہوگی۔ وقت کی دھوپ چھاؤں کا اس کے کام پر صرف اتنا اثر پڑتا ہے کہ سایہ میں کھینچی ہوئی تصویریں سیاہی مائل ہوتی ہیں اور روشنی میں لی ہوئی روشن ہوتی ہیں۔ ایک بجھا بجھا سا منظر دو فروری ۱۹۴۳ء کا ہے۔ نوے ہزار فوجی ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ ان کا کمانڈر فیلڈ مارشل پالس جس تہ خانہ سے نکل رہا ہے وہ مسافر کے ہوٹل کے کمرے سے ملحق دیپارٹمنٹل سٹور میں واقع ہے۔ رات بھر مسافر کی اچاٹ آنکھیں کمرے کے اندھیرے میں گھورتی رہیں۔ اسے بھی نوے ہزار قیدی یاد آرہے ہیں۔ یہ وہ جرمن قیدی نہیں جو گھر سے فاتحانہ چلے اور والگا کے کنارے تک پہنچ گئے۔ یہ وہ ہیں جو اپنے ہی گھر میں گرفتار ہو گئے۔

موٹر ماما یو پہاڑی کے دامن میں کھڑی ہے۔ اس پہاڑی پر فتح کی یادگار بنی ہوتی ہے۔ یہ ایک عورت کا دیو قامت مجسمہ ہے۔ مخالف فوجیں اس کی ڈھلانوں پر مورچے بنا کر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ چوٹی کے لئے ہر روز لڑائی ہوتی۔ کبھی ان کا قبضہ کبھی ان کا۔ جنگ کے بعد اس ٹیلہ کے ہر مربع گز میں بموں اور گولیوں کے بارہ سو سے زیادہ ٹکڑے بکھر ہوتے تھے۔ یہ حساب لگانا زیادہ مشکل نہ ہوگا کہ اس کے ہر مربع انچ میں خون کی کتنی مقدار جذب ہے۔ کشادہ اور زرم خیز سیڑھیاں پہاڑی پر چڑھ رہی ہیں۔ ہر دس قدم پر دم لینے کے لئے ہموار ہو جاتی ہیں۔ راہ میں ایک جگہ سفیدہ کے درخت سپاہیوں کی طرح دو رویہ کھڑے ہیں۔ اس کے بعد موت سے مقابلہ کے عنوان ایک مجسمہ بنا ہوا ہے اور ذرا آگے دو رویہ کھنڈرات بنا کر کسی نے جنگ کے مصائب کی نشاں گذاری کی ہے۔ جنگ کے دوران سٹالن گراڈ میں جو عام شور و غل تھا اس کے ریکارڈ ان کھنڈرات کے پس منظر میں چھپے

ہوتے لاؤڈ سپیکروں پر نشر ہو رہے ہیں۔ پینتیس برس پہلے کی آوازیں کتنی مانوس معلوم ہوتی ہیں۔ توپوں کی گھن گرج، گولیوں کی بوچھاڑ، ریڈیو کے لمحہ بہ لمحہ اعلانات، وائرلیس پر فوجی احکامات، زخمیوں کی چیخ پکار اور مرنے والوں کی خاموشی۔ امن کی پرسکون جھیل کے بعد ایک مورچہ نما عمارت میں مرنے والوں کے نام سنہرے حروف میں لکھے ہوتے ہیں۔ پہاڑی کے اس حصہ پر ایک غم زدہ ماں اپنے سپاہی لڑکے کی لاش پر جھکی ہے۔ مجسمہ ساز نے سپاہی کے منہ پر چادر ڈال دی ہے تاکہ پسماندگان کو اس کے نیچے وہی چہرہ نظر آئے جو وہ تصور میں اپنے ہمراہ لائے ہیں۔

پہاڑی کی چوٹی آگئی۔ یہاں ایک وسیع سبزہ زار کے وسط میں سنگی پائدان پر ایک قدآور عورت کا مجسمہ نصب ہے۔ لیکن یہ عورت پابہ گل گڑے ہوئے جامد مجسمہ کی صورت نہیں ہے۔ اس کا بایاں پیر آگے ہے۔ دایاں پیچھے اور اٹھنے والا ہے۔ ایک ہاتھ شانہ سے انگلیوں تک سیدھا کھلا ہے جیسے کسی سمت اشارہ کر رہا ہو۔ دوسرا بلند ہے اور اس میں ایک شمشیر بے نیام ہے۔ چہرہ ایک طرف مڑا ہوا ہے اور اس پر غصیلے عزم کے نقوش ابھرے ہوئے ہیں۔ اس کے بال بکھرے ہیں۔ پلو ہوا میں لہرا رہا ہے۔ ٹانگیں اور سینہ عریاں ہے۔ اسے چادر کا دھیان کہاں۔ اس کا دھیان حملہ آور کی طرف لگا ہوا ہے۔ یہ بپھری ہوئی مادر وطن کا مجسمہ ہے۔ اس عورت کا قد مینار پاکستان سے اونچا ہے اس کا ذرا سا پلو جو شانہ سے اڑ کر ہوا میں معلق ہے اس کا وزن ڈھائی سو ٹن ہے۔ اس قدآور عورت کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ دستہ سے نوک تک کوئی سو فٹ کی ہوگی۔ اسی لئے وہ آسمان کے اندر پیوست لگتی ہے جو اس کے گھاؤ سے نیلا پڑ گیا ہے۔ نوجوان میئر نے جو سٹالن گراڈ کی لڑائی کے وقت پرائمری میں پڑھتے تھے مسافر سے کہا کہ اس مجسّمہ کو

فلڈ لائٹ میں ضرور دیکھیں۔ ہر روز رات کو دیر تک تیز بجلی سے اس کی نور افشانی کی جاتی ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مسافر دوبارہ ماما یو پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے۔ بجلی والا وقت سے پہلے بجلی بجھا کر لاپتہ ہو گیا۔ میزبان اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ مسافر سبزہ زار پر لیٹ جاتا ہے۔ آسمان پر پہلے ہفتہ کے چاند کی ادھ جلی لالٹین لٹکی ہوئی ہے۔ اس کی مدہم روشنی میں یہ مجسمہ بہت دلکش لگتا ہے۔ ایسی دلکشی میں وقت اور رفتار کا احساس جاتا رہتا ہے۔ سوائے چاند کے ہر شے ساکت ہو گئی ہے۔ چاند جو ابھی اس باوقار عورت کے چہرہ کا ہالہ بنا ہوا تھا دیکھتے ہی دیکھتے مجسمہ کے شانہ پر تھکے پرندے کی طرح آن بیٹھا۔ لمحہ بھر بھی نہیں گذرا کہ چاند اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی کھلی ہتھیلی پر رکھا ہوا نظر آیا۔ اور اب اس لمحہ یہ تلوار کی نوک پر ہے۔ دفعتاً کسی نے بجلی جلا دی ہزاروں واٹ کے بلب یکدم جل اٹھے تیز روشنی کا سیلاب اچانک آ گیا۔ آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ مجسمہ پر چاروں طرف سے روشنی کی یلغار ہو گئی۔ سورج سوا نیزہ پر آ گیا ہے۔ جیسے کہیں جنگ چھڑ گئی ہو۔ مسافر کا خواب پریشان ہو گیا۔ جنگ کرنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہر ملک میں ایک مادر وطن ہوتی ہے اور تانیہ کی ہم عمر بیشمار ننھی ننھی پیاری پیاری بچیاں۔ اگر یہ تلوار اٹھالے اور وہ ڈائری لکھنا شروع کر دیں تو کل کیا کہے گی۔

مسافر کمبوڈیا کے مشرقی صوبے کے صدر مقام میں دریا کے کنارے کھڑا ہے۔

ویٹ نام کی جنگ زوروں پر ہے۔ یہاں سے پچیس میل کے فاصلہ پر ویٹ کانگ گوریلے موجود ہیں اور وہاں سے لیکر بحر جنوبی چین تک میدان کارزار گرم ہے۔ لیکن مسافر کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ جب مسافر گھٹنوں کے بل چلنے کے بجائے پیروں پر کھڑا ہوا تو عالمی معاشی بحران آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی ملک منہ کے بل گر پڑے۔ لرڈ کپن کی

شوخیوں کا وقت آیا تو دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جوانی کی رومانی سرحد پر کھڑے ہوئے تو فسادات اور ہجرت کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ آئینی تحفظات کے تحت ملازمت شروع کی تو آئین خزاں کے پتوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگے۔ ہر طرف جنگ آزادی شروع ہو گئی۔ کوریا اور ویت نام کی جنگوں کے درمیانی وقفہ میں ساٹھ ملک آزاد ہو گئے۔ ساری آزادیاں خون میں نہائی ہوئی تھیں لیکن لوگوں کی پیاس کم نہ ہوئی اس لئے داخلی جنگیں اور انقلابی جنگیں شروع ہو گئیں۔ جنگ زرگری ان کے علاوہ تھی۔ تاکیو کی اس قصباتی بستی میں مسافر ایک نتیجہ پر پہنچا ہے۔ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے۔ ساری راہیں میدان جنگ کی طرف جاتی ہیں۔ ہر سنگ میل انقلاب کی منزل ہے۔ ہر آبادی ایک پکی ہوئی کھیتی ہے، اسے کاٹنے والے منڈیر پر تیار کھڑے ہیں۔

سپاٹ سنسان میدانی علاقہ میں چھوٹی سی مرمت طلب سڑک راہ میں پڑی ہوئی رسی کی طرح لگتی ہے علاقہ بنجر ہے۔ قد آدم بلندی سے دیکھیں تو نظر بہت دور تک کام کرتی ہے۔ ذرا سا اور بلند ہو جائیں تو میلوں کی خبر لے آئیں۔ لیکن جہاں کوئی خبر نہ ہو وہاں سے کوئی کیا خبر لا سکتا ہے۔ میلوں تک نہ کوئی گھر نہ بستی، نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ موٹر خراب ہو جائے تو دنوں کسی کو خبر تک نہ ہو گی۔ ڈرائیور اسی لئے ہچکچا رہا تھا۔ انعام کا لالچ اسے اس ویرانہ میں لے آیا ہے۔ مسافر کے پاس ہر چہ بادا باد کی موجی کیفیت کے علاوہ زاد راہ میں دو سینڈوچ اور تھرماس میں دو گھونٹ چائے موجود ہے۔ سفر سہانوک ویل کا ہے جہاں لوگ نوم پن سے سیدھے جرنیلی سڑک کے ذریعہ جاتے ہیں۔ یہ الٹا راستہ کوئی استعمال نہیں کرتا۔ غیر آباد غیر محفوظ اور طویل۔ وسوسوں کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ مسافر نے موٹر کا شیشہ نیچے کیا، گرم مرطوب ہوا کے لمبے سانس لیے اور گہری سوچ میں کھو گیا۔ وسوسوں نے شکار کو مصروف پایا

تو الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ وسوسوں کے حملہ کی کامیابی کے لئے کچھ شرائط ہوتی ہیں۔ وقت جو بے مصرف ہو' ذہن جو خالی ہو' دل جو بے یقین ہو۔

سہانوک ویل آگیا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ پہاڑیاں تراش کر ایک چھوٹی سی بستی بسانے کی کوشش کا ابتدائی مرحلہ ہے۔ پانی میں دیوار کھینچ کر ایک لنگر گاہ بنا رہے ہیں۔ سمندر میں ایک چھوٹا اور پرانا سا جہاز کھڑا ہے۔ جہاز رانوں کی آنکھیں چھوٹی رنگ پیلا اور چہرے گول ہیں۔ دس منٹ میں تمام شہر اور اس کے مضافات کی سیر ختم ہو گئی۔ پوچھنے والے نے پوچھا' کیا آپ اس دیدار کے لئے اتنی دور چل کر آئے ہیں۔ جواب دینے والے نے جواب دیا' کچھ سفر منزل کے لئے نہیں راستہ کے لئے کئے جاتے ہیں۔ ڈرائیور نے کہا شہر کے دوسری طرف شہزادے کا بنگلہ ہے واپس جاتے ہوئے اسے بھی دیکھ لیجئے گا۔ ایک خصوصی سڑک خوبصورت ساحل پر جا نکلی۔ اس کے ساتھ دور تک ایک باغیچہ کی پٹی چلی جاتی ہے۔ دوسرے سرے پر زمین کا ایک ٹکڑا کچھ دور سمندر کے اندر چلا گیا ہے۔ اس قطعہ پر ایک بنگلہ بنا ہوا ہے۔ عمارت دو طرف سے سمندر میں گھری ہوئی ہے۔ لہریں ایک جانب بڑی نرم خیز اور دوسری جانب بڑی قیامت خیز ہیں۔ بنگلہ سنگ سیاہ خشت روغنی اور شیشہ کریستال کا بنا ہوا ہے۔ لکڑی جہاں کہیں نظر آتی ہے منقش ہے' دھات جہاں کہیں لگی ہے کندن ہے' فرش جہاں کہیں بچھا ہے ریشمی ہے۔ اس عمارت کی بنیاد بادشاہت پر ہے جو پرانے زمانہ کی سب سے پائدار اور نئے زمانہ کی سب سے کمزور بنیاد ہے۔ بادشاہوں کو تعمیر کا شوق ہوتا ہے وہ نئی نئی عمارتیں بنانے کی غلطی کرتے رہتے ہیں اور تاریخ ہر بار ان کی اصلاح یوں کرتی ہے کہ محلات سے ایک دن رہائش گاہ سو دن عجائب خانہ اور ہزار دن عبرت سرا کا کام لیتی ہے۔

نوم پن کے محل میں ایک مادر ملکہ اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ رہتی ہے۔ بیٹا ملک چلاتا ہے اور اس معمولی کام سے اسے اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ وہ کئی ساز بجاتا، آرکسٹرا کے لئے دھنیں بناتا، اوپیرا تالیف کرتا اور شاعری تصنیف کرتا ہے۔ بیٹی ملک کے شاہی اور اکلوتے اوپیرا کی خاتون اول ہے۔ وہ انگلیوں سے بھی لمبے ناخون لگا، چہرے پر قرمزمل، دنبالہ چشم کو کانوں تک کھینچ، سر پر سات منزلہ سنہری مخروطی ٹوپی سجا، جھل مل کپڑے پہن، ننگے پاؤں ناچتی ہے۔ مسافر نے یہ شاہی تماشہ بالکل اوپری بات سمجھ کر اور گھنٹہ بھر پہلو بدل بدل کر دیکھا۔ کئی فن ایسے ہیں جن کا علم نہ رکھنے کے باوجود وہ ان سے خوب لطف اندوز ہوتا ہے۔ اوپیرا اس فہرست میں شامل نہیں۔ اس بے لطفی کی کسر شاہی محل کے اس کمرہ میں پوری ہو گئی جہاں مہمانان خصوصی کی تصویریں لگی ہیں۔ اس محل میں اب تک قیام کرنے والوں میں سب سے ممتاز شخصیت برطانوی ہند کی ایک معمولی دیسی ریاست کے راجہ کی ہے۔ راجہ والی تصویر میں ہاتھی جھول پہنے ہیں اور مردوں کا لباس اور زیور اوپیرا کے سوانگ بھرنے والوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس محل میں آنے والے دور کی کوئی تصویر نظر نہیں آتی۔ کل جمال ہم نشیں اثر دکھلائے گا۔ مہمان فوج در فوج اس نیم خفتہ شہر میں داخل ہوں گے۔ سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

نوم پن میں چند روز قیام کے بعد پھر سفر کی خواہش جاگی۔ یہ کیفیت مسافر پر اکثر گذری ہے کہ وہ سفر میں ہے اور سفر کی خواہش اسے سفر در سفر پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اس تہ دار سفر کی لذت سے آشنا ہے جس کا سرا تلاش کرنے پر بھی ہاتھ نہ آئے۔ آج اس کا رخ نوم پن سے مغرب کی جانب ہے اور منزل آنکور وات کے مشہور زمانہ کھنڈرات ہیں جو کمبوڈیا کے دوسرے سرے پر تھائی لینڈ کی سرحد کے نزدیک واقع ہیں۔ نقشہ دیکھا۔ سڑک دریا کے کنارے

جاتی ہے اور ٹونلے ساپ کی جھیل کا چکر لگا کر جب دوسری طرف پہنچتی ہے تو سیم ریپ کا شہر آتا ہے۔ اس شہر کے گرد جنگل ہے جس میں کھنڈرات واقع ہیں۔ ہزپچاس میل پر نقشہ میں ایک بستی نظر آتی ہے۔ سوچا ناشتہ یہاں کر لیتے ہیں ناہار راستہ میں کھائیں گے اور رات کا کھانا سیم ریپ کے شاہی مہمان خانہ میں ملے گا۔ یہ کوئی پہلی بار نہ تھی کہ من در چہ خیالم وفلک در چہ خیال۔ سفر شروع ہوا۔ دارالسلطنت سے ذرا باہر نکلے تو سڑک دغا دے گئی۔ دو رویہ پکی سڑک کی جگہ ایک رویہ سڑک آئی۔ چند میل کے بعد وہ بھی ساتھ چھوڑ گئی اور اینٹوں کی ناہموار سڑک آگئی۔ پھر کفایت شعاری کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا اور سڑک کی جگہ اینٹوں کی دو پتلی پٹیاں رہ گئیں۔ ان پر چلنا دشوار کہ جابجا اینٹیں اکھڑی ہوئی ہیں اور نیچے اترنا ناممکن کہ موٹر کا پیندا زمین سے لگ جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر نقشہ بھی دغا دے گیا۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ ہر چند میل کے بعد بستی کا نشان کسی بے وفا کا وعدہ نکلا۔ بستی ابھی تک ایک بھی نہیں آئی۔ کھیتوں میں اکا دکا جھونپڑیاں بانسوں کی مچان پر کھڑی نظر آتی ہیں۔ یہ سرزمین ساون میں بھیگی اور پانی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ زندگی مچان پر بیٹھی ہے۔ نیچے اترتی ہے تو کشتی کی طرح اس کے پتوار آہستہ آہستہ چلتے ہیں یا بڑے سینگوں کو سر پر تراز وکیے بھینسے کی طرح سنبھل سنبھل کر کیچڑ میں قدم رکھتی ہے۔ ٹونلے ساپ جھیل نہیں ایک داخلی سمندر ہے۔ کنارے سکڑ جائیں تو ان کے نیچے سے صرف دلدل برآمد ہوتی ہے۔

ٹونلے ساپ کی دلدل دیکھ کر مسافر کا دھیان بٹ گیا۔ اسے بوڈاپسٹ یاد آیا۔ بوڈا کے معنی پانی اور پسٹ آگ کو کہتے ہیں۔ آب و آتش کے اس جڑواں شہر نے بڑا زمانہ دیکھا ہے۔ پلوں کے نیچے سے بہتا ہوا پانی اور پانی میں لگنے والی آگ۔ مسافر ایک کھنڈر سے

دوسرے کھنڈر ایک گرجا سے دوسرے گرجا اور ایک مجسمہ سے دوسرے مجسمہ کا سفر کر رہا ہے۔ طرح طرح کی داستانیں سُن رہا ہے۔ پہاڑی پر ایک پادری کا مجسمہ ہے۔ جس زمانہ میں داتا گنج بخش لاہور آئے یہ پادری بوڈاپسٹ گیا۔ تبلیغ میں مصروف ہوا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لوگوں نے پادری کو ایک پیپہ میں بند کیا اور اسے پہاڑی کی ڈھلوان پر چھوڑ دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا دریائے ڈینوب میں جا گرا۔ جہاں سے پیپہ اپنے آخری سفر پر چلا تھا وہاں اب یہ مجسمہ بنا ہوا ہے۔ ایک اور مجسمہ دیکھا۔ ایک شہسوار بڑے طمطراق سے سینہ پُھلائے ہوئے گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کی کہانی دریافت کی۔ گائیڈ نے کہا۔ یہ مجسمہ کسی اور شہر نے بنوایا تھا۔ ان کے پاس پیسے ختم ہو گئے اور یہ جانے بغیر کہ یہ کیا اور کیوں ہے اسے بوڈاپسٹ نے خرید لیا۔ امیر آدمی ہو کر امیر شہر وہ بلا وجہ اور جانے بوجھے بغیر خریداری کا شوق رکھتا ہے۔ عجائب گھر میں بہت سی تصویریں دیکھیں۔ ایک تصویر میں مصور تصویر پھاڑ رہا ہے۔ عنوان ہے غیر مطمئن۔ یہ تصویر فروخت کے لئے ہوتی تو مسافر اسے ایک شہرت یافتہ پاکستانی مصور کو تحفہ میں دیتا۔ ایک تصویر میں پُر تمکنت خاتون کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر لوگوں نے تعریف کی۔ گائیڈ نے کہا یہ تصویر نکولس بارا باس نے بنائی ہے مگر ایک صورت گر بروکے نامی ہے جس کی بنائی ہوئی صورتیں زندہ لگتی ہیں۔ یہ دیکھئے بروکے کی تصویر۔ لڑکیوں کے گالوں میں گلابی ڈورے تک بنائے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے گائیڈ کی طرف دیکھا اور صورت گر کے قائل ہو گئے۔ مسافر اس وقت ایک لینڈ اسکیپ دیکھ رہا تھا۔ ایک دلدل کی تصویر ہے۔ اس میں بھی زندگی کے آثار ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دلدل ابھی بہہ کر فریم سے باہر نکل آئے گی۔ اور ہوا بھی ایسا۔ دلدل بہہ کر کمبوڈیا میں ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئی۔ مسافر دیکھتا رہ گیا۔

وہ رات جسے سیم ریپ کے شاہی مہمان خانہ میں بسر کرنے کا خواب دیکھا تھا آدھی آنکھوں میں کٹ گئی۔ مسافروں کو بھوک لگ رہی ہے مگر نقشہ پر دیا ہوا ملک کا دوسرا بڑا شہر ابھی تک نہیں آیا۔ جب نوم پن ہی چھوٹا سا ہے تو شہر دوم میں آدھی رات کے وقت کھانا ملنے کی امید رکھنا ذرا خوش فہمی لگتی ہے۔ اس سڑک پر دن بھر میں ایک بس جاتی اور ایک آتی ہے یہاں رت جگا منانے والے بس کے اڈے اور ڈرائیوروں کے لئے ہر وقت کڑک قہوہ تیار رکھنے والے چائے خانے کہاں ہونگے۔ بالفرض محال کھانا ملا بھی تو کیا پتہ مچھلی اور انڈے نہ ہوں اور جو کچھ ہو وہ ناگفتنی اور ناخوردنی۔ انہی سوچوں میں باٹم بانگ آ گیا۔ جرنیلی سڑک دریا کے کنارے ہے۔ ٹمٹماتی روشنیوں میں لوگ سڑک اور دریا کے درمیان والی کہیں پختہ اور کہیں ناپختہ پٹی پر آرام اور اونگھ کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ ایسے ناوقت بدیسی چہروں کو لے کر آنے والی موٹر کی آواز سن کر مندی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ لیٹے ہوئے لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے جو کھڑے ہیں انہوں نے موٹر کو گھیر لیا ہے۔ اشاروں سے علیک سلیک ہوئی۔ سلام کا لفظ بھی استعمال ہوا۔ اس لفظ کو سنتے ہی ایک لڑکا آگے بڑھا اور بولا مسلم۔ قافلہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ آدھی رات کو سحر ہو گئی۔ وہ لڑکا موٹر میں بیٹھ گیا اور کئی محلے گذرنے اور گلیاں طے کرنے کے بعد ایک چوڑی سڑک پر واقع مکان کے سامنے اسے روک کر اندر آنے کا اشارہ کرنے لگا۔ مکان کے اندر داخل ہوئے تو کمرے میں بیٹھنے کے لئے بنچ اور کھانے کے لئے میز لگے ہوئے نظر آئے۔ دو چار ٹوٹی پھوٹی کرسیاں بھی رکھی ہیں۔ بیتے ہوئے سالوں کے مٹیالے کیلنڈر دیوار سے بھولی بسری یادوں کی طرح چپکے ہوئے ہیں۔ ایک طغرا اللہ کا اور دوسرا اس کے رسول کا آویزاں ہے۔ ان پر نگاہ پڑی تو نہ یہ ملک غیر رہا نہ یہ بستی دور افتادہ نہ یہاں کے لوگ اجنبی۔ ہر ملک ملک ماست۔

باہر کا دروازہ پھر کھلا اور کسی نے بھاری اور اونچی آواز میں کہا' السلام علیکم۔

اس کے ساتھ ہی ایک بوڑھا پٹھان اندر داخل ہوا خضابی ڈاڑھی سیاہ حلقوں میں دھنسی آنکھیں، ماتھے پر جھریاں۔ سر پہ ایک پرانی جناح کیپ ہے جس کے گھنگھریالے قراقلی بال جھڑ چکے ہیں اور سطح گھسے ہوئے پائدان کی طرح نکل آئی ہے۔ خانصاحب سے پتہ چلا کہ نصف صدی پہلے اس علاقہ میں پانی اور چارہ کی بہتات کی وجہ سے مویشی بہت ہوا کرتے تھے اور بدھ مت کے ہند چینی پیرو جانوروں کو ذبح کرنے اور گوشت اور کھال کی تجارت کو معیوب جانتے تھے۔ برعظیم سے چند مسلمان قصاب بلائے گئے جو سارے علاقہ میں پھیل گئے۔ ان میں سے بائی خاں سیام میں کروڑ پتی ہو گئے مگر اوروں کی خوشحالی کا دور مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔ زندہ مویشیوں کی برآمد بڑھ گئی ہے۔ خود کار مذبح خانے کھل گئے ہیں اور ہند چینی کے مقامی باشندوں کو جانوروں کے علاوہ اب انسانوں کو ذبح کرنے اور ان کی تجارت کرنے میں کوئی عار نہیں رہا۔ جو مسلمان قصاب تنہا ہند چینی پہنچے تھے ان کی تعداد وقت گذرنے کے ساتھ کم ہوتی چلی گئی۔ وقت کی دستبرد سے بچنے کے لئے دو چار نے مقامی عورتوں کا ہاتھ تھام لیا تھا بس ان کا نام و نشان باقی ہے۔ انہی لوگوں میں خانصاحب کے ایک دوست تھے جن کی شادی باٹم بانگ میں ہوئی اور دلہن کا اسلامی نام نور جہاں رکھا گیا۔ نور جہاں نے بیوہ ہو جانے کے بعد اپنے معاشرہ میں واپس جانے سے انکار کر دیا۔ دو کمروں کا گھر تھا' ایک کمرہ میں حلال گوشت کا مسلم ریستوران کھول لیا اور دوسرے میں نوجوان بچیوں کو لے کر پردہ میں بیٹھ گئی۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا تو مسافر نے اس عورت کی جھلک دیکھی جو بدھ مت کے سمندر میں ایک جزیرہ کی مانند ہے۔ اپنے جیسے خشکی کے دوسرے ٹکڑوں سے بہت دور اور الگ تھلگ مگر آس پاس کی سطح سے بلند بلکہ پہاڑی ہونے کی وجہ سے بہت بلند۔ باٹم بانگ کے خانصاحب بھی ایک جزیرہ

ہیں۔ آج مدت کے بعد ہم وطنوں کی ایک کشتی اس جزیرہ کے ساحل سے آن لگی ہے۔ وہ پروگرام پوچھ رہے ہیں تاکہ خدا حافظ کہنے کے لئے نوم پن آئیں۔ لاکھ منع کیا مگر مانتے ہی نہیں۔ یہ سر راہے نصف شب کے وقت گھنٹہ بھر کی ملاقات کی خاطر اپنا وقت اور پیسہ لٹانے اور اس بڑھاپے میں دو دن تک بس کے جھٹکے کھانے کیلئے مصر ہیں۔ کہتے ہیں ایوب کی بادشاہت کے بعد آج پہلی بار کسی پاکستانی کا چہرہ دیکھا ہے۔ اب اگلے دس سال زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔ باتیں کرتے ہوئے خانصاحب نے اپنی جناح کیپ اتار کر میز پر رکھی۔ مسافر نے موقع غنیمت جانا اور اپنی نئی جناح کیپ خانصاحب کو پہنا دی۔ نئی ٹوپی میں وہ دس سال چھوٹے نظر آنے لگے۔

اس مجمع الجزائر میں مسافر نے بہت سے جزیرے دیکھے ہیں۔ خانصاحب اور نورجہاں اور ڈاکٹر غلام حسین۔ ڈاکٹر صاحب سے اس کی ملاقات مکاؤ میں ہوئی تھی۔

(۳)

نیلے سمندر کی سطح پر گہرا سفید چیرا لگاتی اور ایک سیدھی لمبی لکیر کھینچتی ہوئی نئی ساخت کی دو منزلہ کشتی ہوا میں اڑتی اور پانی میں تیرتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اگلا حصہ پانی کی سطح سے بلند اور ہوا کے گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے ہے۔ پچھلا حصہ اتنا پانی اڑا رہا ہے کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ کشتی اس لمحہ کی مانند ہے جس دم کوئی سفید آبی پرندہ ہوا میں اڑا چاہتا ہو بس پاؤں پانی میں رہ گئے ہوں۔ تیز رو کشتی گھنٹہ بھر سے اس لمحہ کو تھامے ہوئے ہے یہاں تک کہ سامنے مکاؤ کا ساحل نظر آنے لگا۔ اس میں سو مسافر بھرے ہوئے ہیں۔ سارے کے سارے جلدی کے مارے ہیں ورنہ ہائیڈروفائل کے بجائے موٹر بوٹ سے سفر کرتے۔ سیاحوں کو جلدی ہے کہ مکاؤ کے مشہور کیسینو میں قسمت آزمائی کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت میسر آئے۔ تاجر شتابی کام ختم کر کے لوٹنا چاہتا ہے۔ پرتگالی جو ساڑھے چار سو

برس سے ٹھہرے ہوئے ہیں، اب وہ بھی جلدی میں ہیں۔ نہ جانے کس گھڑی مکاؤ سے کوچ کرنا پڑے۔ مسافر اور ہمراہی کو بھی جلدی ہے۔ انہیں رات کے آٹھ بجے ہانگ کانگ کے لنگر انداز ریستوران بر روئے آب میں ایک دعوت میں شریک ہونا ہے۔

مکاؤ میں داخلہ کا فارم بھرنا ہے اور مسافر کے پاس قلم نہیں۔ وہ قطار سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور قلم کی خاطر مسافروں اور ان کا استقبال کرنے والوں کی جیبوں پر نظریں لگا دیتا ہے۔ ایک قمیص کی جیب پکے پھوڑے کی طرح پھٹی پڑ رہی ہے۔ اس میں وہ ساری چیزیں موجود ہیں جن کے سہارے کوئی رابنسن کروسو دنیا سے بچھڑ جانے کے بعد ایک نئی دنیا بنا سکتا ہے۔ مسافر اس جیب کی طرف دیکھ رہا ہے اور صاحبِ جیب مسافر کو گھور رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ادھر سے قلم مانگا گیا ادھر سے نام پوچھا گیا۔ نام سنتے ہی اچھل پڑے۔ بولے میں ڈاکٹر غلام حسین ہوں۔ آپ کو لینے آیا ہوں۔ جی کونسل صاحب نے آپ کے لئے ہانگ کانگ سے فون کیا تھا۔ خود بول رہے تھے جی۔ آپ کوئی فکر نہ کریں بس خدمت کا موقع دیں۔ ایسا موقع روز روز کب آتا ہے۔ آج ہی واپس جا رہے ہیں۔ نہ نہ۔ یہ کیا بات ہوئی۔ او جی دو چار دن تو ٹھہریں۔ کم از کم آج کی رات تو یہیں ٹھہریں۔ جی کوئی ایسی ویسی جگہ نہیں مکاؤ ہے مکاؤ۔ آپ کو اور بہن جی کو پسند نہ آئے تو نام بدل دیں جی۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک سانس میں یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں اور یہاں پہنچ کر دم لینے کے لئے رُکے تو مسافر نے کہا، قلم عنایت ہو۔ جیب سے قلم نکالا، نب کو تھوک میں تر کیا، پھر دو چار بار جھٹک کر فرش پر اور قطار میں کھڑے لوگوں کے کپڑوں پر نقش و نگار بنائے اور پوری طرح تسلی کر لینے کے بعد قلم مسافر کو دیا۔ قلم نے لکھنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب گویا ہیں۔ آپ

کو فارم بھرنا پڑ گیا ہے۔ ہائے ہائے۔ آج البرٹو ڈیوٹی پر نہیں ورنہ مجال تھی کہ مجھے دیکھتے اور منہ زبانی اجازت نہ دے دیتے۔ یہ فارم وغیرہ سب بہانہ ہے۔ ورنہ یہ شہر تو کھلا شہر ہے جس کا جی چاہے آئے اور جب تک جی چاہے یہاں بیٹھا رہے۔ مجھے دیکھیے ایک بار آیا اور چالیس برس سے واپس نہیں گیا۔ بس جی کچھ نہ پوچھئے۔ ہائے ہائے کیا وقت تھا جو گذر گیا۔ اب تو اپنے ملک واپس جانے کو جی چاہتا ہے۔ بڈھی کو پاکستانی پاسپورٹ نہیں ملتا، چھ سال سے کوشش کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب خود کلامی میں مصروف ہیں مسافر فارم کے اندراجات مکمل کرنے میں مصروف ہے۔ اول نام وسطی نام آخر نام۔ ٹھوالاول وھوالآخر۔ گھر کا پتہ۔ گھر میرا نہ دلی نہ بخارا نہ بدخشاں۔ مکاؤ میں قیام کی مدت پرتگالیوں کے ہر ایک برس کے قیام کے بدلے صرف ایک منٹ۔ ساڑھے چار سو برس کے عوض ساڑھے سات گھنٹہ۔

فیری اسٹیشن سے فارغ ہو کر سڑک پر نکلے اور مسافر نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ہائے ہائے غضب ہو گیا۔ آپ نے ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ یہ کیا کیا آخر میں کس لیے ہوں۔ ان کے احتجاج کے دوران ٹیکسی آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف پیٹھ پھیر لی اور مقامی زبان میں بے رخی سے فرمایا۔ جاؤ نہیں چاہیئے۔ پھر پنجابی میں سمجھانے لگے کہ ان سے سیدھے منہ بات کرو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں اور کرایہ آسمان پر۔ ٹیکسی والا بھی ایسے گاہک کو پہچانتا ہے، وہ منہ پھیر کر سگریٹ سلگانے لگتا ہے جیسے اسے بھی سواریوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسے مخاطب کیا اور کہا آج میں کار کا بندوبست نہیں کر سکا کوئی ٹیکسی لینی پڑے گی۔ اچھا تم ہی سہی۔ بولو کیا لوگے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے پیادہ رو کے کنارے پر چلنا شروع کر دیا۔ ٹیکسی ان کے ساتھ سڑک کے کنارے

چل رہی ہے ٹیکسی والا کھڑکی سے سر باہر نکالے ان سے گفتگو کرتا جا رہا ہے۔ مسافر اور عذرا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بحث میں بہت سے علوم کو اپنی مدد کے لئے لے آئے ہیں منطق کا علم، رسد و طلب کا علم، شرح مبادلہ کا علم، ٹیکسی والوں کی عادات کا علم اور نفسیات کا علم۔ ٹیکسی والا انڈونیشی نوجوان ڈرائیور جو پڑھائی سے بھاگا ہوا تھا اتنے علوم کا سامنا کیونکر کرتا اسے شکست ہو گئی اور مسافر کو دن بھر کے لئے پرانی سیاہ مرسڈیز کرایہ پر مل گئی۔

گھنٹہ بھر گذرا ہوگا کہ مکاؤ ختم ہو گیا حالانکہ وہ شہر ہونے کے علاوہ پرتگال کا ایک صوبہ بھی ہے۔ اس مدت میں ٹیکسی نے پورے صوبے کے دو چکر لگائے، ایک طولاً دوسرا عرضاً۔ خیابان گرانڈ سے صرف ڈیڑھ میل کی نکلی، گورنر جنرل ہاؤس ایک چھوٹا سا بنگلہ ہے۔ بندرگاہ ذرا سا مچھلی بازار ہے۔ زیر تعمیر پل پر کام رکا ہوا ہے۔ چین کی سرحد پر آرائشی محراب کے نزدیک سوغاتیں بیچنے والوں کے چند کھوکھے لگے ہوئے ہیں۔ ناچار وقت گذاری کے لئے موٹر کو شہر کی سب سے اونچی پہاڑی پر روک لیا۔ پہاڑی کے نیچے ایک گنجان محلہ اور تنگ گلیاں ہیں۔ اس کے بعد کھاڑی کا ٹھہرا ہوا پانی ہے جس کے دوسرے کنارے کسی کمیون کی سبزیوں کے کھیت نظر آ رہے ہیں۔ پہاڑی کے اوپر ایک پرانے گرجا کے کھنڈرات ہیں۔ کچھ بنیادیں اور ایک دیوار۔ یہ دو منزلہ دیوار گرجا کا چہرہ ہے۔ پہلی منزل میں ایک بڑے اور دو چھوٹے دروازے مل کر تثلیث بناتے ہیں اور دوسری منزل میں یہ کام دریچوں سے لیا گیا ہے۔ اس بلندی پر ہوا بہت تیز چلتی ہے مگر کھلے در و دریچہ سے آر پار نکل جاتی ہے۔ نہ دروازے کے پٹ باقی ہیں نہ دریچہ کی چوکھٹ۔ کھلے منہ کھنڈر ہر شے بلا روک ٹوک نگل جاتا ہے۔ ہوا، صدیاں اور سیاح۔ مسافر نے پار جا کر ڈاکٹر صاحب سے فرمائش کی کہ ذرا اس کھنڈر کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوائیں۔ فرمانے لگے ہائے ہائے یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ تو

دیوار کی پشت ہے۔ سامنے کا حصہ دوسری طرف ہے۔ وہاں رنگین نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ تصویر لینی ہے تو صحیح رخ سے لیجئے۔ مسافر نے کہا' آپ کی رائے سر آنکھوں پر مگر کیمرے اور سول سروس کی مجبوریاں یکساں ہوتی ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ صحیح رُخ کونسا ہے۔ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ سورج کدھر سے چڑھتا ہے اور اس کی روشنی کہاں پڑتی ہے۔ اس بات کا لحاظ نہ رکھا جائے تو عکس اور عامل دونوں ماند پڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا ہائے ہائے۔ اور یہ بات اسی لائق تھی۔ تصویر کشی ختم ہوئی نظارہ بازی سے طبیعت سیر ہوئی مگر آئے ہوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھا اب کیا کیا جائے۔ جواب ملا' دہی جس کے لئے سب لوگ مکاؤ آتے ہیں۔ مسافر نے کہا قمار خانہ کے لئے پانچ گھنٹے بہت زیادہ ہیں۔ کیوں نہ آپ کا ہسپتال دیکھیں اور اس کے بعد آپ کے گھر چلیں ڈاکٹر صاحب کو جیسے برقی جھٹکا لگا۔ نہ جی نہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جی میرا گھر تو گجرانوالہ میں ہے۔ جی میں نے گجرانوالہ نہیں دیکھا ہوا۔ جی بات دراصل یہ ہے کہ جب میں بائیس برس کی عمر میں یہاں آیا تو رشتہ داروں کو مشرقی پنجاب میں چھوڑ کر آیا تھا۔ میرے ماموں یہاں ہومیوپیتھی کرتے تھے۔ میں نے بھی کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ پھر آنکھوں کی ڈاکٹری شروع کر دی' وہ چل نکلی۔ آنکھوں کے چھوٹے بڑے سارے آپریشن کر لیتا ہوں۔ تجربہ بڑی چیز ہے سب کچھ سکھا دیتا ہے۔ میری زندگی کا کیا پوچھنا۔ زیادہ تر اکیلے گذری۔ ماموں انتقال کر گئے اور ان کے بچے یہاں سے چلے گئے' میرا کوئی بچہ نہیں۔ میری عمر باسٹھ سال ہے۔ میں نے چھ سال ہوئے ایک چینی عورت سے شادی کی۔ بس میں ہوں اور میری بڈھی۔ میں نے اسے پاکستانی بنا دیا ہے۔ کچھ اردو پنجابی سکھا دی ہے مگر حکومت اس کو پاکستان کا پاسپورٹ نہیں دیتی۔ کونسل صاحب بڑی کوشش کر رہے ہیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ڈاکٹر صاحب مہمانوں کو نظروں میں تولتے رہے۔ وہ معیار پر پورے اترے تو یکدم بولے اچھا جو آپ کی مرضی چلیے گھر چلتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پہلے اشارہ کر چکے تھے کہ موٹر ان کے گھر تک نہیں جاتی اور وہ نہیں چاہتے کہ مہمانوں کو پیدل چلنا پڑے۔ اس وقت وہ گھر جانے سے انکاری تھے مگر اب سے جانے کے لئے تیار ہوئے ہیں تو مصر ہیں کہ موٹر وہاں تک ضرور جائے گی۔ ان کی دونوں باتیں درست نکلیں۔ راستہ تنگ ہوتا چلا گیا اور کئی بار ڈرائیور نے اتر کر اس کا معائنہ کیا۔ کہیں نالیاں گلی کے دونوں سروں پر ہیں اور کہیں اس کے وسط میں۔ فرش کہیں اینٹوں کا ہے اور کہیں پتھروں کا۔ موڑ سارے مشکل ہیں اور دو چار ایسے بیڈھب جہاں ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے راہگیروں کی مدد لینی پڑی۔ بالآخر گاڑی ایک تنگ موڑ کے بعد آنے والی کشادہ گلی میں ایک دکان کے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔ دکان پر چھوٹا سا سفید بورڈ لگا ہے جس پر سیاہ حروف سے لکھا ہے۔ ڈاکٹر جی۔ ایچ۔ گل ماہر امراض چشم و تجربہ کار سرجن۔ کہنہ مشق ڈاکٹر اور سرجن کی دکان میں ہر چیز کہنہ ہے۔ وہ آلات جراحی جن پر وقت کا زنگ چڑھ گیا ہے۔ وہ مریضہ جو آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے اور وہ نرس جو اس کے پاس کھڑی ہے۔ اگر تجربہ سے مراد سالخوردگی ہے تو یہ دکان ایک بہت بڑی تجربہ گاہ ہے۔ کچھ اسناد اور توصیفی سرٹیفکیٹ چوکھٹوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ کاغذ کی سفیدی ماند پڑ گئی ہے۔ حروف مدھم پڑ گئے ہیں۔ یہ اسناد اس سند سے زیادہ معتبر نظر آتی ہیں جسے مسافر نے ایک روز گوادر کے بڑے بازار کی کچی گلی میں کھجور سے لدے اونٹوں کے نزدیک زمین پر دری بچھا کر بیٹھے ہوئے ایک ڈاکٹر کے پاس دیکھا تھا۔ اس سند کی رو سے وہ ڈاکٹر صاحب تحصیل گجرانوالہ میڈیکل کالج کے گریجویٹ تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو گھورا اور ترش لہجے میں بولے، کھڑی منہ کیا دیکھ رہی

ہے۔ جا جلدی سے سوڈا پانی لا۔ ہاں پہلے کرسیاں صاف کر۔ وہ میری پڑھنے والی عینک دیکھنا کہاں رکھی ہے اور مجھے چابیوں کا گچھا نہیں مل رہا۔ نرس کھڑی مسکراتی رہی، اس نے ایک ہاتھ سے عینک اور دوسرے سے چابیاں پیش کیں۔ کرسیاں وہ مہمانوں کو دیکھتے ہی صاف کر چکی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ مسجد کمیٹی کے دفتر سے کئی بار فون آ چکا ہے۔ انجمن والے آپ سے کوئی ضروری مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سیف کے آگے اکڑوں بیٹھے مختلف چابیاں آزمانے اور جھنجھلانے میں مصروف ہیں۔ نرس نے مسجد کمیٹی کا پیغام دہرایا۔ غصہ میں بولے، سن لیا ہے۔ تیری طرح بہرا نہیں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو مصروف پا کر اور ان کی آنکھ بچا کر نرس عذرا کے قریب آ گئی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں راز کی بات کہہ دینے کا جو سلیقہ قدرت نے عورت کو دیا ہے اسے کام میں لاتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی بیوی ہے اور اس کا شوہر زبان کا کڑوا مگر دل کا بہت اچھا ہے۔ سیف کھلا اور اس میں سے چاندی کے چند پرانے سکے نکال کر انہوں نے عذرا کو تحفہ میں دیئے۔ بہن جی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ میرے گھر آئیں اور یہاں سے خالی ہاتھ جائیں۔ عذرا نے کہا یہ آپ کا ہسپتال ہے آپ مریضوں کو دیکھیں اور اپنی انجمن کی بات سنیں۔ جب آپ کے گھر چلیں گے تو پھر تحفہ تحائف کی بات کریں گے۔ ہنستے ہوئے بولے۔ یہی سب کچھ ہے، دکان بھی مکان بھی۔ پیچھے ایک کمرہ اور ہے۔ گلی باورچی خانہ ہے اور کمیٹی کا نلکا غسلخانہ۔

موٹر پہاڑی سڑک پر ایک جگہ رک گئی۔ یوں لگتا ہے جیسے تھوڑی دیر پہلے شہر کی سیر کرتے ہوئے اس جگہ سے گذرے تھے۔ اگر یہ بات درست ہے تو اس وقت ڈاکٹر صاحب نے مسجد کیوں نہیں دکھائی اور مکاؤ انجمن اسلامیہ کے ان اراکین سے کیوں نہ ملایا جو صبح سے یہاں جمع ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے سوچا ہوگا کہ سیاح یہاں قمار خانہ دیکھنے کے لیے آتے

ہیں نہ کہ مسجد۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ سڑک کے کنارے پرانی اونچی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہے جس کی پیشانی پر خط خفی میں مسلم مسجد مکاؤ لکھا ہوا ہے۔ مسافر پوچھتا ہے الفاظ اتنے چھوٹے کیوں ہیں۔ جواب ملتا ہے ہائے ہائے۔ کوئی ایسی ویسی مجبوری تھی۔ یہاں آدھے مسلمان ان پڑھ ہیں۔ اور باقی آدھے پڑھ سکتے ہیں مگر لکھنا نہیں جانتے۔ درانی انجینئر صاحب نے جیسا اپنے قلم سے لکھ دیا بس وہی پتھر پر کھدوالیا۔ دیوار کی دوسری طرف اجاڑ احاطہ میں ایک پارک، چند قبریں اور نو تعمیر مسجد واقع ہے۔ احاطہ کے دوسری جانب گہری کھڈ ہے اور اس کے بعد سمندر۔ مسجد کا افتتاح چند ہفتہ پہلے ہوا تھا۔ ایک کمرہ کی مسجد ایک کامن روم اور چھوٹا سا سٹور روم جس میں کفن دفن کا سامان رکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات سچ ہے گنجان کلمہ گو آبادیوں میں زندگی بسر کرنے والوں کو کیا خبر کہ جہاں گنتی کے چند مسلمان رہتے ہوں وہاں مردہ کیسے خراب ہوتا ہے۔ یہ سٹور روم مسلمان اقلیت کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوا تو بالخیر ہوگا۔ مسافر کو یاد آیا کہ چلتے ہوئے کونسل جنرل کی بیٹی نے کہا تھا' آپ کو مکاؤ میں مسلمانی درگور ملے گی۔ وہاں پچاس قبریں ہیں اور پندرہ افراد۔ مسافر جب وہاں پہنچا تو پاکستانی مسلمانوں کی تعداد گھٹ کر چودہ ہو چکی تھی۔ مسجد کے احاطہ میں تین سوگوار کھڑے ہیں اور دو بیلچہ لئے قبر کھود رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب انجمن اسلامیہ کی صدارت کے فرائض ادا کرنے کیلئے سوگواروں کی طرف چلے گئے جو صبح سے انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ مسافر اور عذرا مسجد میں داخل ہو گئے۔ ہر شے نئی نویلی' دیواروں پر بے داغ سفیدی' لکڑی پر چمکتا پالش' شیشہ صاف اور شفاف' دری کی صفیں دھلی دھلائی۔ چند نسخے قرآن مجید کے رکھے ہوئے ہیں اور کچھ تبلیغی پمفلٹ۔ مسجد کے باہر قبروں کے پاس جو لوگ کھڑے ہیں اب ان کی باتوں کی آواز یہاں تک آ رہی ہے۔

یہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ بلند ہوتی جارہی ہیں۔ اب یہ اتنی بلند ہو چکی ہیں کہ بلاشبہ باہر جھگڑا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ذرا کی ذرا میں آپے سے باہر ہو چکے ہیں۔ ایک منحنی نوجوان جو تھوڑی دیر پہلے بنیان پتلون پہنے قبر کھود رہا تھا قمیص اور جوتے پہن کر سامنے ڈٹا ہوا ہے۔ دو آدمی بیچ بچاؤ کر رہے ہیں۔ نوجوان چھوٹے قد اور دبلے جسم کا ہے۔ لڑنے کے لئے آواز اونچی کرتا ہے تو بے سرا ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پھیپھڑے یکایک جوان ہو گئے ہیں۔ وہ گرجتے اور کڑکتے تھک جاتے ہیں تو پھنکارنے لگتے ہیں۔ لڑائی ٹوٹی اردو اور پھوٹی انگریزی میں ہو رہی ہے۔ دلیل میں وزن پیدا کرنے کے لئے گزری ہوئی نسلوں کو پنجابی میں یاد کیا جا رہا ہے اور آنے والی نسلوں کا پرتگالی میں استقبال ہو رہا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہونا چاہتے ہیں مگر دوسرے اجازت نہیں دے رہے۔ لڑکا کہہ رہا ہے، یہ میری دادی کی قبر ہے اور یہیں بنے گی۔ ہم تم کو پیسہ کس بات کا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، مجھے پیسہ دینے والا کوئی مائی کا لال پیدا نہیں ہوا۔ پیسہ دینے والوں کی یہ صورت ہوتی ہے۔ تمہارے گھر والے جو انجمن کا چندہ دیتے تھے وہ بھی دو ماہ سے بند ہے۔ میں ہرگز اس جگہ قبر نہیں بننے دوں گا۔ لڑکے لڑکے کا مسکین باپ کہتا ہے، ہم تمہارے آنے سے پہلے کئی جگہ کوشش کر چکے ہیں۔ وہاں قبر یا ہیں یا چٹان ہیں۔ نرم اور صاف جگہ یہاں مسجد کے پاس ملی ہے۔ قبروں کی اس قطار میں ایک قبر اور سہی۔ ڈاکٹر صاحب چیخ چیخ کر نڈھال ہو گئے ہیں۔ نہ نہ کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ وہ تھک کر ایک قبر پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سانس پھولا ہوا ہے چہرہ سرخ ہے اور گلا خشک۔ زیرِ لب کہتے ہیں، یہاں میرے جیتے جی قبر نہیں بن سکتی۔ قبر کھودنے والا چینی مزدور بدستور کام میں لگا ہوا ہے۔

خاموشی کا وقفہ ختم ہوا لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی ہے۔ نیا گولہ بارود کہاں

سے آئے۔ بس ایک تکرار ہے سو دونوں اپنے اپنے جملے دُہرا رہے ہیں جیسے وہ صرف ریہرسل تھا اور یہ اصل لڑائی ہے۔ یہاں قبر نہیں بنے گی۔ روکے کون روکتا ہے۔ میں جو کہہ رہا ہوں۔ تم کون ہوتے ہو۔ مجھے نہیں جانتے میں کون ہوں (سینہ پر ہاتھ مار کر) جانتا ہوں، تمہاری خراب شہرت کو کون نہیں جانتا۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔ میرا نام غلام حسین ہے غلام حسین۔ تم بھی زبان سنبھال کر بات کرو میرا نام نو نو خاں ہے نو نو خاں۔ مسافر مسجد سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب اسے دیکھ کر سر پیٹ لیتے ہیں۔ ہائے ہائے برا ہو اس بڑھاپے کا۔ یہ کل کا چھوکرا میرے منہ لگ رہا ہے۔ نہ ہوئی جوانی ورنہ خون پی جاتا اس کا۔ ڈاکٹر صاحب نے رومال نکال کر پسینہ پونچھا۔ قمیص جو لڑائی کے دوران پتلون سے باہر نکل آئی تھی اسے واپس اندر ڈالا۔ جیب سے کنگھی نکال کر بالوں میں پھیری اور خاموشی سے مسافر کے ساتھ ہو لئے۔ دروازے پر رک کر بولے میں مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں خبردار جو تم نے میرا کہا نہ مانا' دگرنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ان لوگوں نے بات سنی ان سنی کر دی اور خاموشی سے قبر کھودتے رہے۔ موٹر میں بیٹھ کر ڈاکٹر صاحب نے کہا میں تو مرحومہ کے خیال سے چپ ہو رہا ورنہ ان کی کیا مجال تھی۔ وہ جو موٹا سا آدمی تھا، پہلے پولیس میں تھا اب پنشن لے کر چوکیداری کرتا ہے' وہ اس کی والدہ تھی۔ بڑی اچھی تھی۔ یہ نو نو خاں اس کا پوتا ہے۔ ہوٹل کے ٹیلیفون ایکسچینج میں کام کرتا ہے۔ مشن کی میموں نے اسے عیسائی بنا لیا ہے۔ تو پوچھو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دخل دینے کا کیا حق پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کئی بار زور لگا کر کھنکھارا اور یکدم ان کے گلے میں اٹکی ہوئی بلغم کی بڑی سی چپکی فش نڑپتی ہوئی باہر آ گئی۔ اس کے بعد چھوٹی بڑی مچھلیوں کی باری آئی۔ پانچ منٹ میں مچھی ہٹہ کھل گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سارا غصہ تھوک دیا۔ اگر کچھ غصہ باقی تھا تو وہ کوکا کولا کی تخ بوتل کے ساتھ پی گئے۔ تازہ ہوا کھائی اور سارا جھگڑا بھلا دیا۔ جیسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ بے شک اللہ

معاف کر دینے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مرسڈیز ٹیکسی صوبہ مکاؤ کی سب سے عالیشان عمارت میں داخل ہو گئی۔ یہ قمار خانہ ہے۔ زرد رنگ کی گول اور چھ سات منزلہ عمارت۔ ہر منزل پر ایک افقی خشتی پٹی عمارت کے گرد بنی ہوئی ہے جیسے اس نے کئی آرائشی کمربند باندھے ہوئے ہوں۔ ہر منزل پر دریچے بالکنی میں کھڑے سمندر کا نظارہ کر رہے ہیں۔ گنبد نما چھت پر ایک بڑا سا تیر بنا ہوا ہے۔ اس عمارت میں داخل ہونے والوں کا تیر نشانہ پر بیٹھتا ہے یا جگر کے پار ہو جاتا ہے۔ کیسینو میں داخل ہوئے تو دنیا اور اس کے موسم کو بدلا ہوا پایا۔ غربت اور مشغولیت کے بجائے فرصت اور فراغت کی دنیا۔ بھیڑ بھاڑ کی جگہ رونق اور موج میلہ کی دنیا۔ مکاؤ کی گندی سیلی بندرگاہ کی گھٹن اور گھٹن کی جگہ چلیلیوں سے گذر کر سرد خانہ سے آنے والی ٹھنڈی ستھری ہوا والی فضا۔ باہر کی دنیا سے یہ صرف اس حد تک ملتی ہے کہ وہ بھی گردش میں ہے اور یہ بھی یہاں ہر شے گردش میں ہے۔ میزوں پر چرخ قمار اور ان کے گرد کھیلنے والے۔ مسافر نے داخلے کے ٹکٹ کے لئے جیب سے رقم نکالنی چاہی معلوم ہوا کہ اس زیاں خانہ میں داخلہ مفت ہے۔ اس کے لئے عاقل اور بالغ ہونے یا قائمی ہوش و حواس کی بھی کوئی شرط نہیں۔ بس صاحب نصاب ہونا کافی ہے۔ لیکن اس نصاب کے لئے بیس مثقال سونا کافی نہیں۔ منقش اور بل دار مرمریں سیڑھیوں آراستہ استقبالی کمروں داخلی زینتی فواروں دھنک رنگ شیشوں آرائشی فانوسوں عریاں مجسموں اور ایک طویل راہرو سے ہوتے ہوئے مسافر ایک وسیع ہال میں جا نکلا۔ ہال کا سرسری جائزہ لیا۔ ترتیب فوراً سمجھ میں آگئی۔ اس گول ہال کا فرش ایک جھیل کی سطح ہے۔ لہروں کے دائرے سے بنے ہوئے ہیں۔ ایک دائرہ کے اندر دوسرا اور دوسرے کے اندر تیسرا۔ محیط پر کنارے کے ساتھ جو دائرہ ہے وہ ہلکی لہر کا ہے اس کے بعد ہر لہر پچھلی

لہر سے کئی گنا بڑی ہے۔ طوفان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہال کے وسط میں ایک ایسا بھنور آتا ہے گویا قیامت ہو۔

ہال کے گھیر کے ساتھ گیلری میں خودکار مشینیں لگی ہوئی ہیں معمولی اور عام جیسی جگہ جگہ ملتی ہیں۔ چھوٹا سا سکہ ڈالیے' اتنا حقیر جو اکثر جیبوں کو ٹٹولنے کے باوجود ہاتھ نہیں آتا' تو یہ مشین وزن کرے گی یا قسمت کا حال بتائے گی یا چاکلیٹ فروخت کرے گی کیسینو کا رعب اور خوف کم ہوا' بیگانگی کا احساس جاتا رہا۔ یہی اس لہر کا مقصد ہے جو جھیل کے کنارے پر اٹھتی ہے۔ تماشائی پایاب سمجھ کر پانی میں اترجاتا ہے۔ اس کے بعد لہریں بہاکر بھنور کی طرف لے جاتی ہیں۔ دوسرے حلقہ میں جو مشینیں رکھی ہیں وہ جوئے کے سیدھے اور آسان کھیل کے لئے ہیں۔ کم سے کم پانچ ڈالر کی شرط لگانی پڑتی ہے۔ اس سے اگلے حلقہ میں بیس ڈالر اور پھر سو ڈالر درکار ہیں۔ حلقہ تنگ ہوتا جاتا ہے اور شرط بدنے کی کمترین رقم بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہال کے وسط میں رکھی ہوئی میز پر ایک بار کھیلنے کے لئے کم از کم ایک ہزار ڈالر کی ضرورت ہوتی ہے اور کھیل ایسا ہے کہ پانچ منٹ میں ختم ہوجاتا ہے۔ گھنٹہ بھر کھیلنے کے لیے بڑی ہمت اور اس سے بڑی جائداد کی ضرورت پیش آتی ہے۔

قمار خانہ کی مرکزی میز پر کھیلنے والوں کا نان نفقہ اور آسائش کا انتظام کیسینو کے ذمہ ہوتا ہے۔ میز کے گرد میزبانی کے فرائض خوش باش اور خوش پوش مگر کم عمر اور کم پوش خواتین ادا کرتی ہیں۔ یہ بڑے حیلہ اور وسیلہ والے میزبان ہیں۔ ہر ایک کے لئے ان کی گرہ میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ متذبذب کے لئے لاسا اور ہارنے والے کے لئے دم دلاسہ۔ تماشائیوں کے لئے از سرتاپا تماشا اور جیتنے والوں کے لئے سراپا انعام۔ میزبان خاتون سیاحوں کی نئی ٹولی کو دیکھ کر آگے بڑھی۔ ایک تماشائی کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے میز کے کنارے کھینچ لائی۔ کہنے لگی یہ جہنم ہے،

لوگ یہاں جلنے کے لئے اپنی اپنی آگ اور اپنا اپنا ایندھن خود ساتھ لاتے ہیں۔ یہ پاکبازی کا دعوے کیا۔ یہاں منافقت کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیا اس عمارت کے باہر آپ نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا۔ ایک اور سہی۔ گناہ اور ثواب کو بھول جائیے۔ نفع اور نقصان کا خیال بھی جانے دیجئے۔ لطف اور مزے کی بات کیجئے۔ ذرا شرط لگا کر دیکھئے۔ جو لذت گناہ اس گناہ میں ہے کسی اور گناہ میں نہیں۔ اس سوچ کا لطف کہ شرط کس پر لگائیں۔ اس فکر کا لطف کہ شرط کتنی لگائیں۔ اس وسوسے کا لطف کہ جس پر نہیں لگائی اس پر لگانی چاہیئے تھی۔ انتظار اور آغاز کا لطف، دوران کا لطف اور اختتام کی مدہوشی۔ چرخ قمار گھومنا شروع کرے گا تو روزمرہ کی بے کیف زندگی میں منجمد ہو جانے والا خون گرم ہو کر پگھلنے لگے گا۔ اس کے ہر چکر کے ساتھ آپ جوان ہوتے چلے جائیں گے۔ آنکھیں روشن تر ہو جائیں گی۔ یہ میز سونے کا ڈھیر نظر آئے گی۔ یہ چرخ قمار کے گھومتے ہوئے کل پرزے سونے کے اس ڈھیر پر ناچتی ہوئی پریاں بن کر آپ کو باہوں میں لے بادلوں میں اڑ جائیں گی۔ اس کے بعد آپ کبھی زمین پہ واپس نہیں آئیں گے۔ چرخ تھم جائے گا مگر ایک بار کھیلنے کے بعد آپ کا شوق کبھی نہیں تھمے گا۔ آپ ہمیشہ شوق کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ یہ جہنم ہے۔

مسافر دوسرے حلقہ کی ایک میز کے گرد کھڑا تماشا دیکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین نے اپنا دہ بٹوہ نکالا جو صبح سے کئی بار جیب سے نکلا تھا مگر اس کے کھلنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ہانگ کانگ کے دس ڈالر کے نوٹ نکال کر بولے آپ لوگ بھی کیا کہیں گے کہ غلام حسین کیسینو گیا اور خالی چکر لگا کر واپس آ گیا۔ نہ جی نہ میں ایسا آدمی نہیں۔ روپیہ ہوتا کس لئے ہے۔ قبر میں تو ساتھ لے جانا نہیں۔ دس ڈالر کی شرط آپ مہمانوں کی طرف سے لگا رہا ہوں۔ مسافر نے کہا۔ بہت سے لوگ شرط لگا رہے ہیں۔ ہم ان کا تماشا دیکھ کر محظوظ ہو رہے ہیں آپ اپنی رقم

ہمارے لئے کیوں ضائع کرتے ہیں۔ آج کل تو وہ پائے چشم بھی نہیں اور لوگ انجمن اور مسجد کا چندہ بھی باقاعدگی سے نہیں دے رہے۔ یوں بھی مجھے اس کارروائی سے ذرا سا اصولی اختلاف ہے۔ بولے اچھا جی آپ خلاف ہی یہ لیجئے میں نے بسم اللہ کر کے شرط لگا دی، بہن جی کی خاطر۔ مسافر نے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ نوٹ میز کے اوپر بنے ہوئے ایک خانہ میں رکھ چکے تھے۔ مسافر کو ۱۹۶۰ء میں ہونے والی وہ گھڑ دوڑ یاد آنے لگی جس میں ملکہ ایلزبتھ دوم موجود تھی۔ یہ لاہور کی بات ہے۔ ماقبل آخر دوڑ ایک قبائلی سردار کے گھوڑے نے جیت لی۔ آخری دوڑ ملکہ کپ کے لئے تھی اور اس میں بھی ان کا گھوڑا دوڑ رہا تھا۔ دوڑ شروع ہونے سے پہلے وہ بے حد مضطرب تھے۔ مسافر باہر سے آیا اور خصوصی باکس میں اپنی مقررہ نشست پر ان کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔ سردار صاحب کہنے لگے' آپ نے تو مجھے پریشان کر دیا، اٹھ کر کہاں چلے گئے تھے؟ پچھلی دوڑ کے وقت آپ یہاں بیٹھے ہوئے تھے اور میں جیت گیا۔ ہم شگون لینے والے لوگ ہیں۔ ایک بار جیت جائیں تو وہی جیت والا نقشہ جما کر بڑی شرط لگانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ جو ہو سو ہو۔ گھڑ دوڑ ختم ہوئی اور ڈیرہ غازی خاں کے لغاری سردار ملکہ کپ اور بیس ہزار روپیہ جیت گئے۔

کیسینو کی جس شیشے کی میز کے گرد مسافر' عذرا اور ڈاکٹر صاحب کھڑے ہیں اس کے اوپر بارہ خانے بنے ہوئے اور ایک سے بارہ تک نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ لوگ اپنی پسند کے خانوں پر شرط کی رقم رکھ دیتے ہیں۔ میز کے سرے پر شیشہ کا گلوب گھوم رہا ہے۔ اس کے اندر دو شش پہل نمبر دار منکے لڑھک رہے ہیں۔ جب لوگ شرط لگا لیتے ہیں تو وہ گلوب رک جاتا ہے اور منکے کسی پہلو ٹھہر جاتے ہیں۔ ان دونوں کے رخ پر جو نمبر ہوتے ہیں انہیں جمع کرنے کے بعد میز پر اس نمبر کے خانہ کو روشن کر دیتے ہیں۔ وہاں جس شخص نے جتنی رقم

رکھی ہوتی ہے اس کا پانچ گنا اسے ادا کر دیا جاتا ہے۔ باقی خانوں کی رقم ضبط ہو جاتی ہے ڈاکٹر صاحب نے دس ڈالر نمبر چھ کے خانہ میں رکھے ہوتے ہیں۔ گلوب رکا۔ چھ نمبر کے خانہ میں روشنی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو پچاس ڈالر انعام ملا۔ خوشی کے مارے ان کی زبان میں لکنت آگئی۔ بے اختیار وہ ساری رقم کو دوبارہ میز پر رکھنے لگے مگر مسافر انہیں گھسیٹ کر ریستوران کی طرف لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جب آپے میں آتے تو کہنے لگے ہائے ہائے غضب ہو گیا۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک بازی اور کھیلنی چاہیئے تھی۔ آپ اسی طرح میری دائیں جانب کھڑے رہتے تو میں پھر جیت جاتا۔ ہم شگون لینے والے لوگ ہیں۔ ایک بار جیت جائیں تو دہی جیت والا نقشہ جما کر بڑی شرط لگانا چاہتے ہیں۔

بھرے ہوئے ریستوران میں بڑی مشکل سے ایک صوفہ پر جگہ ملی اور اس سے کہیں زیادہ دشواری بیرے سے ملاقات میں پیش آئی جو تراش خراش سے خدمتگار کے بجائے کیسینو کا سرپرست معلوم ہوتا ہے۔ مشروبات کی فہرست میں سے لیمو پانی کا انتخاب کیا گیا اور اس کے انتظار کو تازہ جیتی ہوئی شرط کے بار بار ذکر سے بہلانا شروع کیا۔ ہر بار جیت کا نام آتے ہی ڈاکٹر صاحب خوشی سے پھول کر کپّا ہو جاتے اور ان کے فاتح چہرے پر رونق آجاتی۔ فرمانے لگے آپ کو میری قسم یہ بل آپ نہیں دیں گے۔ یہ دعوت جیت کی خوشی میں میری طرف سے ہے۔ بیرا اس دعوت کے لئے تین چھوٹے گلاس گرم پانی کے اور تین ٹکڑے لیمو کے میز پر رکھ گیا ہے۔ اس سے شکردان اور نمک دانی کی فرمائش کی ہے۔ ایک طویل وقفہ کے بعد وہ چند پڑیاں لے آیا ہے۔ ہمراہی اس خود ساز مشروب کو چسکی لے لے کر پیتے اور گھڑی دیکھتے ہیں تاکہ اسی وقت اٹھیں جب فیری اسٹیشن پر جانے کا وقت ہو جائے۔ بالآخر رخصت کا وقت آجاتا ہے۔ بیرا بل پیش کرتا ہے جسے ڈاکٹر صاحب راہ میں اُچک

لیتے ہیں۔ اوراس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ڈاکٹر صاحب مرجھا گئے۔ جیتی ہوئی ساری رقم نکال کر بیرے کے سامنے رکھ دی۔ وہ تھوڑی سی ریزگاری میز پر رکھ کر چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے جیسے کوئی جیتی ہوئی بازی ہار جائے خیر آب کشتی تیار کھڑی ہے۔ مسافر نے ڈاکٹر صاحب کو گلے لگایا اور دن بھر کی دلچسپ رہنمائی کا شکریہ ادا کیا۔ فرمانے لگے ہائے ہائے۔ نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔ میری بڑھی کو پاکستانی پاسپورٹ مل جاتا تو ہم دونوں پاکستان آکر ملتے۔ آپ دوبارہ تشریف لائیں انشاء اللہ ایسا شاندار استقبال کرونگا کہ آپ کو دیر تک یاد رہے۔ اس مرتبہ تو کونسل صاحب نے ایک گھنٹہ کا نوٹس بھی نہیں دیا۔ مسافر نے کہا، بھلا اس بار آپ نے کونسی کسر چھوڑی ہے۔ سارا دن مریض آپ کے کلینک میں، اراکین انجمن کے دفتر میں، فتوحات کیسینو میں اور مردہ قبرستان میں آپ کا انتظار کرتا رہا اور آپ ہمارے ساتھ پھرتے رہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ آپ کا اتنا وقت لیا اور خوش ہوں کہ آپ نے سفر اور سفرنامہ کو رونق بخشی۔

کشتی تیزی سے ہانگ کانگ کی طرف اڑی جا رہی ہے۔ ریڈیو پر خبریں نشر ہو رہی ہیں۔ جنرل سپینولا نے اعلان کیا ہے کہ پرتگال اپنی مقبوضہ نوآبادیوں کو مناسب وقت پر آزادی دینے کے حق میں ہے۔ انگولا اور موزمبیق کا نام خبروں میں آیا ہے۔ مکاؤ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ چپہ بھر زمین عالمی سیاست میں اتنی اہم بھی تو نہیں۔ چین کا حصہ ہے سو وقت آنے پر پرتگال کے بجائے چین بن جائے گا۔ ایک دن سرحد پر واقع دوستی کے آرائشی پھاٹک کے پٹ کھل جائیں گے اور ماؤزے وانگ سوئی کا نعرہ لگاتے ہوئے غول کے غول مکاؤ پر چھا جائیں گے۔ کیسینو کی عمارت کاخِ اطفال میں تبدیل ہو جائے گی۔ جوا کھیلنے کی میزوں کی جگہ ٹیبل ٹینس کی میزیں سجائی جائیں گی۔ ڈاکٹر غلام حسین کو برہنہ پا ڈاکٹروں کے دستہ میں بھرتی

کر لیا جائیگا۔ فرصت کے کمیاب اوقات میں وہ اور ان کی چینی بیوی بند گلے کے نیلے ماؤ سوٹ پہن کر مسلم مسجد کے احاطہ کی ذراسی زمین میں نونو خاں کی دادی کی قبر کے پاس سبزیاں اگایا کرینگے کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کو اُن دیکھا وطن یاد آئیگا اور بیوی سے یوں مخاطب ہونگے۔ ہائے ہائے تیری خاطر یہ دن دیکھنا پڑا۔ تیرا پاسپورٹ وقت پر بن جاتا تو آج گجرانوالہ میں عیش کر رہی ہوتی عیشں !

(۴)

عیش کا ایک نظریہ یہ ہے کہ وہ تجمل حسین خاں پر تمام ہوا۔ اوروں کو جو ملا وہ فقط ہفت نظر کے لئے تھا۔ یہ نظریہ کب کا باطل ہو چکا ہے۔ آج کل کی عیش کوشیوں کے مقابلہ میں یہ دعوے محض شاعرانہ مبالغہ ہے اور تجمل حسین خان اخلاقی لحاظ سے جہاں سوم کے ایک بھلے مانس لگتے ہیں۔ آخر ان کے پاس کیا رکھا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مکان کی جگہ محل سرا چار کی جگہ حرم سرا چراغ کی جگہ چہل چراغ۔ عیش تو آج ہو رہا ہے اور بہرس و تاکس کر رہا ہے۔ ان دنوں عیش کا صرف ایک پہلو تھا اب دو ہزار پہلو ہے۔ برق اور بے تار برقی، صدا اور سیما، گنزہ اور سوہو، لاس وگاس اور ہالی وڈ۔

مسافر عیش کے بین الاقوامی صدر مقام پہنچ گیا۔ یہ ہالی وڈ ہے۔ صنعتِ آذری کا سب سے بڑا اور خاکستری بت خانہ۔ وہ دروازہ پر کھڑا ہے۔ خیال تھا یہ دروازہ مکاؤ کے کیسینو کی طرح کھلی باہنوں میں سیاحوں کو لینے کے لئے بیتاب ہوگا۔ داخلہ مفت ہوگا لہذا قاضی کے لئے حلال۔ صورتِ حال برعکس نکلی۔ دروازہ بند ہے، دستک دی۔ وہ بدستور بند رہا۔ یہ آواز بند ماحول ہے، اندر کی آواز اندر اور باہر کی باہر رہتی ہے۔ مدد مانگی۔ رازِ درُونِ خانہ سے واقف نے کہا یہ دولت کے لات و منات کا مندر ہے۔ عورتوں سے قربانی اور مردوں سے نذرانہ مانگتا ہے۔ نذر پیش کی اور سم سم کھل گیا۔ مسافر ایک سرزمین عجائب

میں داخل ہوگیا ہے۔ ہر شے عجیب و غریب مگر نقلی اور جعلی ہے۔ کبھی اصل کی نقل اتارتے ہیں، کبھی نقل کی نقل تیار کرتے ہیں۔ کبھی جعل سازی کی فنی سرحدوں کو چھو لیتے ہیں، کبھی حیلہ گری انہیں پار کر کے جہانِ خیال میں نکل جاتی ہے۔ نقل فن ہے۔ نقل را عقل باید۔ جعل کمالِ ہنر ہے۔ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا۔ حیلہ گری آرٹ ہے۔ اسی لئے کسی فلسفی نے کہا تھا' جس لمحہ تخلیق حسن کے لئے تم حیلہ گری سے کام لینا سیکھ لیتے ہو تم فنکار بن جاتے ہو۔

مسافر آج تیسری بار ایک فلم سٹوڈیو میں داخل ہو رہا ہے۔ کم سنی میں اس نے سلطنتِ برطانیہ کے دوسرے سب سے بڑے شہر میں لوہے کے پائدانوں پر کھڑے خشک درخت اور ان کی شاخوں پر اگے ہوئے روئی کے پھول دیکھے تھے۔ دوسری بار اس نے کراچی میں ایک ایسے دانشور کو فلم بناتے دیکھا جن کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا ہے' تو اہل دانش و فضلی ترا گناہ ہست بس۔ لکڑی اور گتے کے گھر کینوس کا اسکول ریڈیو کی آوازیں کرائے کے چہرے اور ان میں گھرے ہوئے اسد جن کی غزل فلمائی جا رہی تھی۔ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد۔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے۔ مسافر صورت حال دیکھنے کے لئے تیسری بار یونیورسل سٹوڈیو ہالی وڈ میں داخل ہوا۔ مسافر زیادہ حیران ہونے کے لئے تیار نہیں وہ جانتا ہے کہ یونیورسل سٹوڈیو چار سو بیس ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے اور تعزیرات پاکستان کی دفعہ چار سو بیس کا اطلاق ہر ایکڑ پر ہوتا ہے۔

پہلی منزل روپ بہروپ کی منزل ہے۔ گذرے دنوں میں سارا زور روپ پر تھا تاکہ سادہ چہروں کو دلفریب بنا کر پیش کریں۔ ان دنوں سارا زور بہروپ پر ہے۔ اس آرائش گاہ میں بھلے مانس کو بن مانس بنا دیتے ہیں۔ اور اچھی بھلی صورتوں کا ستیاناس

کرتے ہیں تاکہ بھوتوں کبڑوں گوریلوں اور شیطانوں کی آبادی میں اضافہ ہو۔ میک اپ والا تماشائیوں کو دعوت دے رہا ہے کہ دو رضاکار ایک مرد اور ایک عورت اسٹیج پر آ جائیں۔ بجلی کی خودکار مشینوں سے ان کے چہروں کی آرائش کا مظاہرہ کیا جائیگا۔ بہت سے ہاتھ کھڑے ہوتے اور دو تماشائی حُسنِ اتفاق پرخوش اور حسنِ صورت کے متلاشی اسٹیج کی طرف لپکتے ہیں۔ وہاں ایک بڑی سی مشین رکھی ہوئی ہے اس کے پٹ کھول کر دونوں کو اس کے اندر بند کر دیتے ہیں۔ بجلی کا بٹن دبایا گیا۔ یکایک شعلہ نکلا بھک سے آواز آئی اور مشین جل گئی۔ میک اپ والے نے پٹ کھولے تو اندر سے جلی ہوئی ہڈیوں کے دو انسانی پنجر نکل آئے۔ کہنے لگا فنّی خرابی کی وجہ سے نتائج حسب خاطر برآمد نہیں ہوئے۔ دو رضاکار درکار ہیں۔ کسی نے ہاتھ کھڑا نہ کیا۔ سب بے یقینی کا اظہار کر رہے ہیں۔ انتظامیہ مشین درست کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ تماشائیوں کے صبر کا امتحان ختم ہوا۔ بٹن دوبارہ دبایا گیا، چرخی چلی اور گھومتی الماری ڈھانچوں کو لے کر پیچھے چلی گئی اور وہاں سے دونوں رضاکاروں کو لے کر تماشائیوں کے رُخ ٹھہر گئی۔ رخِ روشن کا اب یہ عالم ہے کہ وہ دونوں پہچانے میں نہیں آتے۔ ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ جاتا ہے۔

یہ دوسرا مرحلہ مار دھاڑ کا ہے۔ جب اصل دنیا میں جگہ جگہ گولیاں چل رہی ہیں اور خون بہہ رہا ہے تو یہ نقلی دنیا کیوں پیچھے رہ جائے۔ یہاں بھی چاندماری جاری ہے اور لہو بہہ رہا ہے۔ اس جعلی خونریزی میں جو خون ہوتا ہے وہ اصلی لگتا ہے۔ وہی رنگ وہی غلظت وہی بہنے کی رفتار وہی جمنے کا دوران۔ آزمائش گاہ میں بھیج دیں تو وہاں سے ٹسٹ رپورٹ آجائے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ رگوں میں دوڑنے پھرنے کے بجائے ٹیوب میں بند ہوتا ہے۔ ٹیوب دبا کر جہاں چاہیں خون پانی ایک کر دیں جس تلوار کو چاہیں خونچکاں

کر دیں جس آنکھ سے چاہیں خوناب رواں کر دیں۔ صحت مند جسم پر پھیلائیں تو زخموں سے اتنا چور اور چھلنی ہو جائے کہ بچنے کی امید اٹھ جائے۔ پنبہ کجا کجا نہم۔ لیکن پنبہ تو بڑی چیز ہے عام کاغذی دستمال لے کر صاف کریں تو سارا خون چھٹ جائے بس خوشبو باقی رہ جائے۔ وہ دن لد گئے جب مٹی کا تیل اور سپرٹ اور لیموں کا عرق لے کر جھانویں اور سنگِ پا اور ریگ مال سے اتنا رگڑتے تھے کہ فن کار نقلی لہو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں لہولہان ہو جاتا تھا۔ اس خون کی طرح مار دھاڑ بھی نقلی ہے۔ اصل فنکار کی جگہ ایک عیوضی نٹ دو منزلہ عمارت کی چھت پر گولیوں کی بوچھاڑ میں کھڑا ہے۔ گولی لگی اور وہ عمارت سے زمین پر آن گرا۔ وہاں خاک رنگ نرم گدیلے بچھے ہوئے ہیں۔ وہ کپڑے جھاڑ کر تالیوں کی گونج میں اس طرف کا رخ کرتا ہے جہاں لکھا ہوا ہے' خطرناک دلدل۔ پاؤں پڑتے ہی زمین اسے نگلنا شروع کر دیتی ہے وہ تڑپتا ہوا اور مدد کے لئے چیختا ہوا زندہ دفن ہو جاتا ہے۔ تماشائی دم سادھے بیٹھے ہیں کہ یہ کیا ہوا۔ اور وہ شخص تماشائیوں کی نشستوں کے پاس کھلنے والے تہہ خانہ سے باہر آ کر مسافر سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

ان چار سو بیس ایکڑوں میں ہر طرح کی زمین اور ہر قسم کا موسم موجود ہے۔ یہی حال شہروں نظاروں اور تعمیرات کا ہے۔ تماشائیوں کی کھلی ٹرام بس اس وقت یونیورسل سٹی کی بہترین رہائشی بستی سے گذر رہی ہے۔ کشادہ قالینی سڑکیں دو رویہ خوشنما درخت روشنیوں کا تاج پہنے ہوئے کھمبے صاف ستھرے پیادہ رو اور ان کے پیچھے اپنے اپنے سبزہ زار میں کھڑی عالیشان کوٹھیاں جیسے اپنی اپنی ذات میں مگن کامیاب اور خود پرست افراد۔ لیکن اس رہائشی بستی میں کسی کی رہائش نہیں اور نہ یہاں کوئی مکان بنا ہوا ہے۔ عمارت بڑی بات ہے یہاں کسی عمارت کا ڈھانچہ بھی نہیں۔ صرف چہرے ہی چہرے ہیں۔ یہ

سامنے نظر آنے والا خوبصورت بنگلہ جو کسی لکھ پتی کی قوت خرید کا امتحان لے سکتا ہے اور جس کا پھاٹک، لان، داخلی سڑک، پورچ، صدر دروازہ اور گھنٹی نظر آ رہی ہے یہ محض دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ یہ صرف ایک دیوار ہے اتنی دیدہ زیب جتنا کسی عالیشان عمارت کا چہرہ لیکن اس چہرہ کے پیچھے کوئی دھڑ نہیں اور اس صدر دروازہ کے پیچھے کوئی عمارت نہیں۔ دروازہ کے عقب ذرا سی جگہ ہے جو جھاڑ جھنکار سے پڑ ہے اور اس میں وہ آہنی قینچیاں لگی ہیں جو اس اکلوتی سہ منزلہ دیوار کو سہارا دیئے ہوئے ہیں۔ مسافر کو دو وزیر یاد آئے جن کے ساتھ وہ کام کر چکا تھا۔ جب ان کی شخصیت کا صدر دروازہ کھول کر پیچھے جھانکنے کا موقع ملا تو منظر کچھ ایسا ہی تھا۔ سٹوڈیو کی اس رہائشی بستی میں ایک مکان سدا آگ میں جل رہا ہے اور اس کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ یہ صرف ایک روکار ہے جس کے دروازوں اور کھڑکیوں میں گیس کے پائپ لگے ہیں جن سے شعلے لپک رہے ہیں۔ کہنے کو اس مکان میں آگ لگی ہوئی ہے مگر اس کے دریچوں کی وہی حیثیت ہے جو گیس کے چولہے کے فریم کی ہوتی ہے۔ مسافر کو دو آتش بیاں مقرر یاد آئے جن کی ذات آتش خوار کی طرح ہر وقت اپنی آتش بیانی کی آگ میں گھری رہتی۔ نزدیک جا کر دیکھا تو محض چولہا گرم رکھنے والی آگ نکلی۔

ٹرام ٹھنڈی سڑک سے آگے نکل آئی ہے منظر لحہ بہ لحہ بدلتا جاتا ہے۔ دریا پہاڑ جنگل جھیلیں مرغزار اور ریگزار۔ یہ سب ایکڑ دو ایکڑ پر مشتمل ہیں۔ مگر سکرین پر پھیلاؤ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ چپّہ بھر ریت دشتِ صحارا بن جاتی ہے گنتی کے درخت افریقہ کا جنگل بن جاتے ہیں اور ذرا سی جھیل بحر الکاہل نظر آتی ہے۔ ٹرام دو پہاڑیوں کے درمیان ایک پل پار کر رہی ہے جس کے نیچے ایک پہاڑی نالہ بہتا ہے۔ ٹرام ایسی جگہ پہنچ گئی ہے جہاں سے نہ جلد اس پار جا سکے نہ تیزی سے واپس ہو سکے۔ پل نے چرچرانا شروع کر دیا ہے۔ اب وہ

ہل رہا ہے اور ایک حصہ ٹوٹ کر نیچے گر رہا ہے۔ پل ٹوٹ گیا۔ ٹرام سلامت ہے۔ بٹن دبانے والے نے بٹن دبایا ہے اور پل کے شکستہ حصے خود بخود جڑتے جا رہے ہیں۔ ٹرام پل کے دوسری جانب ایک ڈھلان پر اتر جاتی ہے۔ پل کے دوسرے کنارے سورج نصف النّہار پر تھا۔ مگر اس کنارے کی بستی گھرے بادلوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ یکایک بجلی چمکنے لگی ہوا تیز چلنے لگی بادل جو گرج رہے تھے وہ برسنے لگے۔ بارش موسلا دھار ہے۔ ٹرام کی چھت سے پرنالہ بہنے لگتا ہے۔ سامنے کی گلی جو ایک منٹ پہلے خشک تھی اب ایک برساتی نالہ بن گئی ہے۔ اس گلی میں جو درخت کھڑا تھا وہ تھوڑی دیر تک جھکڑ اور سیلاب کا مقابلہ کرتا رہا اور پھر جڑ سے اکھڑ گیا۔ تیز بارش کی وجہ سے ٹرام ٹھہری ہوئی ہے۔ یہاں پہنچے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے کہ بارش تھم گئی بادل چھٹ گئے پانی بہہ گیا اور گرا ہوا درخت خود بخود سیدھا کھڑا ہو گیا سورج اب پھر نصف النّہار پر ہے۔

ٹرام پہاڑ کی چوٹی پر جانے والی سڑک پر مڑ گئی ہے۔ پہاڑی کے اوپر برف پڑی ہوئی ہے۔ برف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اب اس نے ہر شے کو ڈھک لیا ہے۔ ٹرام ایک سرنگ میں داخل ہوئی۔ یہ قطب شمالی ہے یا قطب جنوبی۔ برف کی زمین برف کا آسمان برف کے پہاڑ برف کا سمندر۔ ٹرام پھسل رہی ہے۔ برف کا طوفان اسے برف کی کھڈ میں دھکیل رہا ہے۔ وے بخیر گذشت۔ ٹرام اس طوفان اور ساتھ ہی اس سرنگ سے باہر نکل آئی۔ سورج پوری آب و تاب سے نکلا ہوا ہے مگر اب نصف النّہار پر نہیں۔ ڈھلنا شروع ہو گیا ہے۔

پچھلے چند گھنٹوں میں آنکھوں پر بہت بوجھ پڑا۔ تماشا کے بعد تماشا۔ ہر تماشا آنکھیں کھلی رکھنے کا تقاضہ کرتا تھا۔ پلک جھپکنی مشکل ہو گئی تھی۔ اب آنکھوں کا بوجھ آہستہ

آہستہ ذہن کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر جو کچھ دیکھا وہ کیسے ممکن ہوا اور جو تاثر لیا وہ کیونکر لیا۔ جانوروں کی حد تک تو بات واضح تھی کہ وہ سدھائے ہوئے تھے۔ وہ عقاب بھی جو اسٹیج پر بڑے سے پنکھے کے سامنے تندی باد مخالف کا مقابلہ کرتے ہوئے جونہی اشارہ پاتا اسی مقام پر رہتے ہوئے پرواز کے مختلف انداز اور رُخ پیش کرتا اور وہ چوہا بھی جسے کسی کے قدموں میں چھوڑ دیں تو سیدھا اس کے اوپر چڑھ کر کوٹ کی چھوٹی جیب میں یوں سج کر بیٹھ جاتا جیسے کسی شوقین نے رومال اڑس رکھا ہو۔ لیکن جہاں الکٹرونی اور شعاعی شعبدہ بازی تھی وہاں اُلجھن بڑھ جاتی۔ علم کے دستِ غیب پر اتنی دسترس کہ دیکھنے والے کو محرومی کا احساس ہونے لگے۔

ٹرام اب جھیل کو پار کر رہی ہے۔ اس لہریا جھیل کے نسبتاً تنگ حصہ پر بالکل پانی کی سطح سے لگا ہوا ایک پل ہے۔ پانی ساکت ہے۔ گائیڈ خاموش ہے خیال ہوا کہ یہاں کوئی تماشا نہیں لیکن خیال غلط نکلا۔ جھیل کے پانی کا سکون عارضی ثابت ہوا دوسرے کنارے کی تہ سے ایک شارک مچھلی اُبھری۔ خونخوار اور خوفناک اور عظیم الجثہ۔ آبدوز لگتی ہے جو سطح پر آجائے۔ اس نے سر اٹھا کر ٹرام کی طرف دیکھا اور اس کے شکار کے لئے اس تیزی سے لپکی کہ جھیل میں طوفان آگیا۔ مشکوں پانی اس کے بوجھ سے دب جاتا ہے اور پھر اطراف سے ابھر کر اس کے جثہ سے ٹکرا کر کنارے کی طرف لہروں کی صورت لوٹ جاتا ہے وہ جہاں سے گذرتی ہے ہر چیز زیر و زبر ہو جاتی ہے راستہ میں جو شخص چھوٹی سی ڈونگی پر بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا وہ کشتی سمیت ڈوب گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بہت نزدیک آگئی سب سوچ رہے ہیں اب کیا ہوگا۔ ٹرام کے پاس پہنچ کر دیو ہیکل شارک نے جست لگائی اپنا غار جیسا منہ کھولا اور خاردار جبڑوں میں ٹرام کو لینے کی کوشش کی۔ ٹرام بال بال بچ گئی

شارک پانی میں گری ۔اس کے وزن سے اتنا پانی اُچھلا کہ تھوڑی دیر تک کچھ نظر نہ آیا۔ اب جو نظر کام کرتی ہے تو مچھلی کہیں نظر نہیں آتی ۔ ڈوبی ہوئی ڈونگی البتہ پھر سطح آب پر نظر آ رہی ہے اور ہیٹ لگائے کانٹا ڈوری لئے ایک شخص اس میں بیٹھا ہوا ہے ۔ گائیڈ نے کہا یہ وہ شارک مچھلی ہے جسے آپ نے فلم دہانِ ماہی میں دیکھا تھا۔

سائے ڈھل گئے ہیں دن لٹک گیا ہے سورج غروب ہونے کے لئے اجازت چاہتا ہے ۔ تماشے راستہ دیں تو تماشائی گھر کی راہ لیں ۔ اعلان ہوا کہ ٹرام جو اب واپس جا رہی ہے ذرا سی دیر کے لئے ایک اور جھیل کے کنارے ٹھہرے گی ۔ تماشائی اس اعلان سے پیدا ہونے والی آسودگی کا اظہار انگڑائیوں اور جمائیوں سے کر رہے ہیں۔ سلائیاں اون کے گولوں میں پیوست ہو گئیں ۔ کیمرے خول میں بند ہو گئے ۔ سگریٹ کے پیکٹ کھل گئے عنقریب یہ ربڑ ٹائر نرم گدیلوں اور کھلے دریچوں والی ٹرام بس تماشائیوں کی کھیپ لے کر اس دروازہ پر جا کھڑی ہو گی جس کے دوسری طرف ہر ایک کی اپنی اپنی دنیا آباد ہے۔ ٹرام پہاڑوں وادیوں اور صحراؤں سے گذرتی ہوئی ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئی ۔ چونکہ اس جھیل پر کوئی پل نہیں اس لئے ایک جگہ پانی میں اگلے پہیے ڈال کر رک گئی ہے جیسے جنگل میں پیاسے چوپائے اگلے پیر ندی میں ڈال کر جھکے ہوئے پانی پیتے ہیں ۔ گائیڈ کہہ رہا ہے' دنیا کی پوری تاریخ میں آج تک پانی نے صرف دو آدمیوں کو راستہ دیا ہے حضرت موسےٰ نے بحرِ قلزم سے فرمایا خدا کے حکم سے تو پھٹ اور مجھے چلنے کا راستہ دیدے ۔ بس اسی وقت وہ پھٹ گیا ۔ حضرت موسےٰ اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلہ پار چلے گئے اور ان کا تعاقب کرنے والوں نے اس راہ پر چلنا چاہا تو پانی کے کنارے مل گئے اور وہ غرق ہو گئے ۔ دوسری مرتبہ اس جھیل کے پانی نے فنکار چارلٹن ہسٹن کو فلم احکامِ الٰہی کی تیاری کے دوران

اس مقدس واقعہ کی یاد میں اس مقام پر راستہ دیا تھا جہاں اس وقت یہ ٹرام کھڑی ہے
بات یہاں تک پہنچی اور جھیل کی سطح پر اس کنارے سے اس کنارے تک پانی کی ایک
لکیر بن گئی۔ پانی اس نشان سے پھٹ کر پیچھے ہٹنے لگا جیسے دو غیبی ہاتھ آدھی جھیل کو ایک
طرف اور آدھی کو دوسری طرف دھکیل کر راستہ بنا رہے ہوں۔ جھیل کا پانی سطح سے پھٹنا شروع
ہوا اور تہ تک پہنچ کر دونوں طرف اتنا پیچھے چلا گیا کہ ایک کشادہ راستہ بن گیا۔ ٹرام پانی کی
ان دو دیواروں کے درمیان سے گذر کر اب دوسرے کنارے پہنچ گئی ہے۔ آبی دیواریں
یوں کھڑی ہیں جیسے پانی کے پہاڑ۔

موسیٰ نے فرمایا"...... یقین مانو کہ میرے ساتھ میرا پروردگار ہے جو مجھے
ابھی ابھی راہ دکھائے گا۔ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ سمندر پر اپنی لاٹھی مار۔ اسی وقت
سمندر پھٹ گیا اور ہر ایک حصہ پانی کا مثل بڑے سارے پہاڑ کے ہو گیا۔"

دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے مسافر نے مڑ کر دیکھا۔ پانی کی ایک دوسرے
کی طرف بڑھتی ہوئی پہاڑ جیسی دیواریں ہم آغوش ہو گئیں اور جھیل کی سطح پھر ایک بار ہموار
اور یکساں ہو گئی۔ مسافر کے ہاتھ ایک رمز آ گئی۔ وہ جب بھی مڑ کر اپنی ان گنت متنوّع یادوں
کی جھیل کی جانب دیکھتا ہے وہ شق ہو جاتی ہے اور مسافر ایک کشادہ راستہ پر چلتا ہوا دوسری
طرف ماضی کے کنارے پر جا نکلتا ہے۔

مسافر بحرالکاہل کے ساحل پر واقع چھوٹی سی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا
ہے۔ پہاڑی کی جھولی مصنوعی جھیلوں سے بھری ہوئی ہے۔ چوٹی سے لے کر لب سمندر تک
پھیلے ہوئے پانی کے تالاب ان کٹوروں کی طرح لگتے ہیں جو جلترنگ بجانے کے کام آتے
ہیں۔ ان میں سمندر کا نیلا اور کھاری پانی بھرا ہوا ہے اور اس میں آبی مخلوق بے سمت اور

اور شاید بے مقصد تیر رہے چلی جا رہی ہے۔ آبی جانوروں اور خاکی انسانوں میں دوستی کا کوئی امکان نہیں۔ دونوں کی دنیائیں علیحدہ ہیں۔ وہ خشکی پر بے دم ہو جاتے ہیں اور یہ پانی میں۔ دوستی ہو تو کس سرزمین پر۔ لمحہ بھر کے لئے اگر ایک دوسرے کی دنیا میں داخل ہو جائے تو رسم تعارف ختم ہونے سے پہلے ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ ماہرین جو انسان کی حیوان دوستی اور حیوان کی انسان شناسی پر کام کر رہے ہیں وہ بھی کچھ ایسے ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ان کی دریافت ہے کہ انسان کی محبت کا بھرپور جواب جن تین جانوروں سے ملتا ہے وہ کتا گھوڑا اور ہاتھی ہیں۔ اس مختصر فہرست کے بعد باہمی تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں اور بات بلی اور مرغی اور مچھلی تک پہنچ جاتی ہے۔ بلی احسان فراموش ہے' مرغی نادان ہے اور مچھلی بے تعلق۔

بے تعلق مچھلی کا تماشا دیکھنے کے لئے گہرے گول حوض کے ارد گرد باؤلی کی سیڑھیوں کی طرح نشستیں بنی ہوئی ہیں۔ مسافر وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ تماشا گر نے سیٹی بجائی جسے سن کر ایک پہاڑ کا پہاڑ تہ سے برآمد ہوا۔ یہ وہیل مچھلی ہے جیسے دوبارہ بھی اور دوسرا پہاڑ بھی سطح پر آ گیا۔ اس کے بعد تماشا گر اور ان دونوں وہیل مچھلیوں کے درمیان اشارے ہوا کئے اور یہ دونوں بزرگ جثہ مچھلیاں انگلیوں کے اشارے پر ناچنے لگیں۔ پیٹ بری بلا ہے۔ اس کی خاطر یہ بزرگ بندروں کی سطح پر اتر آئے ہیں۔ حکم ہوتا ہے چکر لگاؤ' تیز ہو جاؤ' آہستہ ہو جاؤ' رک جاؤ' قلابازی لگاؤ' دم ہلاؤ' منہ کھولو۔ چھوٹی سی مچھلی انعام کے طور پر منہ میں ڈال دی جاتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہیل مچھلیوں کو اشارے کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ اتنے بڑے جسم میں اتنی چھوٹی آنکھیں جڑی ہیں کہ دور سے ان پر تل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ حکم ہوا میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاؤ اور مجھے سیر کراؤ۔ تماشا گر پشت ماہی کی چکنی ڈھلان پر

پیر رکھتا ہے اور پھسلن کے ڈر سے مچھلی کا پنکھ مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں تھام لیتا ہے۔
مچھلی ہوا ہو جاتی ہے۔ سیر ختم ہوئی اور تماشا گر نے اترتے ہوئے کچھ اس کے کان میں کہا۔
وہیل نے تیزی سے حوض کے کنارے کے ساتھ تین چار چکر لگائے اور جب رفتار نے خوب
زور پکڑ لیا تو یکدم سطح سے بلند ہوئی اور پنکھ ہلاتی چھپاک سے پانی پر گری۔ ایک دھماکہ
کے ساتھ پانی کی کئی چادریں ہر طرف ہوا میں بلند ہوئیں۔ اوج کو چھونے کے بعد چادریں
سکڑنی شروع ہو گئیں پھر وہ تار تار ہوئیں اور بالآخر قطرہ قطرہ۔ چھپکا حوض کے ارد گرد
بہت دور تک پہنچا۔ پہلی صف میں بیٹھے ہوئے لوگ بھیگ گئے اور وہ جو ہدایات کے باوجود
کنارے پر کیمرے لیے کھڑے رہے ان کا پوچھنا ہی کیا۔ دور بیٹھنے والے جو لمحہ بھر پہلے نشستوں
کے فاصلہ پر ہونے کی وجہ سے شاکی تھے اب خوشی کے مارے تالیاں بجا رہے ہیں۔ انسان
کی خوشیاں کتنی چھوٹی اور ناخوشیاں کتنی چھوٹی ہوتی ہیں۔

ایک مسخرہ شب خوابی کا دھاری دار لباس پہنے حوض کے کنارے پر لگی ہوئی
سیڑھی کے سب سے اونچے پائدان پر چڑھ گیا۔ اس نے جیب سے دس بارہ انچ لمبی مچھلی نکالی
اور اس کی دُم دانتوں میں دبا کر پانی کے اوپر جھک گیا۔ وہیل کو حکم ملا تو اس نے پھر تیزی
سے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ جب حوض نے منجدھار کی صورت اختیار کی تو وہیل نے جست
لگائی اور دم کی نوک پر سیدھی کھڑی ہو کر مسخرہ کے منہ کا نوالہ چھین کر تہ میں غائب ہو گئی۔
اگر یہ وہیل ہوا میں چھلانگ لگاتے ہوئے صرف چند انچ اور بلند ہو جاتی تو سارا مسخرہ پن
بے سر کے دھڑ کی صورت سیڑھی کے پائدان پر دھرا رہ جاتا۔ وہیل مچھلی کے کرتب جی کا جنجال
بن گئے۔ سو لوگ زور زور سے تالیاں پیٹ رہے ہیں بس ایک تماشائی خاموش کھڑا ہے
پوچھا کیا لوگوں سے جدا نظر آنے کی خواہش نے تمہیں اس خاموشی کا پابند کیا ہے۔ جواب ملا

اعلان ہوا کہ اب ڈالفن مچھلیوں کی اولمپک ہو گی۔ یہ مقابلہ سب سے طویل تالاب میں ہو رہا ہے بہت سے کھیل ہوتے ایک سے ایک انوکھا۔ بہت سی مچھلیوں نے حصہ لیا ایک سے ایک ہشیار۔ اس وقت اونچی چھلانگ لگانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ تالاب کے وسط میں دونوں کناروں پر بانس لگا کر ان کے اوپر ایک رسی تن دی ہے۔ مقابلہ میں شریک پانچ چھ مچھلیوں کو باری باری نام لے کر بلایا جا رہا ہے۔ ہر ایک نے چھلانگ لگائی اور بہ آسانی رسی کو پار کر لیا۔ رسی درجہ بدرجہ اونچی ہوتی جا رہی ہے۔ مقابلہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ ناکام مچھلیاں مقابلہ سے خارج ہوتی جا رہی ہیں۔ اونچائی کے آخری نشان تک صرف ایک ڈالفن جست لگا سکی اور چیمپئن بن گئی۔ اس مقابلہ کے بعد رکاوٹوں کی دوڑ ہو گی۔ تالاب کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ہر بیس پچیس فٹ کے فاصلہ پر پانی کی ایک کمان بن گئی ہے۔ ایک کنارے پر لگے ہوئے فوارے دوسرے کنارے پر دھارے کی کمندیں پھینک رہے ہیں۔ تالاب کو آبی دھنک کی دس بارہ توسوں نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ دوڑ شروع کرانے والے کو صرف دو تک گنتی آتی ہے۔ تین پر اس نے پستول داغ دیا۔ مقابلہ میں شریک ڈالفن مچھلیاں دوڑتی ہوئی پانی کی پہلی ڈور پر چھلانگ لگا کر تالاب میں گریں اور ذرا سنبھلی بھی نہ ہوں گی کہ دوسری رکاوٹ سامنے آ گئی۔ زور سے وہیں ہلیں منہ کھلے جست لگی اور مچھلیاں ہوا میں رکاوٹ کے اوپر اڑتی ہوئی دوسری جانب غوطہ کھا گئیں۔ غرض تیرتی اور اچھلتی، اڑتی اور گرتی، ڈوبتی اور ابھرتی دوسرے کنارے پر جا پہنچیں۔ اول آنے والی مچھلی کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ وہ پانی سے اچھل کر باہر آئی۔ تماشا گر نے اس کے گلے میں سونے کا تمغا ڈالا اور اس کا منہ موتیوں کے بجائے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے بھر دیا۔ ڈالفن نے شکریہ ادا کرنے کے لئے ایک بے سری آواز نکالی اور پانی میں اتر گئی۔

مسافر نے تماشا گر سے مصافحہ کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی انگلیاں خالی ہیں
پوچھا، تمہاری سلیمانی انگشتری کیا ہوئی۔ اس کے بغیر یہ کیسے ممکن ہے کہ بے زبان اور بے تعلق جانور
یوں مطیع اور تابع ہو جائے اور وہ حرکتیں کرے جس کے لئے قدرت نے اسے نہیں بنایا۔
ہنسا اور بولا' ہمارے پاس اکسیر کا نسخہ اور الہ دین کا چراغ اور سلیمانی انگشتری سب موجود ہیں
فکر اور محنت نسخہ بھی ہے چراغ بھی اور انگشتری بھی۔

(۵)

یہ میونخ ہے جرمنی کا ایک شہر۔ یہاں ایک ہجوم بیسویں اولمپک کی آخری
تقریب کے لئے جمع ہے۔ ہزاروں کا ہجوم ہے اور بالکل شیر و شکر۔ نہ ان لوگوں کا ملک ایک
نہ زبان ایک نہ رنگ ایک نہ لباس ایک۔ مگر ان سب کی دنیا ایک ہے جسے کھیلوں کی
دنیا کہتے ہیں۔ تین ہفتہ پہلے اس ہجوم میں شامل لوگ ایک دوسرے سے بالکل ناواقف
تھے۔ آج کے بعد شاید یہ پھر کبھی ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھ سکیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا
ہے' یہی کہ پہلے مشتاقی بڑھتی ہے اور پھر کسک میں اضافہ ہوتا ہے۔ پہلے روز ہر ملک کا دستہ
خوشنما وردیاں پہنے قواعد کے مطابق قدم ملاتا داخل ہوا تھا۔ آج آخری روز ملکوں کی تفریق
مٹ گئی ہے لباس اور مارچ کی پابندی اٹھ گئی ہے سب مل جل کر باہوں میں باہیں ڈالے
بے ترتیب اور بے پروا ہجوم کی شکل سٹیڈیم کا چکر لگا رہے ہیں۔ جس کا جیسے جی چاہتا ہے ناچنے
لگتا ہے۔ سو ملکوں کے ناچ ہیں اور انداز ایک' وارفتگی میں ہاتھ پاؤں مارنا۔ جس کا جو جی چاہتا
گانے لگتا ہے۔ سو زبانیں ہیں اور ٹیپ کا مصرعہ ایک' ہو جالو۔ سارے اختلافات ایک طرف
اور اس ہجوم کی وحدت ایک طرف۔ ہم سن' ہم سر' ہم دل۔ سرخوش اور سرمست۔ ایک نعرہ مستانہ
لگا اور بڑے بڑے حروف روشن ہو گئے۔ لکھا ہے' الوداع۔ چار سال بعد پھر جمع ہونگے۔ اس بار

مانٹریال میں۔

یہ مانٹریال ہے۔ کینیڈا کا ایک شہر۔ ہوائی اڈہ سے شہرکِ اولمپک تک جا بجا پرچم لہرا رہے ہیں جن پر بڑے بڑے حروف سے لکھا ہے' خوش آمدید۔ یہ اکیسویں اولمپک ہے۔ اس کا پھیلاؤ بے اندازہ ہے۔ چار سال کی تیاری' ایک اعشاریہ پانچ بلین ڈالر کی عمارات' نو ہزار کھلاڑی' تین ہزار صحافی' سولہ ہزار محافظ' ایک لاکھ نشستیں اور ٹی وی کے ایک سو ملین ناظرین۔

چوبیس گھنٹہ کے مسلسل ہوائی سفر کے بعد رات کے پچھلے پہر شہرکِ اولمپک کے پیش ساختہ ڈھانچوں سے تعمیر شدہ استقبالیہ دالان میں داخل ہوتے ہی تھکے جسم نرم صوفوں پر سکڑ سمٹ کر ڈھیر ہو گئے۔ میونخ کے فلسطینی شبخون کی وجہ سے جانچ پڑتال بڑی سخت ہے۔ رات کا جو حصہ باقی ہے وہ اس کی نذر ہو جائے گا۔ مسافر دفتر استقبال میں بیٹھا اپنے دستہ کے لئے داخلہ کے نئے کارڈ بنوا رہا ہے۔ کارڈ بنانے والا کام میں مصروف ہے کبھی کبھی ایک آدھ جملہ کہہ کر طویل خاموشی سے پیدا ہونے والی ملالت کو دور کرتا ہے۔ اس نے مشین سے سر اٹھائے بغیر مسافر سے پوچھا' کیا تم نے گھڑی درست کر لی۔ مسافر نے نفی میں سر کو جنبش دی۔ کارکن نے کہا' وقت درست کرنے کے لئے گھڑی کو نو گھنٹہ پیچھے لے جاؤ۔ مسافر نے گھڑی درست کی مگر اس کے لئے نو گھنٹہ کے بجائے کئی برس پیچھے جانا پڑا۔ اسکول میں ورزش کاری کے سالانہ مقابلوں کی تقریب تھی۔ سرفراز ہاؤس کے سامنے چٹیل میدان میں چھوٹا سا شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اعلانچی نے ہاتھ میں ٹین کا بھونپو پکڑا ہوا تھا۔ مقابلہ شروع کرانے والے ماسٹر صاحب نے ریلوے گارڈ کی طرح گلے میں سیٹی ڈالی ہوئی تھی۔ مقابلہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں دو ماسٹر صاحبان سفید ڈوری لئے کھڑے تھے۔ سفید قمیص اور نیکر پہنے ایک دس سالہ بچے کو جو

ننگے پاؤں تھا اس کے بڑے بھائی نے دوڑنے والے بچوں کی قطار میں کھڑا کر دیا۔ سیٹی بجی دوڑ شروع ہوئی، سفید ڈوری آ گئی اور نتیجہ نکل آیا۔ وہ بچہ دوڑ میں اول آ گیا۔ اس کے بعد اگلی دوڑ اور اس سے اگلی دوڑ، اگلا برس اور اس سے اگلا برس۔ وہ لڑکا دوڑتا چلا گیا۔ انعامات ملتے چلے گئے۔ سات سال کے بعد اس نے مسلم یونیورسٹی کے جونیئر چمپین کی حیثیت سے کپ اور شیلڈ سامنے رکھ کر اپنی تصویر اتروائی۔ تصویر دیکھ کر والد محترم نے کہا، یوں بے نشاں راہ پر دوڑتے ہوئے کہاں جا رہے ہو۔ زندگی کی شاہراہ پر دوڑنے کے لئے جو اہلیت درکار ہے وہ پیدا کرو۔

چو بجانِ من درآئی دگر آرزو نہ بینی   مگر ایں کہ شبنم تو یم بے کنار بادا

مسافر نے ناصح مشفق کے کتب خانہ سے خطبات کی ایک کتاب اٹھا کر کھولی۔ لکھا ہے، آج کا دن بدن کو چھریرا بنانے کا ہے اور کل کا دن دوڑ کے لئے مقرر ہو چکا ہے۔ خطبہ کی پاورقی شرح میں لکھا ہے مراد یہ کہ آج اگر گناہوں سے ہلکے ہو گے تو کل قیامت کے میدان میں خوب دوڑو گے۔

گھڑی کا وقت ملانے کی کوشش جاری ہے۔ چونکہ مسافر اسے بہت پیچھے لے گیا ہے اس لئے اب سوئیوں کو قینچی کی طرح وقت کاٹتے اور آگے بڑھتا ہوا دیکھ رہا ہے ۱۹۳۶ء کے اولمپک کھیل برلن میں ہوئے اور دو نئے چہروں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ایک آریا نسل کی برتری کا علم بردار اڈولف ہٹلر اور دوسرا اس علم کو اولمپک کے کھچا کھچ بھرے ہوئے سٹیڈیم میں سرنگوں کرنے والا حبشی نژاد جے سی اوون۔ اس حبشی ورزش کار نے ایک مرتبہ پینتالیس منٹ کے وقفہ میں چار عالمی ریکارڈ قائم کئے تھے۔ اس کی لمبی چھلانگ اتنی لمبی تھی کہ بیس پچیس برس آگے نکل گئی۔ اس طویل عرصہ میں ہر اولمپک کے موقع پر اوون کی تصویریں اخباروں میں شائع

ہوتیں کہ اس شخص کا قائم کیا ہوا ریکارڈ ابھی تک جوں کا توں قائم ہے۔ ایک تصویر مسافر کے ذہن میں محفوظ ہے۔ ایک نوجوان حبشی گھاس کے میدان میں دو سفید لکیروں کے درمیان بنی ہوئی پٹی پر دوڑ کا آغاز کر رہا ہے۔ زمین پر جھکا ہوا جسم، تیر کی نوک کی طرح سر، پوری کھلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں، ایک پیر اور اس کے خلاف رخ کا ہاتھ ہوا میں آگے اور دوسرا پیر اور ہاتھ زمین پر پیچھے۔ یوں لگتا ہے جیسے دو ایک قدم کے بعد یہ شخص ہوا میں اڑنے لگے گا۔

گھڑی کی سوئیاں اب جے سی اوون کی طرح ہوا ہو گئی ہیں۔ یہ ہلسنکی اولمپک ہے۔ یہاں شیشے اتنے بڑے اور شفاف ہیں کہ صوفی صاحب کھلی اور بے روک ٹوک جگہ سمجھ کر شیشے کی دیوار کے پار جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیشہ ٹوٹ گیا اور خبر چھپ گئی۔ یہ ملبورن اولمپک ہے۔ پہلے روز ایک دستہ کے ساتھ آنے والے خانساماں نے اعلان کیا کہ وہ دراصل افسر ہے اور یہ حیثیت محض کھیل دیکھنے کا بہانہ ہے لہذا ان سے کام کرنے کی توقع نہ رکھی جائے۔ دوسرے دستہ کی ان تھک باورچن کے بارے میں آخری روز معلوم ہوا کہ وہ ایک وزیر کی بیوی ہے اور اس نے کھیل دیکھنے کے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے۔ یہ میونخ اولمپک ہے۔ ہاکی کا کھلاڑی تمغا جوتے میں ڈال کر ہوا میں لہراتا ہے۔ اس دستہ کا ایک منتظم پانی کی بھری ہوئی بالٹی بین الاقوامی ہاکی فیڈریشن کے صدر پر انڈیل دیتا ہے۔

گھڑی کا وقت آگے پیچھے ہو گیا ہے۔ یہ ابھرتی قوموں کے کھیلوں کی افتتاحی تقریب ہے جو ہند چینی کے ایک شہر میں منعقد ہو رہی ہے۔ مسافر سٹیڈیم کے جنوبی حصہ میں ہے اور شمالی حصہ کی دس ہزار نشستوں پر نوجوان ہاتھوں میں رنگدار فلیش کارڈ لئے بیٹھے ہیں ہر کارڈ پر تصویر کا ایک بٹا دس ہزارواں حصہ بنا ہوا ہے۔ وہ کارڈ سے کارڈ ملا لیتے ہیں اور افق تا افق ایک وسیع منظر کا عکس چھا جاتا ہے۔ کبھی افق کو طویل انقلابی نعرہ ڈھک لیتا ہے۔ نیا منظر نئے

نعرے، نئے لوگ نئی دنیا۔ ان نئی نئی تصویروں اور تحریروں کی طرح دنیا کے نقشے پر نئی نئی قومیں اور ملک ابھر رہے ہیں تقریب جاری ہے۔ مختلف قوموں کے کھلاڑی گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔ سب کا خیر مقدم تالیوں سے ہو رہا ہے۔ چند گروہ بے گھر اور بے ملک قوموں کے ہیں۔ ان کے لئے تالیوں کا شور خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ فلسطین کا دستہ ابھی گذرا ہے۔ خیال تھا کہ اب اس سے زیادہ زور سے تالیاں بجانے کی نوبت کہاں آئے گی۔ لیکن ایک دستہ اور آیا۔ پچاس ہزار تماشائی اپنی نشستوں سے اس کے احترام میں کھڑے ہوئے اور آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس دستہ کا اگلا حصہ دُبلی پتلی لڑکیوں پر مشتمل ہے جو بند گلے کے لمبے زمین پر سرسراتے ہوئے سادہ سلک کے فراک پہنے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں پھول اور چہرہ پر امن کی فاختئی معصومیت۔ یہ ایک چھوٹے سے ملک کا دستہ ہے جو اس وقت ایک سپر پاور سے جنگ کر رہا ہے اور شدید بمباری کی زد میں ہے۔ لڑا دے ممولے کو شہباز سے یہ منظر روز روز دیکھنے میں کہاں آتا ہے۔

یہ وسطی افریقہ کا شہر ہے۔ کھیل کے منتظمین جمع ہیں۔ مسافران میں شامل ہے جاپان کا نمائندہ تقریر کر رہا ہے اور خوش اخلاقی کے مارے دُہرا ہوا جا رہا ہے۔ ترجمے کے دوران بھی اس کی یہی کیفیت ہے۔ وہ دوسرے ممالک کے نمائندوں کا شکر گذار ہے کہ جاپان کو گذشتہ برسوں کے پنگ پانگ کے عالمی چمپئن کھلاڑیوں کو جمع کرنے اور اس سطح پر تکنیکی مباحثہ کرانے کی اجازت دی گئی ہے۔ وہ اپنے اخراجات پر اس تحقیق کا انتظام کر رہے ہیں اور رپورٹ شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اجلاس کے صدر نے کہا دراصل اس کا شکریہ تو ہمیں ادا کرنا چاہیئے۔ اتنے میں ایک نمائندہ کھڑا ہوا جس کے چہرہ پر غصّہ کی آورد عیاں ہے۔ کہنے لگا میں اس توہین کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس جاپانی مباحثہ میں شرکت

کے لئے میرے ملک کو دعوت نامہ نہیں دیا گیا۔ جواب ملا کہ دعوت نامہ کسی ملک کو بھی نہیں دیا گیا صرف سابقہ عالمی چیمپئن بلائے گئے ہیں۔ جواب الجواب میں دلیل آئی' مجھے دوسرے ملکوں سے کیا غرض میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ملک کو اس لئے نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ جہانِ سوم میں شامل ہے اور جاپان جہانِ اوّل کا ترقی یافتہ ملک ہے۔ ہم جاپان سے بھیک نہیں مانگتے۔ ہم اپنا خرچہ خود برداشت کریں گے۔ جلسہ باہمی مشورہ کی مہلت کے بعد دوبارہ شروع ہوا۔ جاپان کا مندوب پھر تقریر کرنے لگا اور ترجمہ کے ختم ہونے کے بعد دیر تک جھک جھک کر معافی مانگتا رہا۔ میں اپنی کوتاہی کے لئے معافی کا خواستگار ہوں امید ہے میرے معزز دوست فراخ دلی سے معاف کر دیں گے۔ میں غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر قابلِ احترام دوست کا عظیم ملک اپنے انتظامات کے تحت اس مباحثہ کے دوران حاضر رہنا چاہتا ہے تو ہم اسے بڑی خوشی سے اس سہ روزہ مباحثہ میں شریک ہونے کی دعوت دے سکتے ہیں۔ جس ہال میں مباحثہ ہوگا اس میں بہت کرسیاں ہیں اور اگر ان میں ایک کرسی پر میرے یہ واجب صد تعظیم دوست بیٹھنے پر مصر ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اعتراض کرنے والا پھر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا مجھے تین دن کے لئے نہیں ایک مہینہ کے لئے دعوت نامہ چاہیئے۔ میں تین دن میں جاپان کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ اتنی سی بات جاپان کے وفد کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ جاپانی وفد نے کہا' اس مباحثہ کے بعد آپ ہمارے ملک کی جتنی سیر کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوگی۔ اس سیر کے لئے کسی دعوت نامہ کی ضرورت نہیں۔ خلیج فارس کی شہری ریاست کا نمائندہ ایک بار پھر کھڑا ہوا۔ اس مرتبہ اس کے چہرہ پر آمد کے آثار تھے۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا اس نے صاف بیان کر دیا۔ جناب والا اگر آپ کے دعوت نامہ میں سہ روزہ مباحثہ لکھا ہوگا تو مجھے اجازت دینے والے زیادہ سے

زیادہ ایک ہفتہ کے لئے بھیجیں گے حالانکہ میں آپ کے ملک میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ سیر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری خاطر دعوت نامہ میں یہ سطر بڑھا دیں کہ مباحثہ کے بعد جاپان کا ایک ماہ کا مطالعاتی دورہ بہت مفید ہوگا۔ یہ سن کر دو تین نمائندے اور کھڑے ہوگئے: کہنے لگے اس مضمون کا دعوت نامہ ہمیں بھی درکار ہے۔ بقول جاپانی مندوب ہال میں بہت سی کرسیاں ہونگیں۔ کیا یہ ہمیں ان پر بیٹھنے کی دعوت بھی نہیں دے سکتے۔ جلسہ پھر باہمی مشورت کے لئے ملتوی ہونے کے بعد تیسری بار شروع ہوا۔ یک نفری جاپانی وفد غلط فہمی اور کوتاہی کی معافی مانگتے ہوئے زمین سے لگ گیا۔ وہ انگریزی میں ٹائپ کئے ہوئے دعوت نامے پیش کر رہا ہے جس میں مباحثہ کے بعد طویل مطالعاتی دورے کی پرزور سفارش موجود ہے۔

یہ کھیلوں کی دنیا ہے۔ اس میں پس پردہ کئی کھیل کھیلے جاتے ہیں۔

گھڑی ابھی تک وقت سے کچھ پیچھے ہے۔ مسافر چند ہمراہیوں کے ساتھ بنکاک سے گذر رہا ہے۔ اس کے ساتھ تن سازی کے مقابلہ میں مسٹر ایشیا کا خطاب اور تمغا پانے والا نوجوان بھی ہے۔ مقابلہ کے آخری دور میں اس کا جوڑ سری لنکا کے اس کھلاڑی سے پڑ گیا جس کا مینیجر منصفین میں شامل تھا۔ تن سازی کے مقابلوں میں سرخی پوڈر سے جسم کی زیبائش ممنوع ہے لیکن اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نوجوان تن ساز نے تیل میں سینڈر ملا کر اس کی مالش کرلی۔ وہ اسٹیج پر آیا اور اس کے گٹھیلے سُرخ روغنی جسم پر روشنی کی شعاعیں پھسلنے لگیں۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے ہال کو سر پر اٹھا کر اس کو داد دی۔ تماشائی اس کو مسٹر ایشیا منتخب کر چکے تھے منصفین کے فیصلہ کا انتظار تھا۔ سری لنکا کا منصف اسے شاباش دینے کے لئے اسٹیج پر گیا اور پیٹھ ٹھونکتے ہوئے ایک سفید رومال اس کے جسم سے رگڑا اور ہال میں پھینک دیا۔ رومال پر تیل اور سینڈر لگا ہوا تھا۔ ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور

بڑی مشکل اور بڑی دیر کے بعد اس نوجوان کی جاں بخشی بلکہ تن بخشی پر ختم ہوا۔ بالآخر وہ مسٹر ایشیا قرار دیا گیا۔ مسٹر ایشیا کا جسم رنگ آمیزی کے بغیر بھی سب سے اچھا تھا مگر یہ نوجوان اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ بنکاک میں قدم قدم پر ایسے حمام کھلے ہوئے ہیں جن کے آگے حرم سرائیں ماند پڑ جائیں۔ مسٹر ایشیا مسکین صورت بنائے اور ڈھیلی ڈھالی بش شرٹ پہنے ایک حمام میں داخل ہوئے فیس داخلہ ریزگاری گن کر ادا کی اور آگے بڑھے۔ ایک حمامی نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ جسم کو ہاتھ لگایا تو یقین نہ آیا ٹٹول کر دیکھا تو حیرت ہوئی۔ ممکن ہے گاہک نے گولی کو بے اثر کرنے والی جیکٹ نیچے پہنی ہو۔ کپڑے ایک ایک کر کے تن سے جدا ہوتے رہے اور عقدہ کھلتا چلا گیا۔ گندھا ہوا گٹھا ہوا کمایا ہوا جسم۔ فاضل کپڑوں کے اندر لپٹا ہوا سنگ مرمر کا سڈول مجسمہ جسے کسی نے بڑی محنت سے تراشا تھا۔ مجسمہ کے گلے میں مسٹر ایشیا کا تمغا پڑا ہوا دیکھ کر حمامی نے چیخ ماری اور لوگوں کو پکارنا شروع کیا۔ نہانے والے اور نہلانے والے اپنے کابکوں سے نکل آئے۔ کچھ تولیہ باندھے ہوئے بعض تولیے ہاتھ میں لئے اور بیشتر خالی ہاتھ۔ سب حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور مسٹر ایشیا نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کیا۔ عضو عضو کی نمائش، عضلات کے ابھار کا دکھاوا رگ پٹھوں کے اتار چڑھاؤ کا تماشہ، جسم کے مختلف اور مشکل زاویوں کا مظاہرہ۔ حیرت اور مسرت سے ملی جلی چیخیں حمام میں بلند ہوتی رہیں۔ حمام کی انتظامیہ بھی اس تماشہ میں شریک ہو گئی۔ غسل کی فیس واپس، تحائف پیش خدمت، سرپرستی کا شکریہ، مشتہری کے لئے عکاسی دوبارہ قدم رنجہ فرمانے کی درخواست۔ نہانے والوں نے چندہ کیا جیسے اپنے بھدے اور بے ڈول جسموں کا ہرجانہ بھر رہے ہوں۔ پانچ ڈالر کی ریزگاری دے کر حمام میں داخل ہونے والا مسکین اس غسل شہرت کے بعد ایک سو پانچ ڈالر کے نوٹ لے کر باہر سڑک پر آیا۔ یہ ایک

ایشیائی شہر کی شاہ راہ ہے اور وہ مسٹر ایشیا ہے خود نمائی کی شاہراہ سے کتنی ہی پگڈنڈیاں نکلتی ہیں اور ان میں سے ایک اس حمام کی طرف جاتی ہے جہاں سب ننگے ہیں۔

گھڑی اب صحیح وقت بتا رہی ہے۔ یہ مانٹریال ہے اور ابھی اکیسویں اولمپک کی رنگا رنگ افتتاحی تقریب ختم ہوئی ہے۔ آج تک یہی رواج تھا کہ ایک مشعل بردار کوہ اولمپیا سے کھیلوں کے سٹیڈیم تک سفر کرنے والے شعلہ کو لے کر داخل ہو۔ میدان کا چکر لگائے اور اولمپک ٹارچ روشن کرے۔ آج اس قدیم روایت کو توڑا گیا۔ یک نہ شد دو شد۔ مشعل بردار ورزش کار نے جس ہاتھ میں مشعل پکڑی ہوئی تھی اس کی کلائی ایک لڑکی کے ہاتھ میں تھی اور دونوں قدم ملا کر دوڑ رہے تھے۔ برابری کی دوڑ میں بالآخر عورتوں نے مردوں کو آن پکڑا ہے۔ شعلہ بلند ہوا کبوتر چھوڑے گئے غبارے اڑائے گئے ہر ملک کا ترانہ بجا ہر ملک کے دستہ نے خوشنما وردیوں میں قواعد کی۔ دو مختصر تقریروں کے بعد ملکہ ایلزبتھ دوم کے مختصر اعلان کی رُو سے باضابطہ افتتاح ہوا۔ اس خوشی میں میزبان ملک کے لڑکے لڑکیوں کے بیشمار طائفے جسمانی ورزش کے مظاہرہ کے لئے میدان میں داخل ہوئے۔ رنگا رنگ اور چست لباس میں ملبوس، ہاتھوں میں سلک کی رنگین لہراتی پٹیاں لئے پس منظری موسیقی کی دُھن کے مطابق کرتبوں میں ایسے محو ہوئے کہ اجتماعی ورزش ایک عوامی ناچ میں تبدیل ہو گئی۔ تقریب ختم ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ خصوصی احاطہ کے مہمان ایک سرنگ کے ذریعہ کار پارک تک پہنچے ہیں اور اس کے دہانے پر کھڑے موٹروں کا انتظار کر رہے ہیں مسافر کے ساتھ ایک عمر رسیدہ حبشی جوڑا کھڑا ہے! اس نے بوڑھے حبشی کی طرف دیکھا۔ شکل آشنا لگا۔ ذہن پر زور دیا اور ان تمام اہم سیاہ پوست لوگوں کی شکلیں یاد کیں جن سے کہیں نہ کہیں واسطہ پڑا تھا۔ یہ صورت ان سے مختلف ہے

مسافر نے ایک کتابی تصویر میں زمین پر جھکے ہوئے کھلاڑی کو سیدھا کھڑا کیا اور اس کی عمر میں چالیس برس کا اضافہ کیا۔ معاملہ حل ہو گیا۔ یہ شخص جے سی اوون ہے۔ مسافر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ یوں لگا جیسے مسافر اور اوون دونوں مل کر سرفراز ہاؤس کے چٹیل میدان میں ننگے پاؤں تین ٹنگری دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں تخیال ان کپڑوں کی تہہ درست کر رہا ہے جو کبھی سلے بھی نہ تھے۔

خاردار تاروں کے جال نے لہلہاتے سبزہ زار کے اس فرش کو گھیرے میں لے رکھا ہے جس کے وسط میں دو سیک تکونی نوکدار بیس منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں۔ دروازوں پر کڑا پہرہ ہے۔ کچھ پہرہ دار عمارتوں کے مختلف حصوں میں بھی تعینات ہیں سڑک پر چلنے والی موٹریں ان عمارتوں کے سامنے آکر آہستہ ہو جاتی ہیں۔ راہ گیر تھم جاتے ہیں دن بھر ان کے دروازوں پر تماشائیوں کا ہجوم رہتا ہے اور کچھ شوق کے مارے رات گئے تک وہاں منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان رہائشی نو تعمیر عمارتوں میں اولمپک میں شریک ہونے والے کھلاڑی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ سو ملکوں کے باشندے اور کوئی سو کھیلوں کے ماہر۔ ہجوم ہنرمنداں مسافر نے اس سے پہلے اتنے بہت سے ہنرور صرف ویسٹ منسٹر ایبے میں دیکھے تھے۔ مگر وہ منتخب روزگار فرش کے نیچے دفن تھے۔ یہاں ہر شخص زندہ ہے اور کسی نہ کسی ہنر اور کسی نہ کسی علاقہ میں فرد ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عالمی سطح پر کون منفرد ہے۔ یہ کل تین ہفتوں کی دنیا ہے، اس کے ازل سے ابد تک صرف اکیس دن ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں مقابلے ہونگے۔ جیتنے والوں کو ٹی۔ وی پر ایک عالم دیکھے گا، تصویریں رسالوں کے سرورق پر چھپیں گی اور اس کے بعد کچھ کارنامے کتابوں میں محفوظ ہو جائیں گے اور بہت سی باتیں زمانہ طاق نسیاں پر رکھ کر بھول جائیگا۔ ان جڑواں اہرامی ساخت عمارتوں میں تین ہفتہ کے لئے تین ہزار

برس پہلے کی تاریخ مہمان بن کر ٹھہری ہوئی ہے۔ خاردار جنگلہ کے اندر سپارٹہ کی یونانی ریاست واقع ہے اور باہر برٹش کامن ویلتھ۔ اندر عظیم لکرگس حکمران ہے اور باہر ایک بے چارہ وزیر اعظم جسے اس کی بیگم اور کیوبک کے ایک رہنما نے مل کر عاجز کر رکھا ہے۔ دونوں علیحدگی پسند ہیں، یہ خانگی طور پر اور وہ علاقائی طور پر۔ مسافر کے لئے یہ باڑ لگا مخصوص خطہ فراغت کا ایک وسیع صحرا ہے۔ وہ اپنے ماہ و سال کی ریت کے ٹیلہ پر بیٹھ کر منظر میں کھو جاتا ہے۔ غزالوں کی ڈاریں، ہرنوں کی کلیلیں، آہو کا بے پروا خرام۔ یہ نوجوان کھلاڑی چلتے ہیں تو ڈگ بھرتے ہیں چڑھتے ہیں تو سیڑھیاں پھلانگتے ہیں، رکتے ہیں تو اوپر کا دھڑ لٹو کی طرح گھماتے ہیں، گھاس پر لیٹتے ہیں تو نچلا دھڑ ہوا میں اٹھا کر ٹانگیں مارنے لگتے ہیں۔ کوئی ہاتھ کھولتا اور ملاتا ہے، دیر تک۔ کوئی ٹانگیں جدا کرتا اور جوڑتا ہے، بہت دیر تک۔ کوئی کمر کو دائیں بائیں بل دے رہا ہے، بار بار۔ کوئی رسی پہ چڑھتا اترتا ہے، گھنٹہ بھر سے۔ کوئی رسی کود رہا ہے، ہزار بلکہ صد ہزار بار۔ نہ ان کو سیدھا کھڑا ہونا آتا ہے اور نہ ساکت رہنا۔ ان کی ریڑھ چینی ہڈی سے بنی ہے۔ ان کے جسم میں بجلی بھری ہے۔ مشق ہو تو محنت کرتے ہیں، مقابلہ ہو تو تہلکہ مچاتے ہیں، فرصت ہو تو ہلکم ڈالتے ہیں۔ یہ ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں کہ اس حرکت میں ان کے لئے اور ان کی قوموں کے لئے برکت ہے۔

اس تین ہفتہ کی دنیا میں بھوک اور بیماری کا نام و نشان نہیں ملتا۔ بیماری صرف اس حد تک ہے کہ جب صحت کو اس قدر شدت سے کام لاتے ہیں تو کوئی پٹھا چڑھ جاتا ہے کوئی جوڑ اتر جاتا ہے، گاہے موچ آجاتی ہے۔ بھوک صرف اس حد تک ہے کہ کھانے کے لئے کمرہ سے ہال تک فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ اس ہال میں چوبیس گھنٹہ بلا مبالغہ دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں آب میوہ کے چشمے پھوٹتے ہیں اور آئس کریم کے پہاڑ

کھڑے ہوتے ہیں۔ جو کھانا درکار ہو وہ موجود جتنا درکار ہو اس سے زیادہ موجود۔ نو ہزار پیٹ دن میں چار پانچ مرتبہ پوجا کرتے ہیں اور اتنے ہی سفری تھیلہ بھر لیتے ہیں مگر کھانے کی اقسام یا ان کی افراط میں ذرا کمی نہیں آتی۔ تیسرے دن اخبارات میں اس عیاشی پر لے دے شروع ہو گئی۔ لیکن کھیل شروع ہو چکے ہیں اور سب کا دھیان اب نادیا کومانچی کی طرف لگا ہوا ہے۔

کھیل شروع ہیں۔ کھلاڑی مصروف ہیں تماشائی ان سے بھی زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔ البرٹویاں تورینو چار سو اور آٹھ سو میٹر کی دوڑ میں بھاگتے ہوئے یوں اوّل آیا جیسے غلطی سے گھڑ دوڑ کے میدان کے بجائے مانٹریال سٹیڈیم میں آ نکلا ہو۔ دیکھنے والوں نے حیرت سے تالیاں بجائیں اور پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کیوبا سے آنے والے اس نوجوان کی رگوں میں کونسا خون دوڑ رہا ہے۔ جواب ملا کہ اولمپک کی تیاری کے سلسلہ میں ان کا بہت سا خون نکال کر خشک پلازمہ جمع کر لیا گیا تھا اب وہ دوڑنے سے پہلے خونابہ کا ٹیکہ لگواتے اور اوّل آتے ہیں۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے اس لئے خونِ جگر پینے کے انداز بدل گئے ہیں۔ سائنس بھی ترقی کر رہی ہے اس لئے شمشیر بازی کے مقابلہ کے ہال میں جو تختہ حساب لگا ہے وہ شمشیر بازوں کو ہر ضرب پر خود بخود نمبر دیتا چلا جاتا ہے۔ بورس ادنس چنکو عجیب و غریب پینترے دکھا رہے ہیں۔ ان کی شمشیر مخالف کے جسم سے چھوتی بھی نہیں اور ان کے نمبر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ قدم جرمن کے بڑھتے ہیں اور فتح سرکار کی ہوتی ہے۔ تاہم کسے شکایت ہوتی ہے معائنہ ہوتا ہے اور راز طشت از بام ہو جاتا ہے۔ نوک شمشیر میں بے تار برقی کا آلہ لگا ہوا ہے جس کا بٹن دبانے سے ایک نظر نہ آنے والی لہر مخالف کی وردی سے ٹکراتی اور تختہ حساب کی مشین کو اپنا پیغام

بھیجتی رہتی ہے۔ تار برقی سے یہ خبر تمام اخباروں کو بھیجی جا رہی ہے۔ شمشیر کی خفیہ خوبیاں سرعام رسوائیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ایک اور دوڑ ختم ہوئی تو جیتنے والے نے تماشائیوں کی داد وصول کرنے کے لئے میدان کا آہستہ آہستہ ایک چکر لگایا اور ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے ان کی تالیوں کا جواب دیا۔ اس نے دونوں بلند ہاتھوں میں جوتے پکڑے ہوئے ہیں اور ننگے پاؤں بھاگ رہا ہے۔ یوں انعام لینے کے لئے آنے میں جو چند منٹ صرف ہو رہے ہیں ان میں یہ سوال اٹھایا جا چکا ہے کہ کیا اس جیتنے والے نے جوتے بنانے والی کمپنی سے اشتہار کا معاوضہ تو نہیں طے کر رکھا۔

کھیل جاری ہیں اور طرح طرح کے تماشے دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ دو سیاہ فام بھائی باکسنگ کے ابتدائی مقابلوں میں کامیاب ہوئے تو پتہ چلا کہ ان کی ماں کے پاس ٹی وی نہیں کہ وہ اپنے بیٹوں کا کھیل دیکھ سکے۔ خبر چھپی اور تحفے میں کئی ٹی وی پہنچ گئے پھر وہ دونوں بھائی فائنل مقابلہ میں آ گئے اور کسی نے ہوائی ٹکٹ فراہم کر دیا۔ مائک اور لیو آن سپنک نے جب اپنے سنہری تمغے جیتے تو ان کی ماں وہاں موجود تھی۔ اس کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کشتی چلانے کے ایک مقابلہ میں جیتنے والوں کی خوشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کشتی رانی چھوڑ کر ناچنا شروع کر دیا۔ توازن خراب ہوا اور کشتی الٹ کر ڈوب گئی۔ خوشی میں غرق ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ ضبط کا مظاہرہ البتہ ایک بڑی بات ہے۔ مسافر نے کورنیلیا اینڈرز کو ایک سہ پہر نصف گھنٹہ میں پیراکی کے دو عالمی ریکارڈ قائم کرتے دیکھا۔ اس نے کل چار طلائی اور ایک نقرئی تمغا حاصل کیا اور اخباروں نے لکھا کہ وہ پیراکی میں عہد حاضر کی عظیم ترین خاتون ورزش کار ہے۔ اس کے پرسکون چہرہ پر سکون کی دبیز تہ اور چڑھ گئی۔ نادیا کومانچی نے ہلچل مچا دی ہے۔ جمناسٹک کے

کئی مظاہروں میں دس میں سے دس نمبر لئے ہیں۔ اخبار اسے جہانِ ورزش کا نو دریافت اور روشن ترین ستارہ لکھتے ہیں اور وہ اس کامیابی کے بعد ایک عام بچی کی طرح گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ مسافر نے ضبط کا ایک اور مظاہرہ دیکھا۔ شہر ک ادلمپک میں کھیلوں کا کتب خانہ کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ ہر کھیل کے قواعد وضوابط اس پر لکھی ہوئی کتابیں اس پر ہونے والی بحثوں کے خلاصہ اور اس کھیل کی وی سی آر فلمیں موجود ہیں۔ میدانی دوڑ سے متعلق کتب خانہ کے حصہ میں ایک کھلاڑی ہر روز گھنٹوں اپنا چہرہ ہاتھوں کی رحل پر رکھے گذشتہ مقابلوں کی فلمیں دیکھتا رہتا ہے۔ فلم کو کبھی آہستہ چلاتا ہے کبھی بالکل روک دیتا ہے۔ ہر قدم کی تصویر کو غور سے دیکھتا اور پرکھتا ہے پھر اگلے قدم کی تصویر پر اٹک جاتا ہے اور اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھتا رہتا ہے۔ اس دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ یہ کھلاڑی ہار گیا مگر دوسرے دن اسی طرح کتب خانہ میں بیٹھا بڑے انہماک سے دیکھنے اور پڑھنے اور لکھنے میں مصروف تھا کہنے لگا، اگر کھیل کا سارا مزہ جیت میں ہوتا تو اتنے لوگ کبھی اس میں شریک نہ ہوتے۔ کھیل میرے لئے ایک عبادت ہے۔ کتب خانہ کے پاس ایک کمرہ عبادت کے لئے مخصوص ہے مگر کسی مخصوص عبادت کے لئے نہیں ہے۔ ہر مذہب کے پیرو اپنی عبادت کے وقت اس کمرہ کو استعمال کرتے ہیں۔ آج جمعہ ہے۔ کچھ لوگ نماز کے لئے کمرہ میں داخل ہو رہے ہیں کچھ اپنی عبادت سے فارغ ہو کر باہر نکل رہے ہیں۔ گول دائرہ میں گدیاں لگی ہوئی ہیں انہیں اٹھا کر قطار میں صفیں بچھائی جا رہی ہیں۔ کچھ لوگوں کے لئے کھیل عبادت ہوتی ہے اور کچھ عبادت کو کھیل بنا لیتے ہیں۔

مسافر آج بڑا خوش ہے۔ اس کا ایک اور خواب پورا ہونے والا ہے۔ اس کے خواب پورے ہوتے رہتے ہیں اور وہ نئے نئے خواب دیکھتا رہتا ہے۔ ایسے خواب

دیکھنا شاید گستاخی ہے۔ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔ آج کھیلوں میں وہ مقابلہ ہونے والا ہے جس کی کشش اسے مانٹریال کھینچ کر لائی ہے۔ اولمپک شروع ہونے سے پہلے مسافر نے پروگرام کے جہازی نقشہ کو سفری تختِ خواب پر بچھایا اور اس کے ایک ایک نقطہ کو کئی کئی بار پڑھا۔ مقابلے شہر میں کئی جگہ پر بہ یک وقت ہو رہے ہیں۔ تاریخ وقت مقام اور کھیل کا نام نقشہ میں درج ہے۔ گھنٹوں غور کرنے کے بعد اس نے اپنی دلچسپی کے کھیلوں پر سیاہ پنسل سے نشان لگائے تاکہ فاصلہ اور اسے طے کرنے کا وسیلہ زیرِ غور آ سکے۔ ترجیحات طے کرنے کے بعد نیلی پنسل سے نشان لگانے کا مرحلہ آ گیا۔ کچھ دیر پروگرام کے نقشہ پر اوندھے جھکے رہنے کے بعد دو چار جگہ سرخ پنسل سے نشان لگا دیا۔ آج وہ مقابلہ ہو گا جس پر سب سے گہرا لال نشان لگا ہوا ہے۔ مسافر کو سیاہ اور نیلے اور سرخ نشانات کی پیروی میں بڑی ریاضت کرنی پڑی۔ جگہ نئی، بھیڑ بے تحاشہ، وقت کمیاب، زرِ مبادلہ کمتر، فاصلے ٹریفک کے شلوغ کی وجہ سے طول پکڑ گئے، دعوتوں اور ملاقاتوں سے انکار کی وجہ سے بات طول پکڑ گئی، میلوں قدم مارنے پڑے، روزانہ ایک وقت کا کھانا چھوڑنا پڑا۔ رہا آرام تو اس کے لئے جو لوگ مانٹریال آئے ہیں ان میں مسافر شامل نہیں۔ وہ ایک مقابلہ میں شریک ہے کیونکہ اولمپک میں کھلاڑیوں کے علاوہ تماشائیوں کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔

مسافر آج اس دوڑ کا مقابلہ دیکھنے جا رہا ہے جو اس کی نظر میں سب سے اہم ہے۔ یہ برق رفتاری اور تیز گامی کا مقابلہ ہے، اسے انگریزی میں دوڑ نہیں ڈیش کہتے ہیں۔ سو میٹر اور نو سیکنڈ میں یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ دنیا کی چار ارب آبادی میں سب سے تیز رفتار آدمی کون ہے۔

مسافر سٹیڈیم کی طرف روانہ ہوا۔ روِش پر سیاح چادریں پھیلائے سو رہا تھیں

بج رہے ہیں۔ سبزہ پر جگہ جگہ منڈلی لگی ہے۔ بازی گر کرتب دکھا رہا ہے۔ واعظ وعظ کر رہا ہے۔
دو تین لڑکے لڑکیاں چھوٹے چھوٹے ناٹک کرتے اور چٹکلے سناتے ہیں۔ یہ اولمپک کی پیروڈی
کر رہے ہیں۔ لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ اشیائے خوردنی کے دست فروش بھی مسافر
کا راستہ روکے کھڑے ہیں۔ مگر وہ اپنی دُھن میں چلا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ وقت سے بہت
پہلے پہنچ کر دوڑ کا صحیح لُطف لینے کے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کر سکے۔ وہ خصوصی نشستوں کے
احاطہ میں پہلے بلندی کا تعین کرتا ہے۔ اگر سیڑھیوں پر بہت اوپر چلا جاتا ہے تو کھلاڑی بچکے
ہوئے نظر آتے ہیں، بہت نیچے چلا جاتا ہے تو کھلاڑی ایک دوسرے کے پیچھے چھپ جاتے
ہیں۔ وہ دسویں سیڑھی کو بہر طور مناسب پاتا ہے۔ جب یہ مشکل مسئلہ حل ہوا تو یہ طے کرنا
پڑا کہ سو میٹر کی لکیر کے کونسے حصّہ کے سامنے بیٹھا جائے۔ جہاں سے دوڑ کا آغاز ہو
رہا ہے اس کی سیدھ میں بیٹھیں تو شروعات کا مزہ آئے گا مگر باقی تمام دوڑ کے دوران
کھلاڑیوں کی پشت نظر آئے گی۔ جہاں مقابلہ ختم ہو رہا ہے وہاں بیٹھیں تو دوڑ کے پہلے
حصہ کا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ مسافر ساٹھ میٹر کے فاصلہ کی سیدھ میں دسویں بلند سیڑھی
پر پلاسٹک کی ڈول نما کرسی میں اتر گیا۔ اس نشست سے سو میٹر کی دوڑ کا پورا میدان
نظر آتا ہے لہٰذا دوڑ دیکھنے کے لئے گردن کی جنبش میں ضائع ہونیوالا وقت بھی بچ جائیگا۔
کیمرہ سے خالی میدان اور ہجوم سے پُر سٹیڈیم کی دو ایک تصویریں بنائیں۔ جب دیکھا کہ
اس کام میں انتہائی چابکدستی کے باوجود چند سیکنڈ صرف ہو جاتے ہیں تو اس نے کیمرہ خول
میں بند کیا اور پیروں کے درمیان فرش پر رکھ دیا۔ وہ ایک تصویر کی خاطر اس دوڑ کے تہائی
حصہ سے محروم ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ پستول چلنے اور دوڑ کے
ختم ہونے تک وہ آنکھ نہیں جھپکے گا۔ دوڑ شروع ہوا چاہتی ہے۔ پستول والا ہاتھ ہوا میں

بند ہے۔ آٹھ کھلاڑی گھٹنے اور انگلیاں زمین پر ٹیک کر اپنی اپنی لین میں جھک گئے ہیں
پیر جما لیئے تو سر اٹھا کر آنکھیں سو میٹر آگے لگی ہوئی رسّی پر گاڑ دیں۔ ان میں عالمی ریکارڈ
قائم کرنے والا بکلی موجود ہے اور وہ کھلاڑی بھی شامل ہے جس نے یہ مقابلہ میونخ میں جیتا
تھا۔ دو ایک بار ان دونوں کو ہرانے والے بھی قطار میں کھڑے ہیں۔ ایک لاکھ تماشائیوں
نے دم سادھ لیا۔ ساری آوازیں خاموش ہو گئیں۔ خاموشی کہہ رہی ہے کہ کوئی انہونی ہونے
والی ہے۔ بلبلی دبی پستول چلا کھلاڑیوں نے جست لگائی اور فائنل مقابلہ شروع ہو گیا
دوش بدوش اور سینہ بسپر کھلاڑیوں کی ایک دوڑتی ہوئی دیوار پچاس میٹر تک آئی۔ اس
کے بعد دیوار میں ہلکی سی دراڑیں پڑنی شروع ہوئیں جو ثانیہ بھر میں شگاف بن گئیں۔ شکستہ
دیوار کے ایک شگاف سے کالے ہرن نے جست لگائی اوروں سے آگے نکلا اور حد
کے اس پار پہنچ گیا۔ مقابلہ ختم ہوا۔ دیوار ڈھے کر خشت خشت ہو گئی۔ کون سیاہ پوست
جیتا اور کون سفید فام ہارا۔ یہ علم اس لذت کے لیے بالکل غیر ضروری ہے جو نو سیکنڈ
کی اس دوڑ سے مسافر کو حاصل ہوئی۔ مسافر نے صرف یہ دیکھا کہ دوڑ اس کے ایک
گوشہ چشم سے شروع ہوئی اور دوسرے گوشہ پر جا کر ختم ہو گئی۔ دیر تک اس نے آنکھ
بھی نہیں جھپکی۔ دمدار ستارے اس کی روشن آنکھوں میں تیرتے رہے۔

دمدار ستاروں کی مانند روشنی کی لکیریں بڑے بڑے حروف بن گئی ہیں
لکھا ہے 'الوداع۔ چار سال کے بعد پھر جمع ہوں گے۔ اس بار ماسکو میں۔

(۶)

یہ ایک خصوصی پرواز ہے۔ امریکی ہوائی جہاز چینی عملہ ایشیائی سوار اور افریقی
منزل مقصود اس سفر کا ایک سہ براعظمی تقریب۔ جہاز اس وقت تاریک براعظم پر پرواز

کر رہا ہے۔ اندر بتیاں جل رہی ہیں اور باہر صبح کاذب کی روشنی ہے۔ افریقہ کی صبح صادق
میں ابھی بہت دیر ہے۔ جہاز آہستہ آہستہ اور نیچا ہوتا جا رہا ہے تھوڑی دیر میں حبشہ کا دارالسلطنت
آنے والا ہے۔ ناشتہ کے برتن سمیٹے جا رہے ہیں۔ چینی لڑکی تام چینی کی کیتلی اٹھائے پھر
رہی ہے۔ یہ برتن بہت دنوں کے بعد نظر آیا ہے۔ مسافر سوچتا ہے یہ دنیا پچھلے سو برس
میں کہاں سے کہاں نکل گئی۔ صدیوں آدمی ایک ڈھرّے پر رہا۔ خاک سے اٹھا تھا سو
اس سے رشتہ استوار رکھا ہوا تھا۔ پکانے کی ہانڈی کھانے کی رکابی پینے کے لئے کوزہ مانگنے
کے لئے کاسہ، یہ سب مٹی کے ہوا کرتے تھے۔ پیدائش کے لئے یہ تشبیہ تھی جیسے چاک سے
گیلا برتن اتار لیں۔ موت کے لئے یہ استعارہ تھا گویا مٹی کا برتن ٹوٹ جائے۔ ہمہ اوست
کے لئے یہ اشارہ تھا کہ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ۔ لیکن اب یہ رشتہ ٹوٹ گیا ہے
وصیت کی تھی کہ ان کی لاش کو جلا دیا جائے
یہاں تک کہ ن۔م۔ راشد آزاد شاعری سے آزاد منشی کے اس درجہ تک پہنچ گئے جہاں
مٹی میں دفن ہونے کے بجائے بھٹی میں بھسم ہونے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ آدمی بھٹک
گیا ہے۔ جب سے مٹی اور روغنی مٹی کے برتن رخصت ہوئے ہیں اس خاکداں میں اسے
راستہ نہیں مل رہا۔ تام چینی اور چینی، تانبہ اور پیتل، جست اور المونیم، بے داغ لوہا اور فولاد،
شیشہ اور پلاسٹک مسالہ اور مرکبات بلکہ کاغذ کے برتن اور کاٹھ کی ہنڈیا، یہ بے یقینی کی
ساری منزلیں وہ پچھلے سو برس میں طے کر چکا ہے اور کسی مقام پر چند برس سے زیادہ
قیام نہیں کیا۔ تام چینی کی کیتلی پچاس ساٹھ برس پہلے ایک مرغوب ایجاد تھی اور اب
محض ایک متروک یادداشت۔ لاہور میں تام چینی کا ایک بورڈ دستبردِ زمانہ سے محفوظ
بہت سالوں تک ایک عجوبہ کے طور پنجاب پبلک لائبریری کی پیشانی پر نصب رہا۔ ایک
روز ایک شخص کا اس سڑک سے گذر ہوا تو اس نے یہ بورڈ اتار کر اُنبار خانہ بھیج دیا اور اس

نئی جگہ میوسکول آف آرٹ کی مدد سے دھات کے تراشے ہوئے الفاظ میخی سہاروں پر آویزاں کر دیئے۔ سڑک پر جو اونچا سا پردہ بنا ہوا تھا اسے بھی گرا دیا۔ کتب خانہ اور عجائب خانہ میں تمیز کرنی آسان ہو گئی اور علم اور انسان کے درمیان کھنچی ہوئی دیوار بھی ڈھے گئی

مسافر نے وہ رسالہ بلا ارادہ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا جو ہوائی جہاز والوں نے وقت گذاری کے لئے فراہم کیا ہے۔ رسالہ میں لکھا ہے' چین نے زر کی بے زری اور بے وقعتی کا عجب عالم دیکھا ہے ۱۹۳۷ء میں سو یوآن میں بیلوں کی جوڑی آتی تھی۔ پانچ برس کے بعد اس رقم سے چاول کی صرف ایک بوری کی خرید ممکن رہ گئی، پانچ برس اور گذرے تو اس زر کثیر سے بجھے ہوئے کوئلہ کا ایک ٹولا آتا تھا یا چڑیا گھر میں شیر دیکھنے کے لئے داخلہ کا ٹکٹ۔ جہاز اب عدیس ابابا کے ہوائی اڈہ پر خصوصی مہمان نوازی کے ہال کے نزدیک کھڑا ہے۔ مسافر کا خیال تھا کہ حبشہ ایک لق و دق صحرا ہے اور عدیس ابابا خیموں اور جھگیوں پر مشتمل ایک قصباتی نخلستان کا نام ہے۔ لیکن یہ کوہستانی خطۂ زمین تو سوئٹزرلینڈ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ ہوائی اڈہ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ چاروں طرف سرسبز اور شاداب پہاڑیاں اور بادلوں سے ڈھکی وادیاں ہیں۔ چند گھنٹہ پہلے جولائی کے گرم مرطوب مہینہ میں کراچی سے چلے تھے تو بش شرٹ بدن کو ناگوار گذر رہی تھی۔ اب صبح دم کی تازہ اور یخ ہوا کا جھونکا ہوائی جہاز کا دروازہ کھلنے پر اندر آیا ہے تو لوگ مفلر اور اوور کوٹ پہن رہے ہیں۔ ایک ساتھی کہتے ہیں کہ جہاز میں جڑ کر بیٹھے رہنے کی وجہ سے سردی کا احساس زیادہ ہو رہا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کر چند قدم چلا جائے۔ خون گردش کرے گا اور جسم گرم ہو جائے گا۔ یہ ساتھی اپنے نسخہ پر عمل کرنے کے لئے دوسروں کا انتظار اور تشریفات کا لحاظ کئے بغیر نیچے اترنے کے لئے لپکے۔ تیزی سے

اکٹھی دو دو سیڑھیاں چھوڑ کر اترنا شروع کیا۔ آخری دو چار سیڑھیاں رہ گئیں تو یکدم پلٹ کر تین تین سیڑھیاں پھلانگ کر واپس اوپر چڑھ رہے ہیں اور ہانپتے کانپتے شور مچا رہے ہیں' شیر آیا شیر آیا۔

جہاز کی سیڑھی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں اسفالت کے فرش پر ایک ببر شیر کھڑا ہے۔ لحیم شحیم' اونچا لمبا' گھنے سیاہی مائل ایال کے بادلوں سے اُبھرتا ہوا بارُعب چاند چہرہ اس پر جڑی ہوئی دو روشن انگارا آنکھیں جو سیڑھی پر کھڑے ہچکچاتے مہمانوں پر جمی ہوئی ہیں۔ یہ شیر خیر مقدمی کے لئے آیا ہے۔ اس سے پرے کوئی دس قدم کے فاصلہ پر استقبالیہ کمیٹی کے باقی ارکین سیدھی قطار بنائے کھڑے ہیں۔ بعض ہار لئے ہوئے اور بعض استقبالی جھنڈے اٹھائے ہوئے ہیں' جن پر لکھا ہے' افریقہ جاگ اٹھا ہے۔ ان سے ہٹ کر ناچنے اور گانے والوں کے طائفہ نے دائرہ بنایا ہوا ہے۔ سیڑھیوں کے پیچھے سے ایک شخص ننگے پاؤں برآمد ہوا اور اپنا پیر شیر کی لمبی دم کے آخری سرے پر رکھ دیا جو خمدار بالوں کا گھنا گچھا ہے شیر اس زور سے دھاڑا کہ ہوائی اڈہ کی کھلی فضا میلوں تک دہل گئی۔ چنگھاڑ دور پہاڑیوں سے جا کر ٹکرائی اور اس کی گونج وادی کے گھنے جنگل میں گم ہو گئی۔ یہ ایک چنگھاڑ اکیس توپوں کی سلامی کے برابر ہے۔ ہر ملک کے وفد کے رئیس کے لئے شیر نے ایک نعرہ لگایا۔ سات آٹھ نعروں کے بعد شیر افگن نے دم کچھ ایسے دبائی کہ شیر سارے ظاہری رعب و داب کے باوجود مسکینی پر اتر آیا۔ وہ فرش پر چاروں پیر پھیلائے زمین پر سر رکھ کر یوں لیٹ گیا جیسے کھال میں بھس بھرا ہو۔ اس کے پاس کھڑا آدمی اب نرا سائیس لگ رہا ہے۔ جب شیر ہی شیر نہ رہے تو شیر افگن بھلا اور کیا لگ سکتا ہے۔

قافلہ مصافحہ اور بغل گیری میں مصروف ہو گیا اور طائفہ سوانگتی ناچ گانے

یں جت گیا۔ اتنی ٹھنڈ کے باوجود طائفہ کے دس مرد اور پندرہ عورتوں نے سفید لٹھے اور
مل کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آبنوسی جسم پر سفید ململ کا جھلکتا کرتا یوں لگتا ہے۔ جیسے
دھوبی نے محنت سے جان چرائی اور نیل زیادہ لگا دیا۔ مردوں نے ململ کی قمیص کھدر
کی واسکٹ تنگ موری والا لٹھے کا پاجامہ اور سینڈل پہنا ہوا ہے۔ شانے اور کمر کے گرد
چادر لپیٹی ہوئی ہے یہ ساری چیزیں سفید رنگ کی ہیں جو بڑا اجلا لگ رہا ہے۔ ننگے پاؤں
ناچنے والی عورتوں کے پاس نہ چادر ہے اور نہ واسکٹ، بس ناف تک آنے والا جمپر ہے اور
گھٹنوں تک رہ جانے والا غرارہ۔ بدنظری کے لئے اس لباس میں بہت سے رستے اور رخنے
بنے ہوئے ہیں۔ سردی ان جھری دار کپڑوں میں آسانی سے گھس سکتی ہے۔ چند زیورات
ننگے پنڈے پر چمک رہے ہیں اور ان سے جتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہے وہ عورت ہونے کی حیثیت
سے انہیں کافی ہے۔ بیشتر آدمی ڈھول پیٹنے پر مامور ہیں۔ دو تین طرح کے تاشے ہیں جنہیں
گلے میں ڈالے جھک کر گھٹنوں کی توس بنائے دھما دھم بجائے جا رہے ہیں۔ کوئی چپٹی
لکڑیوں سے کوئی گولے والی چوب طبل سے اور کوئی محض خالی ہاتھ۔ طبال اپنے کمال پر
خود ہی سر دھن رہے ہیں۔ شاید یوں سر مارے اور جان کھپائے بغیر یہ ساز بجانا ممکن نہ ہو۔
دو تین موسیقاروں کے کلّے اتنے پھولے ہوئے ہیں جیسے ابھی پھٹ جائیں گے مگر ہوا
نے کے ذریعہ ایک سری لے میں باہر نکل رہی ہے۔ ایک شخص ماسنکو بجا رہا ہے جو یہاں
کا اک تارا ہے۔ اس حساب کے بعد جو واحد مرد بچا وہ دھما چوکڑی مچا رہا ہے۔ اس کے
سر پر مصنوعی لمبی لٹیں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ سر کو گھماتے ہوئے ہوا میں چھلانگ لگاتا ہے
اور اس ایک لمحہ کے لئے جب وہ کشش ثقل سے نیچے آتا ہے اس کے سر پہ گز بھر کے بال
سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے وہ چھتری کے بغیر صرف پیراشوٹ کی رسیوں کے سہارے

ہوائی جہاز سے نیچے کود گیا ہو۔ عورتیں گانے اور ناچنے میں مصروف ہیں۔ گانا بہت آسان اور سادہ ہے کیونکہ ہر دو بول کے بعد ٹیپ کا بند آجاتا ہے اور وہ سوائے بے محابا چیخنے چلانے کے اور کچھ بھی نہیں۔ جس کی سسکیاں خوفناک ہوں وہ کنٹرالٹو جس کی چیخیں بلند ہوں وہ سپرانو۔ ناچ کا یہ عالم ہے کہ بدن مسلسل چیخ بنا ہوا ہے۔ عام آدمی کا جسم ہوتا تو جھٹکوں سے اس کے سارے جوڑ علیحدہ ہو کر گر پڑتے۔ ان ناچنے والوں کے جسم میں لوچ اور تندرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جس تندرستی کو ہزار نعمت کہا جاتا ہے وہ افریقیوں کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوئی۔ جب نئی دنیا کو غلاموں کی ضرورت پیش آئی تو مریض اور مریل تو بچ گئیں اور یہ صحت مند لوگ پھنس گئے۔

سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں افریقہ کے شمال مغربی ساحل سے دس ملین افراد جانوروں کی طرح گھیر کر پکڑے، بیچے اور برآمد کئے گئے۔ اس ساحل کا نام ساحل غلاماں پڑ گیا۔ مسافر ساحلِ غلاماں پر کھڑا بحراوقیانوس کی موجوں کو دیکھ رہا ہے یہ اسی طرح بے قرار ہیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔ انہیں اس نعرے اور گانے کا کوئی پاس نہیں کہ افریقہ جاگ اٹھا ہے۔ انہیں اس خبر پر فی الحال اعتبار نہیں آیا کہ غلاموں کی تجارت بند ہو چکی ہے۔ اور اس ساحل پر سارے چھوٹے بڑے ملک سیرالیون سے نائیجیریا تک آزاد ہو چکے ہیں۔ مسافر کے دیکھتے دیکھتے سفید ڈھیلے ڈھالے چوغوں میں ملبوس پچاس ساٹھ آدمی وہاں آگئے اور صفیں بنا کر سمندر کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ سمندر کی موجیں اور بپھر گئیں۔ وہ شرک میں شریک نہیں۔ غلامی کی بہت سی قسمیں اور طرح طرح کی شکلیں ہوا کرتی ہیں۔ گمراہی غلامی کی بدترین صورت ہے۔ اگر آزاد ہونے کے بعد بھی صحیح راستہ کا پتہ نہ چلے اور اگر چلے لیکن اس پر چلنے کی ہمت نہ ہو تو یہ صورت غلامی سے بدرجہا بدتر ہوتی

مسافر لاگوس کے ہوٹل کی دوسری منزل کے برآمدہ ریستوران میں فارغ بیٹھا ہے۔ پہلے ایک ٹانگ دوسری پر دھری تھی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں باہم جوڑ کر گھٹنے کو ٹیک دے رکھی تھی۔ اب ٹانگیں خوش رنگ جنگلے پر رکھی ہوئی ہیں اور ہاتھ گود میں ہیں۔ جہاں تک برآمدہ کا جنگلا نظر آتا ہے وہاں تک چوڑے پتوں کی گھنی بیل چلی جاتی ہے بلکہ راستہ میں جہاں کہیں ستون آتا ہے وہ اس کے سہارے تیسری منزل پر چڑھ جاتی ہے۔ یہ سرسبز بیل سرکشی اور افزائش میں نسل انسانی کی طرح ڈھیٹ معلوم ہوتی ہے۔ جہاں سے کاٹ دیں وہاں سے نئی بیل نکل آتی ہے، جو ٹکڑا زمین پر پھینکیں وہ جڑ پکڑ لیتا ہے، جیسے دیوار کا سہارا ملے وہ ساری عمارت ڈھانپ لیتا ہے۔ نظریں اس بیل سے آگے بڑھتی ہیں تو وہاں گھنی اور گنجان گھاس اگی ہے۔ تیسرے دن گھاس نہ کاٹیں تو چاول کا کھیت بن جاتا ہے۔ اس قطعہ کے بعد کھاڑی ہے اور اس کے دوسری طرف دور پس منظر میں ایک گھنے جنگل کا سیاہ نیم رُخ خاکہ۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے اور بارش کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب شروع ہوئی اور کب تھم گئی۔ چار پانچ ماہ تک پانی اور سبزہ کی یہی کیفیت رہے گی۔ یہ افریقی شہر منطقہ حارہ میں واقع ہے اور آج کل برسات کا موسم ہے۔ ہر طرف ہریالی اور سیلن ہے۔ سرکش بیلیں، خود رو گھاس، چوڑے پتے، گھنیرے درخت اور گھن گھور گھٹا۔ پانی جہاں رکا ہوا ہے وہاں کائی جمی ہے اور جہاں رواں ہے وہاں اس کا رنگ کاہی ہے۔ کھاڑی کا پانی بھی نیلا نہیں زنگاری ہے اور اس کی اتھلی تہ میں زیر آب ایک مرغزار لہلہا رہا ہے۔ ہوٹل کے صدر دروازہ کی سیڑھیوں میں جہاں سنگ مرمر کی سلوں کے جوڑ ہیں ان درزوں میں سبزہ اگ رہا ہے۔

عمارت کی چھت پر جہاں سے شیر دہاں پرنالہ نیچے گرتا ہے وہاں ایک پودا نصب ہے۔ برآمدہ ریستوران کی چوبی میز کی سطح پر ہلکی سی تری آگئی ہے۔ مسافر کو خدشہ ہے کہ ناشتہ اور ناہار کے درمیانی وقفہ میں اس پر ہری ہری دوب نکل آئے گی۔

مسافر میز سے اٹھا اور کھاڑی کی طرف سیر کے لئے نکل گیا۔ کٹے پھٹے ساحل پر ایک جگہ تھوڑا سا پانی اندر کی طرف آکر ٹھہر گیا ہے۔ وہاں ایک بوڑھا مچھیرا پانی میں کھڑا مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ میلی اور گیلی لنگی پر گول گلے کی پرانی بنیان پہنی ہوئی ہے جو سمندر پار سے درآمد ہونے والے پرانے کپڑوں میں کسی ایسے ملک سے آئی ہے جہاں بات زبان سے کہنے کے علاوہ دعوت نامہ لکھ کر سینہ یا پشت پر چسپاں کر لیتے ہیں۔ اس بنیان پر انگریزی میں لکھا ہے، تم جس کی تلاش میں سرگرداں ہو وہ میں ہوں۔ جب یہ بنیان نیا تھا اور فروخت ہونے والے ملک میں کسی نوجوان نے زیب تن کیا تھا تو اس وقت اس کا مخاطب کوئی اور ہو گا۔ لیکن اب اس جملہ کا مخاطب ملک الموت ہے جس کی رہنمائی کے لیے بوڑھے مچھیرے نے یہ بنیان پہنی ہوئی ہے۔ مچھیرے کی آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ جیسے ڈھیلے حلقوں سے باہر نکل کر پانی میں گرنے والے ہوں۔ اور یہ تھکی تھکی ہیں جیسے ابھی خود بخود بند ہو جائیں گی۔ وہ اپنا چھوٹا سا جال پانی میں پھینکتا اور تھوڑی دیر بعد کھینچ لیتا ہے۔ اس نے ساری عمر اسی ایک عمل کی تکرار میں گنوا دی اور وقت اس کے ہاتھوں سے یوں نکل گیا ہے جیسے جال کھینچنے پر پانی اس کے حلقوں سے نکل جاتا ہے۔ اس کے تجربہ کا حاصل وہ دو چار چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہیں جو کنارے پر رکھے ہوئے ٹین کے ڈبہ میں تیر رہی ہیں۔ مسافر اس ڈبہ کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کل اس نے ایک اسی طرح کا ڈبہ پاکستانی سفارت خانہ میں دیکھا تھا۔

مسافر سفارت خانہ میں معتمد درجہ سوم کے کمرہ میں پہنچا اور اپنا تعارف کرایا

کرسی اور چائے کی پیشکش قبول کرنے کے بعد رسمی اور تعارفی گفتگو کو آگے بڑھایا۔ لاگوس پسند آیا؟ جی ہاں، اچھی جگہ ہے بس ذرا دور ہے۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟ کم و بیش چھ ماہ۔ آپ کے پیشرو کہاں گئے؟ جواب ملا جائیں کہاں، اجازت ہی نہیں ملتی اور وہ چھ ماہ سے اس الماری میں پڑے ہیں۔ مسافر نے حیرت کا اظہار کیا تو وہ اٹھے اور الماری کا تالا کھولا۔ اس میں دفتری کاٹھ کباڑ اور سٹیشنری کے ساتھ ایک ٹین کا ڈبہ بھی رکھا ہوا ہے۔ کہنے لگے، میرے پیشرو اس ڈبہ میں بند ہیں۔ ملازمت لاگوس سے آئی اور موت دوسرے جہان لے گئی۔ موصوف کا تعلق ہندومت سے تھا۔ سورگباشی کی راکھ اس ڈبہ میں بند ہے جسے گنگا میں بہانے کے لئے تین ملکوں کے درمیان طویل خط و کتابت ہو رہی ہے۔ فیصلہ ہونے میں نہیں آتا لہذا یہ پھول اس الماری میں بند پڑے ہیں۔ پہلے چند دن اس خیال سے وحشت ہوتی تھی مگر اب عادت ہو گئی ہے۔ اکثر یاد تک نہیں رہتا کہ ایک سوختہ جاں بھی میرے ساتھ اس کمرہ میں موجود ہے۔ البتہ ایک بار آنجہانی پر بہت رحم آیا اور جی چاہا کہ ڈھکنا کھول کر ہوا میں رکھ دوں۔ خاک ہے جو ان کو خبر ہونے تک ہوا اڑا کرلے جائے گی۔ یوں بھی اپنے پیشرو کی خاک اڑانا کوئی نئی بات نہیں ہے پھر بولے دیکھتے میں نے وہ مقولہ غلط ثابت کر دکھایا جس کی رو سے دو بادشاہ ایک اقلیم میں اور دو تلواریں ایک نیام میں نہیں رہ سکتیں۔ میں اور میرا پیشرو ہم دونوں ایک دفتر اور ایک کمرہ میں بآسانی سما گئے ہیں۔ یہ وضاحت انہوں نے ضروری نہیں سمجھی کہ ایک کرسی پر ہے اور دوسرا الماری میں۔

مونگ پھلی کے تیل کی خاطر انگریز نے نائجیریا کو غلام بنایا۔ مدتوں خوردنی تیل اور غلاموں کی تجارت ہوتی رہی یہاں تک کہ عظیم برطانیہ دوسری جنگ عظیم کے کولہو

میں پس گیا۔ چار و نا چار اس نو آبادی کو بھی آزادی نصیب ہوئی۔ نصیب اچھے نہ تھے اس لئے بے وقت معدنی تیل دریافت ہو گیا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ چاروں طرف سے یلغار ہو گئی اور ملک دو نیم ہو گیا' پیا فزا اور باقیماندہ۔ تین سال تک ملک کو توڑنے کے لئے مداخلت خارجی اور جوڑنے کے لئے جنگ داخلی جاری رہی۔ بارے پورا ملک پھر نقشہ پر ابھرا اور اس کے ساتھ افراتفری نے نیا رنگ جمایا۔ مسافر یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر حیران ہو رہا ہے۔

بندرگاہ پر مال لدے ہوئے جہازوں کا ہجوم ہے۔ سمندر میں دور تک جہاز لنگر انداز ہیں اور مہینوں سے کھڑے ہیں۔ ہمسایہ ملک کی بندرگاہ استعمال ہو رہی ہے پہلی کا پٹر سے سامان اتارا جا رہا ہے' ہر جانہ بھرا جا رہا ہے مگر جہازوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ آج انتظار کرنے والے جہازوں کی تعداد دو سو تیس ہے۔ اس دو سو تیسویں جہاز سے سامان اتارنے کی باری شاید اگلے سال آئے گی۔ ایک جہاز ایک ملین ڈالر کا سیمنٹ لے کر آیا۔ چھ ماہ بیکار کھڑے رہنے کا ہر جانہ ایک ملین ڈالر وصول کیا۔ برسات کے گھمس کی وجہ سے سیمنٹ ناکارہ ہو گیا۔ لہذا سو ہزار ڈالر اس خراب سیمنٹ کو سمندر میں پھینکنے کی اجرت وصول کی اور رخصت ہو گیا۔ آج کے انگریزی اخبار کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں ایک بڑا سا اشتہار چھپا ہے۔ لکھا ہے' مہربان قدردان۔ جان من و جان شما۔ ہم آپ سے شرمندہ ہیں۔ ہم نے آپ کی خدمت اور خاطرداری کے لئے آپ کی پسندیدہ شراب سے لدے ہوئے جو پانچ جہاز منگائے تھے وہ مہینوں سے باہر گہرے پانیوں میں کھڑے ہیں۔ براہ کرم آپ حکومت پر زور ڈالیں کہ وہ اس مال کی اہمیت کی تصدیق کرے اور ان جہازوں کا حق ترجیح تسلیم کرتے ہوئے فوراً گودیاں مہیا کرے۔

سڑکوں کا حال بندرگاہ سے بھی گیا گذرا ہے۔ ان سڑکوں پر سالہا گھوڑا گاڑی

چلتی رہی یا لوگ پیدل چلتے رہے۔ اب یہ عالم ہے کہ جتنا وقت لندن سے لاگوس آنے میں لگتا ہے اتنا وقت ہوٹل سے ہوائی اڈہ تک جانے میں صرف ہوتا ہے۔ مسافر کو ایک واقف حال نے مشورہ دیا کہ رخصت سے ایک دن قبل ہوائی اڈہ کے باہر جو ہوٹل ہے وہاں منتقل ہو جانا یا رات کے تین بجے شہر سے اڈہ چلے جانا۔ بات دل لگتی ہے کیونکہ اس وقت مسافر کو موٹر میں بیٹھے ہوئے سات گھنٹہ ہو چکے ہیں اور ابھی اس کے صبر کا امتحان جاری ہے۔ وہ پانچ میل کے فاصلہ پر ایک تقریب میں شرکت کے لئے گیا اور ابھی تک اس کی منزل اجگت رہا ہے۔ غالباً آدھ گھنٹہ اور لگے گا۔ وقت گذاری کے لئے وہ اپنے کاغذات میں سے اودوجی رپورٹ نکال لیتا ہے۔ اودوجی یہاں کی کابینہ کے سیکرٹری ہیں اور چند سال ہوئے مسافر کے ہمراہ یو۔ این کے ایک سیمینار میں شریک تھے۔ ان دنوں تیل کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے وہ ایک میانہ رو آدمی لگے۔ ایسا لگتا ہے کہ تیل آیا اور معقولیت رخصت ہو گئی۔ کیونکہ رپورٹ میں لکھا ہے، تیل نکل آیا ہے اس کی پیداوار بڑھ رہی ہے آمدنی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے اور ہو گا لہذا ہر شخص کی تنخواہ بہ یک قلم دگنی کر دی جائے۔ اضافہ پچھلے سے پچھلے سال سے نافذ العمل ہونا چاہیئے۔ نئی شرح سے بقایا جات یک مشت ملنے چاہیئں افسروں کو بڑے فشار کے تحت کام کرنا پڑتا ہے لہذا ہر اٹھارہ ماہ کے بعد چھ ماہ کی رخصت سرکاری خرچ پر یورپ میں گذارنی چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور وغیرہ کے تحت جو سفارشات درج ہیں وہ ان لوگوں کی سمجھ سے بالاتر ہیں جن کے ملک میں تیل پیدا نہیں ہوتا۔ مسافر رپورٹ بند کر دیتا ہے۔ آگے پڑھنے کی تاب نہیں۔ یہ بات البتہ اس کے علم میں ہے کہ یہ ساری سفارشات منظور ہو چکی ہیں۔ دولت کی ریل پیل سڑکوں پر موٹروں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ سڑک اب سفر کے کام نہیں آتی بلکہ اس سے کار پارک کا کام لیتے ہیں۔

سفر کے لئے صرف فٹ پاتھ رہ گئے ہیں۔

ڈرائیور بھیڑ سے بچنے کے لئے سڑک چھوڑ کر گلیوں میں گھس گیا ہے یہاں اس کے ہم خیال ڈرائیور پہلے سے موجود ہیں لہذا موٹر کی رفتار میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ جو حال سڑکوں کا ہے وہی گلیوں کا ہے۔ ظاہر و باطن بالکل ایک جیسے ہیں۔ مسافر کی نظر ایک کھوکھے پر پڑی۔ اس کی چھت اتنی نیچی ہے کہ رکوع و سجود کے بغیر اندر داخل ہونا ممکن نہیں۔ بدرو کی بدبو نے اس کھوکھے سے اٹھنے والی بو کے ساتھ مل کر شیشہ بند ہونے کے باوجود موٹر میں بیٹھنا مشکل کر دیا ہے۔ کھوکھے میں ہر طرف بوتلوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور ان ادھوں اور پووں کے بیچ ایک بھاری بھرکم جبشن بیٹھی ہوئی ہے۔ کھوکھے کے باہر ایک بورڈ پہ لکھا ہے' الحاجیہ ایس۔ اے بلوگن وائن اینڈ بیئر فروش' نمبر ۲ مارش سٹریٹ لاگوس۔

فیڈرل پیلیس ہوٹل سے پرے سمندر کے کنارے ایک دس منزلہ رہائشی عمارت کوئی دو سال پہلے مکمل ہوئی ہے۔ کرائے آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں مگر اس عمارت میں رہائش کے لئے کوئی جگہ خالی نہیں۔ اگر کبھی ایک فلیٹ خالی ہوا تو سو امیدوار پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ عمارت ساحل کے بہترین حصہ پر تنہا قابض ہے۔ سنا ہے اس کا مالک فوج میں کپتان تھا۔ اس نے بیافرا کی جنگ میں بڑی دلیری دکھائی۔ لڑنے میں نہیں بلکہ لوٹنے میں۔ یہ عمارت مال غنیمت سے تعمیر ہوئی ہے۔

زمین کی سلیٹ پر کسی بچہ نے چاک سے لکیریں کھینچ دی ہیں جنہیں ریل گاڑی پٹڑیوں کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ ان پٹڑیوں کے اوپر بنا ہوا پل ایک کوہان کی مانند نظر آتا ہے سڑک اس کوہان پر پالان کی طرح پڑی ہے۔ موٹر اس وقت پل کے سب سے اونچے حصہ پر ہے جہاں سے بائیں ہاتھ ایک رہائشی بستی نظر آ رہی ہے۔ یہ تھیٹر ساٹھ ملین ڈالر کی

لاگت اور مشرقی یورپ کے ایک ملک کی فنی امداد سے تیار ہوا ہے۔ عمارت مکمل ہو گئی ہے، کرسیاں نصب ہو چکی ہیں، روشنیاں اور مشینیں آزمائشی طور پر کام کر رہی ہیں۔ باقاعدہ افتتاح کا انتظار ہو رہا ہے۔ عمارت گول ہے اور چھت لہریا۔ دور سے دیکھیں تو عمارت ایک بلبلہ لگتی ہے اور چھت جیسے سمندر کی سطح پر سیمنٹ کی لہریں۔ مسافر پچھلے ہفتہ اجازت نامہ لے کر یہ عمارت دیکھنے گیا اور نشستوں کی ترتیب دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بٹن دبانے کی دیر ہے کہ ان کی ترتیب دائرے یا مربع یا قطار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ گائیڈ نے بٹن دبایا۔ ایک جانب سے لکڑی کا فرش جس پر پانچ ہزار نشستیں نصب ہیں آگے بڑھنے لگا۔ بندوبست کی صورت یہ ہے کہ تماشائی اپنی جگہ بیٹھے رہیں اور زمین ان کے نیچے سے کھسک جاتے۔ ایک اور بٹن دبایا گیا تو ایک حصہ کی پانچ سو سیٹیں خود بخود تہ ہو کر کہیں گم ہو گئیں اور اس جگہ ایک وسیع اسٹیج نمودار ہو گیا۔ گائیڈ نے پوچھا آپ کو تھیٹر کیسا لگا۔ جواب ملا تیل کی دولت سے خریدا ہوا کھلونا جو پل کی دوسری جانب واقع بستی کے لوگوں کو بہلانے کا کام نہ دے سکے گا۔ پل کی بلندی سے یہ بستی پھیلے ہوئے نقشہ کی طرح نظر آ رہی ہے۔ دلدلی علاقہ اور ٹین کی جھگیاں سارے گھروں کے ستر کھلے ہوئے ہیں۔ دروازہ کسی کسی گھر کو نصیب ہے۔ کوئی کوئی چھت ایسی ہے جو برسات کو اندر آنے سے روک سکے۔ گلیاں چھ مہینہ نہروں کا کام بھی دیتی ہیں۔ اس بستی کا کوڑا اٹھا کر باہر لے جانے کا رواج نہیں۔ جونہی ایک گھر والے کوڑا دروازے کے باہر ڈھیر کرتے ہیں دوسرے گھروں سے عورتیں بچے اور کتے آ کر اس کے گرد ہو جاتے ہیں اور اپنے اپنے کام کی چیزیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ کوڑا دراصل اشیا کے آزادانہ اور بلامعاوضہ تبادلہ کا طریقہ اور دولت کو گردش میں رکھنے کا وسیلہ ہے۔

مسافر نائیجیریا کی پارلیمنٹ میں داخل ہوا۔ گیلری کے اندر اور ہال کے باہر

ایک پتھر بے جوڑ لگ رہا ہے۔ نزدیک جا کر اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھی تو معلوم ہوا کہ یہ پتھر برطانوی پارلیمنٹ کی عمارت سے ہدیہ اور شگون کے طور پر لا کر یہاں نصب کیا ہے۔ پتھر نصب کرنے سے نسب اور نصیب نہیں بدلا کرتے۔ پچھلے دس برس سے عمارت ہے مگر پارلیمنٹ نہیں ہے۔ اس عمارت کی گیلری میں گھڑی دیکھتے ہوئے مسافر نے کہا مقررہ وقت بہت آگے نکل گیا ہے لیکن تقریب شروع ہونے میں نہیں آتی۔ کسی نے کان میں بتایا کہ منتظمین میں جھگڑا ہو رہا ہے کہ صدارت کون کرے۔ مسافر ایک اور تقریب میں شرکت کے لئے چھپتے ہوئے سٹیڈیم میں داخل ہوا۔ دعوت نامہ میں ایک وزیر کا نام درج ہے جو انعامات تقسیم کریں گے۔ اس سے پہلے کہ منتظمین تقریب کے آغاز کا اعلان کریں اور مہمانِ خصوصی کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیں ایک اور وزیر اسٹیج پر چڑھ گئے اور ان کے حواریوں نے بلند گو پر قبضہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ انعامات تقسیم فرمائیں گے۔ مسافر ایک وفد کے ہمراہ صدر ریعقوبو گوون سے ملنے جاتا ہے۔ ان کی عمر اور باتوں سے یوں لگا جیسے انہیں کسی کالج میں داخلہ لینے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

الوداعی تقریب ہو رہی ہے۔ مہمانوں سے زیادہ بن بلائے مہمان موجود ہیں۔ صبح تک جاری رہنے والی اس تقریب کو شروع ہوئے ایک گھنٹہ گذرا ہے مگر خالی بوتلیں ڈبے اور گلاس ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں، میزوں اور کرسیوں کے نیچے سیڑھیوں اور ستونوں کے ساتھ باڑ اور کیاریوں کے اندر۔ قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ مہمانوں کی دلچسپی کے لئے بہت سے طائفے بلائے گئے ہیں۔ رنگ ملے مالائیں پہنے خوشنما پرندوں کے پر سجائے خوفناک درندوں کی کھالیں باندھے بلم تھامے کودتے پھاندتے چیختے چلاتے ڈھول بجاتے یہ طائفے اپنا اپنا کمال دکھا رہے ہیں۔ ایک طائفہ کا

تعارف ہوتا ہے کہ اس نے اقوام سیاہ پوست کے کل افریقہ جشن فرہنگ میں بڑی داد حاصل کی تھی۔ آٹھ دس فربہ عورتیں چوپاؤں کی طرح فرش پر ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل ایک قطار بنا کر رینگنے اور مدھم سروں میں گانے لگیں۔ ریں ریں۔ سارے ساز اس ریں ریں میں ان کے ہم آواز ہو گئے۔ گانے اور ناچنے والی عورتوں نے اب ایک دائرہ بنا لیا ہے۔ جیسے چوپائے سر جوڑ کر باہم مشورہ کرنے لگیں۔ گانا بند ہو گیا ہے۔ اور ساز بھی ایک ایک کر کے خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔ آخر میں بس ایک ڈھول بجتا ہے جسے یکایک بڑے زور سے پیٹنے لگے ہیں۔ ڈھول کا ساتھ دیتے ہوئے رقاصاؤں نے کولہے گھمانے شروع کئے۔ باقی جسم ساکت ہے اور بھاری بھرکم دو نیم دائرے ایک دائرہ کی شکل میں انتہائی تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ کبھی گھڑی کے رخ کبھی اس کے مخالف۔ دیکھنے والے اس لئے تالیاں بجا رہے ہیں کہ جسم کے وہ حصے جو ان کا کہا نہیں مانتے ان پر دوسروں کو اتنا اختیار ہے کہ انہیں تڑپنے پھڑکنے کے لئے حکم اور سمت دے سکتے ہیں۔ ڈھول اونچا ہوتا چلا گیا۔ ہلچل تیز ہوتی چلی گئی، طوفان آ گیا۔ ڈھول پر آخری تھاپ پڑی بھنور کو قرار آ گیا رقص کا یہ ٹکڑا ختم ہو گیا۔ دائرہ ٹوٹ کر پھر ایک قطار بن گیا۔ وہی ریں ریں گانا اور رینگ رینگ ناچنا۔

کلچرل شو کے بعد صلاء عام کا اعلان ہوا اور کلب کا وسطی پختہ فرش جس پر دن میں ٹینس کھیلتے ہیں مہمانوں کے لئے ناچ کا آنگن بن گیا۔ ناچ کی دھن تیز ہے مگر قواعد بڑے نرم ہیں۔ جسم کو جس طرح چاہیں حرکت دیں وہ ناچ تصور ہوگا۔ شاید آنگن ٹیڑھا ہے۔ کچھ تنہا ناچ رہے ہیں۔ کچھ جوڑوں کے درد میں مبتلا ہیں اس لئے ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہیں بیشتر باجماعت ناچ رہے ہیں۔ آدھی رات گذر گئی ہے۔ اب

رات کے دو بجے ہیں۔ اب گھڑیال تین بجا رہا ہے۔ کوئی گھڑی دیکھتا نہیں اور گھڑیال کی سنتا نہیں۔ پہلی بار ناچ ختم کرنے کے اعلان پر بلوہ ہو گیا تھا۔ گھنٹہ بھر بعد دوسری بار اعلان ہوا۔ تو ہجوم نے مل کر گلا پھاڑا، ہرگز نہیں۔ گھنٹہ بھر بعد پھر اعلان ہوا۔ عوام نے جواب دیا، ایک اور ایک اور۔ بالآخر اب بینڈ والوں نے خود ہی آخری دھن شروع کر دی ہے رات بھر اطالوی ہسپانوی اور فرانسیسی گانے ہوتے رہے۔ یہ انگریزی گانا ہے۔ جونہی دھن بجی اور ٹیپ کا مصرع بادِ صبا اے کر چلی سارے مدہوش بے ہوش اور سوتے جاگتے جسموں میں بجلی کا کوندا لپک گیا۔ زور زور سے سر اور پاؤں پٹکے جا رہے ہیں۔ تنہا ناچنے والے دوسروں سے آ کر مل گئے ہیں باہم ناچنے والے نزدیک تر ہو گئے ہیں۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ وہ جو ناچ میں شامل نہ تھے اور صوفوں پر بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے وہ بھی فرش پر آ گئے ہیں اور تال دے رہے ہیں۔ ٹیپ کا مصرع ہے' افریقہ جاگ اٹھا ہے جاگ اٹھا ہے۔ یہ دعوے اس حد تک بالکل درست ہے کہ جولائی کی اس رات افریقہ شب بھر جاگتا رہا گاتا رہا پیتا رہا اور ناچتا رہا۔

الوداعی تقریب ختم ہوئی۔ موٹر میں مسافر کے ساتھ عالمی بنک برائے ترقی کا ایک نمائندہ موجود ہے۔ پوچھتا ہے آپ کو یہ ملک کیسا لگا۔ مسافر نے کہا آپ دولت اقوام کا شمار کرتے ہیں حالانکہ لوگ ہی سب سے بڑی دولت ہیں۔ آپ افراطِ زر کو عیب سمجھتے ہیں مگر افراطِ جہل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ معیارِ زندگی سے اعلےٰ ایک پیمانہ معیار زندگی کا ہے جسے آپ خاطر میں نہیں لاتے۔ آپ چند لوگوں کے عیش کی اوسط نکال کر ساری آبادی، پر پھیلا دیتے ہیں۔ آپ میری رائے سے اتفاق نہیں کریں گے۔ میری نظر

میں یہ ابھی تک تاریک براعظم ہے۔ اس کی صبح ایک صدی کے بعد ہوگی۔ فی الحال جنگی ترانے ناچنے کے کام آئیں گے اور انقلاب کے نام پر یکے بعد دیگرے انقلاب آتے رہیں گے آپ دیکھتے نہیں لاگوس کی فضا کتنی بوجھل ہے جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔ عالمی بنک کا نمائندہ طنزاً مسکراتے ہوئے بولا' آپ کے حساب سے تو کل صبح' میرا مطلب ہے یہ صبح جو اس وقت چڑھ رہی ہے' انقلاب کی صبح ہوگی۔ تھوڑی دیر کے بعد صبح ہوگئی۔ یہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۵ء کی صبح ہے۔ رت جگا منانے والے بے سُدھ اور اوندھے پڑے ہیں۔ ان میں نائیجیریا کی حکومت بھی شامل ہے۔ جنرل یعقوبو گووون جو کمپالا میں افریقی سربراہوں کے اجلاس میں شریک ہیں وہاں سے ویلز یونیورسٹی میں داخلہ کیلئے جانے والے ہیں۔

مسافر ایک یونیورسٹی دیکھنے کے لئے ایفے جا رہا ہے۔ راستہ میں عبادان آتا ہے جو دنیا بھر میں سیاہ فام باشندوں کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جتنے سیاہ فام اس بستی میں رہتے ہیں اتنے کسی اور آبادی میں نہیں ملتے۔ اس رنگت کی کثرت نہ جانے دیکھنے میں کیسی لگے۔ مسافر کے دل میں وسوسے تشبیہیں بن بن کر اٹھنے لگے۔ سارا شہر سیاہ پوش ہوگا اور بستی کے بحرِ اسود میں غرق ہو جانے پر ماتم کناں ہوگا۔ عبادان تو شاید کوئلہ کی کان ہے جہاں رہتے رہتے آدمی بھی کوئلہ بن گئے ہونگے۔ اس شہر میں ہمیشہ رات کا سماں ہوگا۔ دن کے وقت لوگوں پر ان کے سائے کا گمان گذرے گا۔ چہل پہل کا منظر ایسا ہوگا جیسے کوئی دوات انڈیل دے اور سیاہی گلی کوچوں میں بہہ نکلے۔ وہاں خوبصورت لوگوں کی صورت کیسی ہوگی۔ محبوب کا جل کیسے لگاتا ہوگا۔ چندے آفتاب اور چندے ماہتاب کی جگہ مقامی محاورہ کیا ہوگا۔ دراصل مسافر کے ذہن میں ابھی تک وہ نقش تازہ ہے جو نوجوانی میں پہلی بار اچانک سفید فام باشندوں کا ہجوم دیکھ کر قائم ہوا تھا۔ وہ فطری طور پر اس کے

برعکس منظر سے اسی شدت کے ساتھ متاثر ہونے کا متوقع ہے۔

مسافر کا بچپن ایک لحاظ سے یکرنگی تھا۔ آنکھیں صرف برعظیم کی ملی جلی رنگت کے ملغوبہ سے مانوس تھیں۔ کشمیری سیب سے لے کر دراوڑی آبنوس تک رنگوں کی اوسط ایک سانولا رنگ ہے اور وہی ساری دنیا کا رنگ لگتا تھا۔ یہ خیال بھی نہ گذرا تھا کہ مینڈک کنوئیں سے باہر نکلا تو اسے اپنا رنگ سب سے الگ اور انوکھا لگے گا۔ نوجوانی اور نادانی کے دنوں کی بات ہے کہ مسافر کا پانچ ہزار ٹن وزنی سیاہ رنگ کا مال اور مسافر بردار بحری جہاز چاٹگام کی دریائی بندرگاہ سے چلا اور تیسری صبح کولمبو کی سمندری بندرگاہ میں داخل ہوا۔ جہاز اپنے مقررہ مقام پر لنگر انداز ہوا تو مسافر آنکھیں ملتا عرشہ پر پہنچا تاکہ بہتر گھنٹے کے بعد نظر آنے والی زمین کی جھلک دیکھ سکے۔ زمین تو بہت دور تھی اور صرف ایک لکیر کی طرح اُفق کے پاس نظر آتی تھی مگر آسمان بہت قریب تھا اور چاند ستارے پڑوس میں اترے ہوئے تھے۔ مسافر کے جہاز کے ساتھ ایک اور جہاز لنگر انداز تھا۔ پانچ گنا بڑا اور سفید چمکتا روغن۔ پی اینڈ او کمپنی کا سمندری عشرت کدہ۔ نام ستھر تیھڈ نیور اور وزن بائیس ہزار ٹن۔ اس کے مختلف طبقوں کے عرشوں پر مردوں عورتوں اور بچوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ سارے کے سارے سفید فام بلکہ گُل فام۔ جس نے کبھی دو چار سے زیادہ گورے اکٹھے نہ دیکھے ہوں اور رنگ کی یکسانیت کی وجہ سے ان کی صورتوں کا فرق اسے نظر نہ آتا ہو اس کے لئے تڑکے کی اونگھ میں اوسان کھوئے یکدم دو ہزار گورے چہروں سے روبرو ہونے کا تجربہ بڑا دہشت انگیز تھا۔ رنگ روپ کا چمکارا دیکھ کر دل میں ہول بیٹھ گیا۔ سفید فاموں کی برتری کا دعوےٰ خیرگی کے لمحہ بھر کے لئے نادرست نہ لگا۔ پھر دوسرا لمحہ آیا اور دیکھنے والا منظر کشی میں مصروف ہو گیا۔ یہ دنیا ایک عجائب گھر ہے۔ اس وقت

روم و یونان کے عجائب خانوں میں رکھے ہوئے سنگ مرمر کے سارے مجسموں میں جان پڑ گئی ہے۔ یہ پہاڑ جیسا بحری جہاز کوہ قاف کا ٹکڑا لگتا ہے۔ شاید یہ بدصورتی کے بڑھتے ہوئے طوفان میں حسن کی کشتی نوح ہے۔ مینڈک کا کنواں کتنا تاریک اور چھوٹا ہے۔ دنیا کتنی روشن اور وسیع ہے۔ مسافر نے اس پہلی نظر کی چکا چوند اور دوسرے لمحہ کی شدت کو ہمیشہ یاد رکھا حالانکہ اب اس تاثر پر ہنسی آتی ہے۔ وہ تاثر ستر پتھر نیوز پر کو لمبو سے سڈنی تک سفر کے دوران زائل ہو گیا مگر اس کا داغ ابھی تک تازہ ہے۔

مسافر نی فے جا رہا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر ہزاروں گورے دیکھ کر یہ حال ہوا تھا تو آج عبادان میں لاکھوں کالے دیکھ کر دل پر کیا گذرے گی۔ اسے یقین ہے کہ شدت احساس کا ایک اور نیا تجربہ ہونے والا ہے جسے وہ بھلائے نہ بھول سکے گا۔ اسے ڈر ہے کہ دل کو لاکھ پرچانے کے باوجود یہ پہلے تجربے کے برعکس ہوگا۔ زشت اور مایوس کن، ناگوار اور رنج دہ۔ دل میں ایک اور داغ کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس نے ہمراہی سے جو موٹر چلا رہے ہیں کہا عبادان آئے تو بتا دینا۔ جواب ملا وہ تو گذر گیا۔ جس شہر سے رک کر پٹرول لیا تھا وہی عبادان تھا۔ خدشات کا ریت محل یہ سن کر ڈھے گیا۔ واپس آتے ہوتے اس شہر کی خوب سیر کی، چائے پی خریداری کی اور ایک پاکستانی کا گھر تلاش کیا۔ نہ شہر میں کوئی خاص بات نظر آئی نہ شہریوں میں۔ شہر ویسا ہی تھا جیسے دوسرے بڑے شہر ہوتے ہیں بس ہریالی زیادہ تھی اس لئے اچھا لگا۔ آدمی ویسے ہی جیسے دوسرے آدمی ہوتے ہیں بس صحت اور خوشی سے چہرے ہرے ہو گئے تھے اس لئے اچھے لگے۔ کوئی بات ان میں دوسرے آدمیوں سے کم یا زیادہ نظر نہ آئی۔ عام آدمی اسی طرح حاجات میں جکڑا ہوا۔ خاص آدمی اسی طرح خواہشات کے نیچے دبا

ہوا۔ خاص الخاص لوگ اتنے ہی خوبصورت جتنے دنیا کے کسی اور حصہ میں ہوتے ہیں کاجل ان کو بھی اچھا لگتا ہے اور ان کا مقامی محاورہ بھی چندے آفتاب اور چندے مہتاب ہے۔ یہ لوگ بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔ ایک عضو دھڑکتا ہے اور دوسرا سوچتا ہے۔ روح کالے جسم میں بھی ہوتی ہے۔ خدا آبنوسی تن بدن میں بھی شہ رگ سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ پوست کا رنگ بالکل بے معنی ہے۔ دوسری نسلوں اور رنگتوں کی طرح یہ لوگ بھی اشرف المخلوقات ہیں۔ نہ یک کلمہ زیاد نہ یک کلمہ کم۔

عباد ان پیچھے رہ گیا اور سوچ آگے نکل گئی۔ رنگ کوئی سنگ میل نہیں کہ وہ شمار کرے نسل کوئی منزل نہیں کہ وہ رک جائے۔ مسافر کا سفر جاری ہے۔

(۷)

افریقہ سے واپسی پر ایک دل لگی باز نے پوچھا' اے سیاح پر ماجرا کیا تم نے وہاں کوئی آدم خور بھی دیکھا۔ مسافر نے جواب دیا' میری زنبیل میں ایک آدم خور بھی ہے مگر وہ عادی نہیں تجرباتی ہے سیاہ پوست نہیں سفید فام ہے افریقی نہیں اطالوی ہے۔ اور حد تو یہ ہے کہ دیکھنے میں بڑا بھولا بھالا نظر آتا ہے۔ ایک بار اس کا اور مسافر کا ساتھ ہو گیا۔ مسافر نے دیکھا کہ وہ نوجوان بے دھڑک ہر نئی چیز کو منہ میں ڈال لیتا ہے خواہ وہ خوردنی ہو یا ناخوردنی' حلال ہو یا حرام' کیمیائی ہو یا نباتاتی' حیوانی ہو یا انسانی۔ جو چیز نگلنے کے لائق نہ ہو وہ اسے چوستا رہتا یہاں تک کہ اس کا ذائقہ پوری طرح گرفت میں آجاتا۔ پھر وہ اپنی ڈائری نکال کر اس میں تاریخ وقت اور مقام کے ساتھ نام اور مزہ درج کر لیتا۔ اس اطالوی نوجوان کا

یک فلسفہ اور نظریہ تھا۔ فلسفۂ حاجات اور نظریۂ خوراک۔ کہتا تھا کہ خوراک جسم کی سب سے بڑی تکراری حاجت ہے۔ دن میں کئی بار اس کے دباؤ کے سامنے اور زندگی میں کئی بار اس کی خاطر دوسروں کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ جن دنوں دنیا کی آبادی محدود تھی ان دنوں آدمی کی فہرست غذا لامحدود تھی۔ اس فہرست میں کم و بیش چھ ہزار اشیا شامل تھیں۔ اس وقت آبادی چار ارب ہے اور جدول کے اتنے بہت سے صفحے کم ہو گئے ہیں کہ یہ ہجوم کھانے کے لئے صرف چھ سو چیزوں پر انحصار کرتا ہے۔ یہ قدرت کی منشا کے خلاف ہے کیونکہ اس نے زمین کے توشہ خانہ میں ہر جاندار کی خوراک کا پورا اندازہ رکھا ہوا ہے۔ وہ نوجوان اس توشہ خانہ کے انبار کی نئی فہرست بنانے میں مصروف تھا۔ کہتا تھا جس دن یہ فہرست مکمل ہو گی اس روز ہر شخص کو کھانا مفت ملے گا۔ آخر پرندے کس سپر مارکیٹ سے روز خریداری کرتے ہیں۔ چرندے خوراک کی درآمد کا کاروبار کہاں کرتے ہیں۔ درندے کس سرد خانے سے گوشت لیتے ہیں۔ انسان کے لئے قدرت کم فیاض ہو، اور جانوروں کیلئے زیادہ، ناممکن اور نامعقول۔

مسافر کے لئے یہ خیالات بہت انوکھے نہیں تھے۔ وہ ایک بار عالمی خوراک کانگرس میں اس سے ملتی جلتی باتیں غور سے سن چکا تھا۔ کسی مندوب نے کہا، مستقبل کے کھیت پانی کی سطح پر کاشت کئے جائیں گے۔ کسی نمائندہ نے کہا وہ خلا میں آویزاں ہونگے۔ وہاں ایک ثقہ سائنسدان بھی موجود تھے۔ وہ نوبل انعام یافتہ تھے، اس لئے ان کی تقریر بڑے ادب سے سنی گئی۔ کہنے لگے قدرت بڑی فیاض ہے اور انسان بڑا احسان ناشناس۔ قدرت نے اس زمین میں انسان کی ضرورت سے ہزار گنا زیادہ خوراک پیدا کی ہے مگر وہ پھر بھی اس کی کمی کا رونا روتا ہے حالانکہ اسے اپنی

لاعلمی پر رونا چاہیئے۔ اس دعویٰ کی سند وہ ایک فارمولا کی شکل میں لائے۔ آدمی ایک حیاتی مادہ ہے لہذا خوراک کے لئے صرف حیاتی مادہ استعمال کرتا ہے مثلاً حیوانات اور نباتات۔ اگر زمین پر رہنے والے تمام انسانوں کا کیمیائی خمیر تیار کر کے روئے زمین پر اس کی تہ بچھا دی جائے تو اس کی موٹائی ایک ملی میٹر سے بھی کم ہوگی۔ اسی طرح حیوانات اور نباتات کی پیس بنا کر فرش خاکی پر بچھائی جائے تو وہ انسانوں کے خمیر سے ہزار گنا زیادہ ہوگی۔ بھوک اور قحط سے پناہ چاہتے ہو تو اس مصرع پر عمل کر دیکھو پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ اس کانگرس میں دور کی کوڑی لانے والے بہت سے افراد شامل تھے۔ ایک ہند چینی سے آئے تھے۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ اگر صبح کا اخبار پڑھنے کے بعد ناشتہ کے طور پر کھانے کے کام آسکے تو اس دنیا میں کبھی قحط نہیں پڑ سکتا۔ دلیل یہ تھی کہ کاغذ نباتات سے حاصل ہوتا ہے اس لئے تحقیق کے بل بوتہ پر اسے کھانے کے لائق بنایا جا سکتا ہے۔ رہی سیاہی تو اس کی جگہ رنگدار مشروبات استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اس تجویز پر جو فرمائشی قہقہہ لگا وہ موصوف کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا۔ ان کی سادگی اور سنجیدگی دونوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ اگلے روز اخبارات نے اس تقریر پر بڑی حاشیہ آرائی کی بلکہ موضوع کی مناسبت سے اس خبر کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ مسافر نے اس تجویز پر غور کیا تو نئے امکانات روشن ہوتے چلے گئے۔ لوگوں کے ہاں اخبارات ان کی اشتہا کے مطابق آیا کریں گے۔ خوش خوراک صبح و شام بہت سے روزانہ اخبار منگایا کریں گے۔ رمضان میں اخبارات کے سحری اور افطاری ایڈیشن نکلا کریں گے۔ جمعرات کو روٹیاں بانٹنے کے بجائے ہینڈ بل تقسیم ہونگے۔ شیر خوار بچے ڈبہ کے دودھ کے بجائے ڈبہ کا لیبل گھول کر پیا کریں گے۔ ناپسند خبروں کو کھانے والا تھوک دے گا۔ ناگوار بیانات کو کچا چبا جائے گا۔ چینی کھانوں کے ریستوران چینی

چھاپہ خانوں میں بدل جائیں گے۔ وہ بھی کیا عافیت اور کفایت کے دن ہوں گے جب لوگ دعوتوں کے لئے ردی جمع کیا کرینگے۔

عالمی خوراک کانگرس ایک عالم خیال تھا۔ اجلاس ختم خیال گم۔ دنیا حسب دستور آباد، کچھ شاد اور بہت کچھ ناشاد۔ لوگ حسب معمول مصروف، کچھ ہلکان ہو رہے ہیں کچھ ہلاک۔ لوگ کہنہ خواہشات کی خاطر ان دنوں ایک نئے مذہب کی پیروی کر رہے ہیں۔ ابلیس اس کا اوتار، زر اس کا پیغام بر، دولتمند اس کے برہمن، سیاح اس کے سفیر اس مذہب میں عیش کو عبادت کا اور عیش سراؤں کو عبادت گاہوں کا درجہ حاصل ہے دوسرے مذاہب کی طرح اس مذہب کے ماننے والے بھی فرقہ پرستی میں گرفتار ہیں۔ ایک فرقہ صرف پیٹ پوجا پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی سلامتی کے لئے خصوصی طعام گاہوں کا طواف کرتا ہے۔ مسافر نے اس فرقہ کو نزدیک سے دیکھا ہے اور ان کی عبادت گاہوں میں شکم سیر ہو کر کھانے کے بجائے دل سیر ہو کر تماشہ دیکھنے کے لئے کئی بار داخل ہوا ہے اگرچہ وہ نہ شکم پرور نہ خوراک شناس، نہ مزہ سنج نہ ذائقہ داں۔ تاہم ان مقامات پر اس نے دلچسپی کے بہت سے سامان دریافت کر لئے ہیں اور ان کا تعلق طعام سے نہیں بلکہ تشریفات اور تکلفات سے ہے۔ دلچسپیوں کی فہرست طویل ہے۔ مقام، منظر، آرائش، شیشہ وظروف، پیش کش، فہرست غذا، خوان کی وسعت وندرت، پیش غذا کے پہلے چمچ سے لیکر مشروبات خفیفہ کے آخری گھونٹ تک ہر مرحلہ کے غیر معمولی معمول، کھانے کے بعد سگار روشن کرنے والی گنگ بازی، بل پیش کرنے کا وہ انداز جیسے تعاون کے صلہ میں ہدیہ جاں نذر کر رہے ہوں اور رخصت کے وقت گاہک کو اس کا اوورکوٹ پہنانے کا وہ انداز جیسے خلعت فاخرہ عطا کر رہے ہوں۔

مسافر ایک چینی طعام گاہ میں داخل ہوا۔ آرڈر لینے والے نے بڑی نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا آپ کونسا ذائقہ پسند کرتے ہیں، شنگھائی، پیکنگ یا ذی چوآن۔ یہ سمندر میں لنگرانداز ریستوران بر روئے آب ہے اور ہانگ کانگ میں واقع ہے۔ مسافر انقلابی چینی ذائقہ کی تلاش میں عوامی جمہوریہ چین کے مشہور ترین پیکنگ ڈک ریستوران میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کے سامنے جیلی کا ایک ٹکڑا رکھتے ہیں جس میں بطخ کا پنجہ اور کچھ پر نظر آرہے ہیں۔ وہ پنجہ صاحب کو سلام کرتا ہوا کیوٹو کے خالص جاپانی ماحول میں جا پہنچتا ہے۔ جھک جھک کر دُہرا ہوتے ہوئے حکم کے بندے نے دریافت کیا آپ شاشیمی پسند کرینگے یا سوشی۔ ممکن ہے آپ ٹیری یاکی پسند کریں۔ آپ جیسے پرانے کرم فرما کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ٹیری یاکی کا مطلب ہے پالش کئے ہوئے گوشت کا روسٹ۔ خوش پوش ہسپانوی نے رازدارانہ لہجہ میں پوچھا پائیلا یا لیوگیوا۔ مونچھوں والے ٹھگنے میکسیکن نے پوچھا گوا کاموسے یا ان چلاداس۔ پرانا کرم فرما ایک گلہ داری مزروعہ کے ریستوران میں جا نکلا۔ چوڑے چھجے والا ہیٹ اور چمڑے کی پتلون پہنے ہوئے آدمی نے کہا۔ مجھے معلوم ہے آپ بیف کا کونسا ٹکڑا پسند کریں گے۔ پوچھنا صرف یہ ہے کہ یہ گوشت کس طرح تیار کریں، برشتہ یا بریاں سرخ یا سوختہ اور کس آنچ پر تیار کریں، کوئلہ یا شعلہ یا شعاعیں۔ اور یہ بھی بتائیے کہ گوشت کو سیخ کریں یا سلاخوں پر رکھیں یا گرم معدنی پتھر پر پکائیں۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

مسافر ایک عرب ہوائی کمپنی کا مہمان ہے۔ یہ المقبلات کا دور ہے۔ الطبق الرئیسی اس کے بعد آئے گا۔ اشتہا انگیزی کے لئے ایک بڑا ٹماٹر جسے کھوکھلا کر کے مرتبان کا کام لے رہے ہیں جھینگے سے بھر رکھا ہے۔ اس کا ڈھکن بھی ٹماٹر کاٹ کر بنایا ہے۔ ڈھکن

میں پلاسٹک کی ننھی سی تلوار لگی ہوئی ہے۔ ٹماٹر کے مرتبان سے جھینگا نوک خنجر کی مدد سے برآمد ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ خنجر کا استعمال بدل گیا ہے۔ یہ اب جہاد شکم کے کام آتا ہے۔ مسافر ایک ایشیائی ہوائی کمپنی کا مہمان ہے۔ چند ماہ ہوئے اس ملک میں اسلامی انقلاب آچکا ہے مگر فہرست غذا ابھی پرانی ہے۔ سینہ مرغ باسوس شراب سفید۔ مسافر مشرق بعید کی فضائی کمپنی کا مہمان ہے۔ اس کے سامنے آشیانہ سوپ رکھا ہوا ہے۔ ایک چھوٹی سی خانگی چڑیا ہوتی ہے جو بڑے شوق سے تنکا تنکا جمع کر کے آشیانہ بناتی ہے۔ اپنی چونچ سے تنکوں کو تانے بانے کی طرح جوڑتی ہے اور لیسدار لعاب سے جوڑ مضبوط کرتی ہے۔ مطبخ میں اس آشیانہ کو ابال کر اس کی لیس علیحدہ کرتے اور اس کا سوپ بناتے ہیں۔ لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانہ کے لئے۔ مسافر سرزمین یورپ میں کھڑا ہے۔ ایک دست فروش لڑکے سے ولایتی سنگھاڑے خریدتا ہے۔ ایک سولیرا کے دس سنگھاڑے لڑکا کہتا ہے تم عرب ہو۔ اچھا پاکستانی۔ کیا پاکستان میں تیل ہوتا ہے۔ نہیں ہوتا چلو خیریت ہوئی تیل بہت خراب چیز ہے۔ صرف حکمرانوں کے کام آتا ہے۔ عام آدمی میری طرح سڑک کے کنارے ٹھیلہ لگاتے اور پولیس کو رشوت دیتے ہیں۔ سارے لوگ اچھے اور سارے ملک اچھے، سب حکومتیں خراب اور سب حکمران خراب۔ یہ سن کر مسافر کو شعر کا دوسرا مصرع یاد آیا۔ بجلیاں بے تاب ہوں جن کو جلانے کے لئے۔

مسافر موجوں کے ساتھ بہتا ہوا ڈینوب کے کنارے چار مختلف ملکوں کی ایسی طعام گاہوں میں شامیں گذارتا ہے جہاں بجلی کی روشنیوں کا عکس دریا کے پانی میں ڈوبتا رہتا ہے۔ وہی مسافر سکردو سے سجاول تک سندھ ساگر کے دونوں کنارے چھان مارتا ہے مگر ایک نواب کی حویلی کے پائیں باغ اور پشتہ بند صحن کے علاوہ نہ کوئی قابل ذکر

سیرگاہ ملی نہ طعام گاہ۔ پانچ دریاؤں سے اپنے کھیتوں کی آبپاشی کرنے والے ان پانیوں سے کشت دل کی آبیاری کا کام اس ڈر کے مارے نہیں لیتے کہ پانی کم نہ پڑ جائے۔ مسافر رود نیل کے کنارے ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ ایک طبقہ کی طعام گاہ سے نیل اور اس کا دوسرا کنارہ نظر آتا ہے اور دوسرے طبقہ کی طعام گاہ کے اندر داخل ہوتے ہی منظر دریائی سے صحرائی ہو جاتا ہے۔ وہاں خیمہ لگا ہوا ہے اور ریت کا ٹیلہ ہے جس پر عریاں بدن نقاب پوش خانہ بدوش میٹھا گانا گا رہا ہے۔ مسافر بحرالکاہل کے ایک ساحل پر اترا جہاں کاہلی سیاحوں کو فروخت کی جاتی ہے۔ وہاں طعام گاہ کے بڑے ہال کے اندر ایک چھوٹا ہال کوڑیوں کے ہار پرو کر ان کی لڑیوں سے بنا ہوا ہے۔ چھت سے کوڑیوں اور گھونگھوں سے بنے ہوئے فانوس لٹک رہے ہیں۔ کوڑی لاکھ بے وقعت اور کم قیمت شے کیوں نہ ہو مگر جب لاکھوں کوڑیاں جمع کی جائیں اور چابکدستی سے انہیں سمندری مخلوق کے تہ آب بنے ہوئے خیالی محلات میں تبدیل کر دیں تو انتظامیہ کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ بل پیش کرتے ہوئے سرپرستوں کا سر الٹے استرے سے مونڈ ڈالیں۔ مسافر بلقان کے ایک جنگل میں پہنچا۔ درختوں کے نیچے ذرا کشادہ قطعہ میں چھوٹے راج ہنسوں کا جال پھیلا ہوا ہے اور ان کے درمیان جگہ جگہ کھانے کی میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ میزوں تک پہنچنے کے لئے جا بجا پلیاں بنی ہیں مگر لوگ تکلف برطرف قدم ذرا لمبا کرتے ہیں اور پار اتر جاتے ہیں۔ ہر راج ہنس میں مختلف اقسام کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ کھانے والے کی پسند کے مطابق اس کے سامنے مچھلی پکڑی جاتی ہے اور اس کے سامنے تلی جاتی ہے۔ مچھلی کا قتلہ فرائی پین میں چھوڑتے ہیں تو تیل کے چٹخنے کی آواز نکلتی ہے۔ مسافر جاننا چاہتا ہے کہ اس آواز کو اردو میں کیا کہتے ہیں۔ وہ انار کلی میں ایک بالاخانہ پر دستک دیتا ہے جہاں

دانش کا دروازہ کھلا اور جواب ملا کہ ایسی آواز کو شترآٹا کہتے ہیں۔ میونخ کی طعام گاہ میں پہیوں والا شیشے کا حوض میز کے سامنے آگیا اور مسافر نے اپنی پسند کے آبی جانور کی طرف اشارہ کر دیا۔ حوض کو دھکیل کر باورچی خانہ میں لے گئے ہیں اور باقی کارروائی نظروں سے اوجھل ہے۔ مسافر ٹوکیو کے نیو اوٹانی ہوٹل میں ایک سٹول پر بیٹھا ہوا ہے۔ بساط کے دوسری طرف ایک خان ساماں ہے جس نے چولہے کے ساتھ شیشے کے کئی مرتبان رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں جھینگے تیر رہے ہیں۔ ایک خودکار مشین کی طرح خان ساماں نے دو زندہ جھینگے جھینکے سے باہر نکالے اور چمٹی سے پکڑ کر انہیں بیسن میں ڈبو دیا۔ اگلے لمحہ وہ کڑھائی میں چھوڑ دیئے گئے۔ ایک شترآٹے کے ساتھ وہ زندہ جھینگے تازہ پکوڑوں میں تبدیل ہو گئے۔ خانساماں نے جو ایک خاتون ہے اتنا بھی نہیں سوچا کہ ٹھنڈے پانی سے نکال کر اچانک کڑھائی کے گرم تیل میں ڈالنے سے جاندار کے سرد گرم ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے مگر اسے سوچنے کی فرصت کہاں۔ گاہکی کا وقت ہے اور غیر ملکیوں کا ایک ٹھٹ لگا ہوا ہے۔ مسافران سیاحوں سے بہت دور بویریا کے سیاہ جنگل کی ایک شکار گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ وہاں اسے فہرست طعام کے ساتھ شکار گاہ کے روزانہ گزٹ کی ایک کاپی ملی۔ گزٹ میں جلی حروف سے خوشخبری کی سرخی لگی ہوئی ہے۔ متن میں لکھا ہے کہ یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ ہم اپنے مقررہ نصاب کے مطابق اس ہفتہ ایک کالا ہرن ایک سانبھر اور بیس مرغ شکار کر چکے ہیں جن کی تازگی آپ کے کام و دہن کی لذت بنے گی۔ اس کے علاوہ جو کچھ اس جنگل میں پایا جاتا ہے وہ ہمارے سرد خانہ میں موجود ہے۔ ہنگری اور چیکوسلواکیہ کی سرحد پر ایک شکار گاہ ہے۔ مسافر اس کے مہمان خانہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ غذا کے ہر دور کے ساتھ ایک اطلاعی رقعہ تقسیم ہوتا ہے۔ اس پر ایک طرف کسی جانور کی رنگین تصویر بنی ہوئی

ہے اور دوسری طرف اس کے بارے میں عام معلومات درج ہوتی ہیں۔ اب جو دَور
شروع ہوا تو مہماندار چاندی کے طشت میں رکھا اور پھولوں کے درمیان سجا ہوا ایک
چھوٹا سا سینگ لے آئے ہیں۔ یہ سینگ اس جانور کا تھا جس کے جسم کے دوسرے حصے کباب
کیے سامنے بڑی قاب میں رکھے ہوئے ہیں۔ سینگ کے ساتھ چھوٹے سے کارڈ پر اس جانور
کے شکار کا مقام وقت اور تاریخ درج ہے۔ اس عبارت پر اعتبار کریں تو آنجہانی کو صید
کمند ہوا بنے ہوتے صرف اڑتالیس گھنٹے گذرے ہیں۔ یہ گوشت کی تازگی کی سند ہے۔
اس سند کے باوجود اگر گوشت سخت یا کسیلا ہو تو اس میں مطبخ کا قصور نہیں بلکہ آنجہانی
کی عمر اور چال چلن کا ہے۔

برسلز کے مچھلی بازار کی نکڑ پر ایک گھریلو سی طعام گاہ کی شہرت سینہ بہ سینہ
پھیلتی جاتی ہے۔ راہ خورد و نوش کے سالک کسی سے خوش ہوں تو شرحِ شکم کے لئے
اس کا پتہ بخش دیتے ہیں۔ مسافر سول سروس کے ایک باذوق بزرگ کا ہاتھ تھام کر اس
مقام پر پہنچ گیا۔ میز پر بیٹھا تو ساز وسامان دیکھ کر اس جگہ کے مختلف ہونے کا اعتبار
آگیا۔ اس نے طرح طرح کے شیشہ و ظروف دسترخوان پر سجے دیکھے ہیں مگر یہاں کی بات
ہی کچھ اور ہے۔ ایک سوئی کارک میں لگی ہوئی ہے، ایک طرف لمبے دستہ والا ٹیڑھا دوشاخہ
رکھا ہے اور دوسری طرف ایک آری نما ہتھوڑی۔ مسافر تاڑ گیا۔ سوزن چاک دل رفو کرنے
کے لئے ہے۔ ٹیڑھا کانٹا کہہ رہا ہے کہ یہاں آنا کانٹوں میں الجھنے سے کم نہیں۔ تیسرا آلہ
تیشہ فرہاد کی تجریدی صورت ہے۔ ایسا آلہ اور ایسا آرٹ سر پہ ضرب لگانے کے کام آتا
ہے۔ مسافر اس توجیہہ سے مطمئن ہو کر پرچہ ترکیب استعمال پڑھنا شروع کرتا ہے۔ پتہ چلا
کہ صدفی کیڑے کو جو نمکین پانی میں ابالنے کی وجہ سے صدف کے اندر سکڑ اور چپک

کر رہ جاتا ہے اس سوئی کی مدد سے اس کی لحد سے باہر نکالتے اور کھاتے ہیں تیشہ کیکڑہ کی ٹانگیں توڑنے کیلئے ہے اور دوشاخہ ان خمدار ٹانگوں سے گودا نکالنے کا آلہ ہے۔

مسافر نے ایک پُرتکلف طعام گاہ کی آرائش دیکھ کر ساتھی سے کہا، ان بے چاروں کو کھانا کھلانے کیلئے کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ ساتھی نے کہا، یہ جتن تو روپیہ کمانے کے لئے ہیں۔ یہ طعام گاہیں ان لوگوں کے لئے ہیں جن کی بھوک مری ہوئی اور ضمیر سویا ہوا ہوتا ہے۔ آرائش کا مقصد یہ ہے کہ ضمیر آرام سے سویا رہے۔ اہتمام کا مقصد یہ ہے کہ اشتہائے صادق نہ سہی کم از کم کاذب ہی جاگ اٹھے۔ اس خدمت کا صلہ بڑا گرانقدر ہوتا ہے۔ تاہم یہاں اتنے رئیس نہیں آتے جتنے بگڑے ہوئے لوگ کیونکہ حق خدمت اکثر اس مد سے ادا ہوتا ہے جسے حساب مہمانی کہتے ہیں۔ یہ حساب دوستاں ہے جسے اس وقت تک دل میں رکھتے ہیں جب تک وہ کسی کاروباری مصلحت کی بنیاد دل میں نہ بھر جائے۔ مسافر نے اس مہمانی کے بڑے تماشے دیکھے ہیں۔ اب تو یہ حالت ہے کہ جب وہ کسی شخص کے دانتوں میں سونا بھرا ہوا دیکھ لے تو اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ شخص حساب مصلحت کی مہمانی کھا کر خلال کرنا بھول گیا ہو۔

ریل گاڑی ہانشو کے پہاڑی شہر فوکوشیما کے اسٹیشن پر رکی مسافر نیچے اترا۔ میزبانوں کا طرز تپاک دیکھ کر اندازہ ہوا کہ پھر کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے۔ کوئی آنکھیں بچھا رہا ہے کوئی خود بچھا جا رہا ہے۔ وہی حساب دلِ دوستاں کا جانا پہچانا منظر۔ ہوٹل کی دہلیز پر جوتے اتار کر کھلے منہ والے پلاسٹک کے سلیپر پہن لئے ہیں لیساط استقبالیہ پر کسی نے اوورکوٹ اتروالیا ہے۔ اب ان کی نظر کوٹ پتلون پر ہے۔ یہ

ہوٹل جاپانی روایت کا گہوارہ ہے۔ یہاں مہمانوں کے ساتھ پیارے بچوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ بدیسی لباس چونکہ یہاں بالکل اوپرا لگتا ہے اس لئے ہر مہمان کو مقامی لباس پہننا پڑتا ہے۔ مسافر دعوت طعام میں شامل ہونے کے لئے بن ٹھن کر تیار کھڑا ہے گھٹنوں تک آنے والا کھلا پاجامہ، آدھی آستینوں بغیر تکموں اور ناف سے ذرا اوپر رہ جانے والی قمیص، اور ان کے اوپر بغیر آستین کا ادھ سلا چوغہ جسے پٹکے کے ساتھ باندھا ہوا ہے۔ پنڈلیاں اور پاؤں بے لباس، سارا سینہ کھلا، جھانکنے کے لئے بغلیں حاضر، پالتی مار کر فرش پر بیٹھیں تو بے لباسی کے خاص پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اس لباس میں اتنے شگاف ہیں کہ پنبہ کجا کجا نہم۔ یوں بھی پنبہ اس لباس کے ساتھ میل نہیں کھاتا کیونکہ اس کی بافت ریشمی معلوم ہوتی ہے مسافر اس حلیہ میں کمرہ سے باہر نکلتا ہے اور ہوٹل کی راہ رو میں لوگوں سے آنکھیں چراتا ہوا ایک خصوصی طعام گاہ میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں بیٹھنے کے لئے ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار چٹائی بچھی ہوئی ہے اور کھانے کے لئے درمیان میں ایک نیچا اور لمبا تخت رکھا ہے۔ سارے مہمان تخت کے اردگرد پالتی مار کر بیٹھ گئے ہیں اور بانس کی تیلیوں کی متحرک دیوار کھینچ کر کمرہ بند کر لیا گیا ہے۔

اب یہ مرغانِ نو گرفتار کا قفس معلوم ہوتا ہے۔ مسافر گرد و پیش پر نگاہ ڈالتا ہے۔ جتنے مہمان ہیں اتنے ہی مہماندار ہیں۔ کھانا، باتیں کرنا، ہنسنا، تالیاں بجانا اور آفرین بھیجنا مہمان کا شغلہ ہے۔ گانا، بجانا، ناچنا اور لقمہ بنا کر پیش کرنا مہماندار کا کام ہے۔ جاپانی تہ دار پنکھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں جیسے خوشنما پرندے پرواز میں ہوں۔ چھتریاں چرخی کی طرح گھومتی ہیں اور رنگوں کا بھنور بن جاتا ہے۔ کمخواب کے کیمونو زیوں لگتے ہیں جیسے کمرے میں جا بجا دھنک کے ٹکڑے بکھرے ہوں۔ تخت پر خوان بڑے سلیقہ سے سجا ہوا ہے ہر نصف ساعت کے بعد

ایک نئی غذا چن دی جاتی ہے۔ چار گھنٹے گذر چکے ہیں اور کھانا ختم ہونے میں ابھی دو گھنٹہ باقی ہیں۔ مسافر کے سامنے قاب میں ایک بڑی سی مچھلی رکھی ہے۔ مچھلی کا سر پانی میں ڈوبا اور سبزیات سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کی آنکھ پر کپڑے کی ترپٹی رکھی ہوئی ہے۔ بظاہر مچھلی سالم نظر آتی ہے مگر اس کے جسم کا وہ حصہ جو قاب میں اوپر کی طرف رکھا ہے ایک جگہ سے ورق ورق ہے۔ ہمراہی اس کے دو ایک ورق چمٹی سے اٹھا کر کھا چکے ہیں اور اس کی لذت بیان کر رہے ہیں۔ مسافر بھی اس غذا کی آزمائش کے لئے تیار ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ مچھلی پکانے کا یہ کونسا طریقہ ہے۔ جواب ملا، مچھلی زندہ ہے۔ اس کے جسم کے ایک حصہ کو اس نفاست سے مشینی چیرا دیا ہے کہ وہ کھانے کے دوران میں بھی زندہ رہتی ہے ہمراہی نے سبزیات کو ہٹا کر ایک ہاتھ سے مچھلی کا سر اوپر اٹھایا ہے اور دوسرے ہاتھ سے جاپانی شراب ساکی کا جام اس کے حلق میں انڈیل رہا ہے۔ مچھلی نے گھونٹ بھرا اور اس بے سدھ جسم نے جس کے دو ایک قتلے کھائے جا چکے ہیں ایک ہلکی سی جھرجھری لی۔ اس بے جان تڑپ کے ساتھ مچھلی ٹھنڈی پڑ گئی۔

تعجب ہے کہ قحط الرجال کا ماتم کرنے والا اور اپنی آٹو گراف البم کو نصف خالی چھوڑ دینے والا قحط کی خاطر تشریفات اور حساب دوستاں کی دنیا کو چھوڑنے میں تامل کرتا ہے۔ اس سے یہ توقع بے جا نہ تھی کہ وہ تکلف اور تصنع کے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا، اور اعلان کر دے گا کہ میں انقلابی ہو گیا ہوں۔ فوکوشیما میں زندہ خوری کا مظاہرہ دیکھ کر مسافر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا مگر چھلکا نہیں لہٰذا اعلانِ انقلاب ملتوی ہو گیا۔ آج شاید پہلو بچانا مشکل ہو۔ کھانے کی میز پر سونے چاندی کے برتن لگے ہیں۔ مسافر کے سامنے سونے کا جگمگاتا تھال رکھا ہے اور اس کی شفاف سطح پر مسافر کا اترا ہوا چہرہ نظر آ رہا ہے۔

اسے اس خیال سے وحشت ہو رہی ہے کہ آخر عیاشی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ یہ سونے کی پلیٹ ابھی سالن سے سن جائے گی اور کچھ دیر بعد پس خوردہ کوڑا اٹھانے کے کام آئیگی۔ کھانا چناجا رہا ہے اور اس تھال کے اوپر چینی کی تھالی رکھ دی گئی ہے۔ چاندی کے خوان پر خوان آرہے ہیں۔ چینی کی صاف تھالیاں آتی ہیں اور ناصاف اٹھائی جاتی ہیں کھانا ختم ہوا۔ سونے کا چمکدار تھال وہیں کا وہیں اور ویسا کا ویسا دھرا ہے۔ ہاتھی کے اس دانت کی طرح جو کھانے کے بجائے دکھانے کے کام آتا ہے۔ اعلان انقلاب پھر ٹل گیا۔ مسافر ایک ہنگامہ پرور ملک کے سفر پر ہے۔ اس ملک کی برآمدات میں اور کئی ممالک کی طرح انقلاب کی جنس بھی شامل ہے۔ بھانت بھانت کا شورشی یہاں جمع ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ درس انقلاب لو اور موقع کی تاک میں بیٹھ جاؤ۔ جب حالات سازگار ہوں تو واپس جا کر قسمت آزمائی کرو۔ اس وقت تک روٹی کپڑا اور مکان مفت۔ آج ایک تقریب بہر ملاقات نکل آئی ہے۔ ایک طعام گاہ میں زیر تربیت انقلابی ساتھ والی میز پر بیٹھے ہیں۔ فرصت طلب اور موقع تلاش، جلالی اور جلا وطن۔ کھانا تو محض ایک بہانہ ہے۔ سارے کے سارے ڈٹ کر عیاشی اور اوباشی کر رہے ہیں۔ زیادہ تر بیہوشی کی سرحد پر بیٹھے ہوئے بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمراہی نے کہا بے شک یہ جاں گذشتہ اپنے ملک کے حکمرانوں کو نکالنے میں کامیاب ہونگے مگر اس کے بعد یقیناً ایک اور انقلاب آئے گا جس میں یہ خود بہہ جائینگے۔ مسافر نے ہمسایوں کو غور سے دیکھا اور ہمراہی کو غور سے سنا۔ ناچار اس روز بھی اعلان انقلاب کی نوبت نہ آئی۔

مسافر نے اطالوی نوجوان سے کہا، تم بات ٹالنے کی کوشش مت کرو اور اپنی ڈائری کھول کر کچھ اقتباسات سناؤ۔ اس نے کہا ذائقہ کا علم بہت وسیع ہے۔ کیا تم کسی

خاص چیز کا ذائقہ معلوم کرنا چاہتے ہو۔ اچھا چلو میں تمہیں مختلف اقسام کے گوشت کا مزہ بتاتا ہوں۔ مینڈک کا گوشت خوش مزہ پرندوں سے ملتا جلتا ہے۔ اچھے مینڈک اور سیمرغ میں تمیز کرنی بڑی مشکل ہے۔ سوسمار کا گوشت بوڑھی مردار مرغی کی طرح بے لوچ اور بے رس ہوتا ہے۔ جانوروں میں سب سے لذیذ گوشت کتے کا ہوتا ہے اور سب سے بدمزہ بندر کا۔ سانپ کا گوشت چباتے ہوئے جبڑے تھک جاتے ہیں۔ اس کا ذائقہ نمکین ہوتا ہے۔ اس میں خوب مرچیں ڈالتے ہیں تاکہ نمک ناگوار نہ گذرے۔ جیسے بندر کے برشتہ گوشت میں خوب نمک اور سرکہ ڈالتے ہیں تاکہ اس کی مٹھاس مرجائے۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ بندر اور آدمی کی نسلوں میں کہیں پیوندکاری ہوئی ہے بالکل غلط کہتے ہیں۔ وہ آدم خوری کا تجربہ کریں تو انہیں دونوں کے گوشت کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ آدم خوری میں بس یہ خرابی ہے کہ لہو کی چاٹ کی طرح آدمی کے گوشت کی چاٹ پڑ جاتی ہے۔ اس گوشت میں لذت نہیں نشہ ہوتا ہے۔ مزہ کے لحاظ سے تو یہ کسی حد تک سینوئے کی طرح ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ راک فیلر کا جوان لڑکا مشرق بعید کے جنگلوں میں گم ہو گیا تھا۔ زمین نگل گئی یا آدم خور کھا گئے۔ زمین کو بھی اس گوشت کا نشہ ہے یقین نہ آئے تو جا کر قبرستانوں کو غور سے دیکھو۔ مسافر کو اس بیان پر دم بخود دیکھ کر اطالوی نوجوان بولا۔ آپ افسردہ لگتے ہیں شاید ان تجربات کی بنا پر آپ مجھے بدمذاق اور وحشی سمجھنے لگے ہیں۔ جناب والا میں بڑا نازک مزاج اور نفاست پسند ہوں۔ جب مجھے بھنے ہوئے گرم گرم کیڑے مکوڑے ذرا سا مکھن ڈال کر مکئی کے دانوں کی طرح چبانے کے لئے پیش کئے گئے تو میں نے اس دعوت کو اپنے مذاق سلیم کی توہین سمجھتے ہوئے حقارت کے ساتھ رد کر دیا۔ میں ایک بااصول شخص ہوں۔

بااصول آدم خور اطالوی نے بات کا رخ مسافر کی طرف پھیرتے ہوئے کہا تم نے بھی تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کچھ اپنے تجربات کی بات کرو۔ کہاں کہاں گئے اور وہاں کھانے میں کیا کچھ آزمایا اور کیا پایا۔ مسافر نے کہا، مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ۔ اس کے لئے ایک دن مقرر ہے اس وقت تک پردہ ڈھکا رہنے دو، البتہ میرے ایک دوست کا واقعہ سن لو۔ اپنے اپنے اصول کی بات ہے، اکثر سیاح ہر ناروا کو روا کھتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو روا کو ناروا بنا لیتے ہیں۔ میرا نوجوان دوست پہلی بار ملک سے چند ماہ کے لئے باہر گیا۔ اس نے آسٹریلیا پہنچ کر اپنے والد محترم کو لکھا کہ اگرچہ میں غیر ذبیحہ گوشت کھانے سے پرہیز کرتا ہوں تاہم آپ اس مسئلہ کو کسی ایسے عالم سے بیان کرنے کے بعد جس نے نئی دنیا دیکھی اور برتی ہو میری رہنمائی کریں۔ اس کا خیال تھا کہ عالم کی تلاش اور فتوے کی یافت میں چند ہفتے لگیں گے۔ اس کے بعد بہت سا وقت پاکستان اور آسٹریلیا کے درمیان ڈاک میں صرف ہوگا جس کا انتظام ۱۹۵۱ء میں کوئی ایسا یقینی اور تیز پرواز نہ تھا۔ اور یوں اس قیام کا نصف حصہ اسے اپنی تربیت کے سہارے اور نوجوان سوچ کی رہنمائی میں گذارنا ہوگا۔ کبھی خیال آتا کہ خط یا اس کا جواب ادھر ادھر ہو جائے گا اور اس سفر کی تمام مدت کے لئے اسے خود اپنے فیصلہ پر انحصار کرنا ہوگا۔ ان اندیشہ ہائے دُور دراز کی عمر بہت کم نکلی۔ جواب بواپسی ہوائی ڈاک دس دن کے اندر آ گیا۔ والد محترم نے لکھا تھا، مسئلہ کسی مفتی کے سامنے پیش کرنے کے بجائے میں تمہارے ضمیر کے سپرد کرتا ہوں۔ ضمیر سے بڑا دارالافتا کہیں اور نہیں ملے گا۔ جہاں گنجائش نظر آئے وہاں جھگڑا مول لینے کے بجائے شریعتِ قلبی سے کام لو۔ اپنی تربیت اور فکر کے مطابق فیصلہ کرنے کی ایک اچھی مثال سلطان مظفر کے کردار میں ملتی ہے۔ اپنے

اندر ہمت پاتے ہو تو اس مثال کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرو۔ ایک بار سلطان کی غیر حاضری میں اعلےٰ نسل اور تربیت کا نایاب شاہ پسند گھوڑا بیمار ہو گیا۔ علاج کے لئے بڑے جتن کئے گئے یہاں تک کہ دوا میں شراب ملا کر پلائی گئی۔ بالآخر گھوڑا صحت یاب ہو گیا۔ سلطان واپس آیا تو یہ بات اس کے علم میں لائی گئی۔ سلطان کو وہ گھوڑا بہت عزیز تھا۔ کارزار کفر و دیں میں وہ دونوں بارہا اکٹھے شامل ہوئے تھے۔ وہ ایک غازی گھوڑا تھا۔ اطلاع ملی تو سلطان مظفر نے صرف اتنا کہا۔ اب کبھی میری زین اس کی پشت پر مت رکھنا۔ مسافر کے دوست کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔ والد محترم کا خط پڑھنے کے بعد اس نے عہد کیا کہ وہ خواہشات کے گھوڑے پر سوار ہونے کے بجائے تمام عمر پیادہ چلے گا۔

(۸)

مسافر آج پیادہ پا اوساکا پہنچ گیا ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ راہ گزر چل رہی ہے اور راہ رو کھڑے ہیں۔ روش حرکت میں ہے اور راہی ساکت۔ لوگ کسی سواری پر سوار ہونے کے بجائے راستہ کی پشت پر سوار ہیں۔ ان کا سفر صرف دو گام میں طے ہو جاتا ہے۔ ایک قدم جو بڑھا کر روش پر کھڑے ہوتے ہیں اور دوسرا قدم جو اٹھا کر نیچے اتر جاتے ہیں۔ راہ سلوک میں بیشک ایسا مقام آتا ہے جہاں سفر کی صعوبت ختم ہو جاتی ہے اور منزلیں خود چل کر سالک کے پاس آجاتی ہیں۔ لیکن یہ تو ایک عالمی نمائش ہے جہاں ایک تماشا ہو رہا ہے اور ایک امتحان۔ یہاں جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے اس تک ہر ایک نظر پہنچتی نہیں۔

مسافر اوساکا کی ایکسپو نمائش کے صدر دروازہ سے داخل ہو کر رواں روش پر قدم رکھتا ہے۔ نمائش کا سفر شروع ہو جاتا ہے گو اس کے اسباب نظر نہیں آتے۔

بس پیروں تلے سے زمین نکلی جا رہی ہے اور اس پر جو فرش بچھا ہے وہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ نہ پالکی اور کہار، نہ جھول اور گدھا' نہ چار جامہ اور گھوڑا' نہ کجاوہ اور اونٹ، نہ عماری اور ہاتھی۔ زمانہ کیا کیا نگل گیا' وقت کیا کچھ ہضم کر گیا۔ مسافر ربڑ کی خودکار حامل پٹڑی پر کھڑا ایکسپو نمائش کے مختلف مناظر دیکھنے کے بجائے اپنے ذہن میں ان سواریوں کی نمائش سجا رہا ہے جو اس کے تجربات کا حصہ ہیں۔ وہ سطح آب پر رہتے ہوئے دوش ہوا پر چلنے والی خیز آب کشتی۔ وہ دنیا کی سب سے تیز رفتار ریل گاڑی ہکاری کے سر کے بل سرپٹ چلنے والے پہیے جو اتنے بے آواز تھے جیسے گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہو۔ وہ سر جھکا کر اٹھنے اور اٹھا کر اڑنے والا کلنگ صورت کنکارڈ ہوائی جہاز جو دو ہلکے جھٹکوں کے بعد آواز کی رفتار سے تیز تر ہو گیا تھا۔ وہ مسلم یونیورسٹی اصطبل کا رہوار گلفرنگ جس کی سواری کے لئے منہ اندھیرے اٹھنا پڑتا اور جس کی زین پر بیٹھنے کے بعد باد صبا اڑا کرلے جاتی تھی۔ وہ موٹر گاڑی جو مسافر نے ایک بار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلائی تھی۔ جتنی سواریاں اتنی الجھنیں۔ ہر تجربہ کے ہیجانی سرور میں مزہ کرکرا کرنے والی الجھن شامل ہے جب بھی تجربہ کو یاد کیا وہ الجھن سوالیہ نشان بن کر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ آخر پانی میں جہاں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی انسان کی رفتار اتنی کم کیوں ہے۔ ہکاری کے دریچہ سے کوہ فیوجی یاما سیتل پاٹی پر بناتے ہوئے منظر سے بھی زیادہ مصنوعی کیوں نظر آتا ہے۔ اتنے سبک رفتار طیارہ کو ناکام بنا کر انسان نے اپنی مجموعی عمر کے کتنے برس کھوئے ہیں۔ سبک سنہری گلفرنگ ہر سال نمائش کی دوڑ میں بھدی مشکی گھوڑی جین سے کیوں ہار جاتی تھی۔ سو میل کی رفتار سے موٹر چلانے پر جو فاتحانہ احساس پیدا ہوا وہ ایک کم سو میل کی رفتار پر پیدا ہونے والے احساس شکست سے یکسر مختلف کیوں ہے۔ موٹر والا تجربہ مسافر نے

یورپ میں کیا تھا۔وہ ایک جرمن صنعت کار کے ہمراہ جرمنی سے سوئٹزرلینڈ جا رہا تھا۔موٹر وہ تھی جو تیز رانی کے مقابلوں میں استعمال ہوتی ہے اور سڑک وہ تھی جو بلا روک ٹوک سیدھی جاتی ہے۔اس آٹو بان کے کچھ حصے ایسے بھی تھے جہاں گاڑی آہستہ چلانے پر چالان ہو جاتا۔ دو گھنٹے کے تذبذب کے بعد دبی زبان سے مسافر نے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا جو ڈھیروں خواہشوں کے نیچے کہیں دبی ہوئی تھی۔ہمراہی نے فوراً گاڑی روکی اور نشست بدل لی۔کہنے لگا خواہشوں کو دبائے رہنے سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔اگرچہ ہم جرمنی کی سرحد سے گذر کر سوئٹزرلینڈ میں داخل ہو چکے ہیں جہاں پہاڑی سڑک ہونے کی وجہ سے سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے موٹر چلانے کے تجربہ میں بہت خطرہ ہے تاہم یہ اس خطرہ سے بہت کم ہے جو خواہشات کو دبانے اور امنگوں کا گلا گھونٹنے سے پیدا ہوتا ہے۔میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گا کیونکہ ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کاری کا خطرہ میرا معمول ہے۔پہاڑ کی پیچدار سڑک شروع ہو چکی تھی لہذا ایک ایسے ٹکڑے کی تلاش جس پر دلِ ناداں کو کھلی چھٹی دی جائے ایک مسئلہ بن گئی۔جہاں موٹر تیز کی وہیں موڑ آ گیا۔بیرپا سڑک کے موڑیوں بھی دور دور نہ تھے مگر جب کبھی رفتار کو بڑھایا ان کا درمیانی فاصلہ اور کم ہو گیا۔بارہا موٹر نوے میل کی رفتار تک لے جانے کے بعد اسے آہستہ کرنا پڑا۔دو بار ننانوے میل کی منزل سے ناکام و ناشاد لوٹنا پڑا۔یہاں تک کہ سڑک ایک اونچے پہاڑ پر سست رفتاری سے چڑھنے لگی۔شکار ہاتھ سے جاتا نظر آیا۔یہ سڑک جونہی پہاڑ کی اوٹ سے دوسری جانب نکلی سامنے ایک چھوٹی سی وادی نظر آئی۔مطلوبہ رفتار سے اس وادی کو طے کرنے کے لیئے نوے سیکنڈ درکار تھے۔وادی نے کہا یہ وقت سوچ کا نہیں عمل کا ہے۔یہی وہ ایک منٹ ہے جس کی تلاش میں تم حیران و پریشان پھرتے رہے ہو۔یہ سنتے ہی مسافر نے

اپنے قطعی فیصلہ سے مشین کے کل پرزوں کو مطلع کیا۔ سلیمانی خدام کی طرح وہ فوراً حکم بجا لائے۔
وادی ختم ہوئی تو خواہش بھی پوری ہو گئی۔ اگلا موڑ کاٹتے ہوئے کسی نے پوچھا، اب
یہ تو بتا دو اس پرخطر خواہش کا مقصد کیا تھا۔ مسافر نے کہا، یہ بات مجھے بھی معلوم نہیں۔ نہ
یہ پتہ کہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے اور نہ یہ واضح کہ اسے پورا کرنے سے کیا ملتا ہے۔ غالباً
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ۔

دو چار قدم چلنے سے خون کی گردش میں جو تیزی پیدا ہوتی ہے اُس کی اس
جدید ترین نمائشی ماحول میں کوئی گنجائش نہیں۔ مسافر ایکسپو نمائش کی رواں دواں روش
پر کھڑا اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے۔ نمائش کا عنوان ہے ترقی اور ہم آہنگی۔ اگر جدت
اور بدعت رکھ دیتے تو کئی فرقوں کی تسلی ہو جاتی۔ نمائش والے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ انسان
نے کتنی ترقی کی ہے اور مستقبل حال سے کتنا مختلف اور بہتر ہو گا۔ دیکھنے والے کو یہ نظر آتا
ہے کہ ہر نئی ایجاد اور ہر تازہ آسائش کی پاداش میں آدمی کی ایک خوبی سلب ہو جاتی
اور ایک خامی بڑھ جاتی ہے۔ مستقبل کا آدمی مختلف ہو گا مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ بہتر بھی
ہو۔ مستقبل کتنا مخدوش ہے۔ جب سے انتقال خون کی آسانیاں میسر آئی ہیں انسان خون
بہانے میں بڑی فیاضی سے کام لے رہا ہے۔ جب سے قرض لینے کی سہولتوں میں اضافہ
ہوا ہے وہ آنے والی نسلوں کو گروی رکھنے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ جب سے لاسلکی ایجاد
ہوئی ہے آدمی کو سارے رشتے باطل نظر آتے ہیں یہاں تک کہ اب آنے والی نسلیں بھی
رشتہ کے بغیر چلی آ رہی ہیں۔ جب سے ایک صورت نما آلہ ایجاد ہوا ہے سیرت غیر ضروری
ہو کر رہ گئی ہے۔ مسافر سوچتا ہے مستقبل کے اس آدمی کا ٹھکانہ کہاں ہو گا۔ اتنے میں چلتی
پٹڑی اسے نمائش کے اس حصہ میں لے آئی ہے جہاں لکھا ہے، مستقبل میں رہائش کی ایک

امکانی صورت۔ سامنے آہنی شہتیروں کا جال ہے جس میں جا بجا کابک لٹک رہے ہیں جیسے کسی شاخ پر بئے کے بہت سے گھونسلے جھول رہے ہوں۔ ہر کابک دور سے تابوت جتنا بڑا نظر آتا ہے جس میں مستقبل زندہ در گور ہو جائے گا۔ سناحت حرکت کی خواہش کا خیال رکھتے ہوئے اس سے بھی جدید طرز کے رہائشی تابوت زیر تجویز ہیں۔ خانۂ تابوت میں رہائش رکھنے والا آدمی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے بٹن دبایا کرے گا۔ لیٹنا چاہے گا تو تابوت متوازی ہو جائے گا۔ کھڑا ہونا چاہے گا تو عمودی ہو جائے گا۔ بیٹھنا چاہے گا تو لوہے کا یہ خول دہرا ہو جائے گا۔ اگر آدمی ورزش کا شوقین ہوا تو دو چار کسرتی کرتبوں کے بعد شاید اس پائپ میں اتنے پیچ پڑ جائیں کہ بھٹی میں سرخ کئے بغیر اسے سیدھا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس صورت میں اس کے اندر بسنے والے کا حال اس صدفی کیڑے سے مختلف نہ ہوگا جسے مسافر نے برسوں کے مچھلی بازار میں دیکھا تھا۔

روش چل رہی ہے۔ موضوع ٹھہرا ہوا ہے۔ منظر بدلتا جا رہا ہے۔ مستقبل کی نئی نئی امکانی صورتیں نظر آ رہی ہیں۔ کوئی ڈیڑھ سو پویلین ہیں مگر ایک پگوڈا کے علاوہ ہر عمارت کا نقشہ اتنا انوکھا ہے کہ حال کی دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ پگوڈا بھی در اصل کمپیوٹر کی شکل کا ہے۔ جن دنوں صرف ایک سورج دیوتا ہوا کرتا تھا ان دنوں پگوڈا سے کام نکل آتا تھا۔ اب انسان کے اتنے دیوتا ہیں کہ ان کی گنتی کے لئے کمپیوٹر کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ کمپیوٹر نما پگوڈا ایک تجارتی کمپنی کا ہے جو یہ بات واضح کرنا چاہتی ہے کہ آج کل مذہب ایک تجارت ہے اور تجارت ایک مذہب۔ ہانگ کانگ کے پویلین پر کئی منزلہ خوشنما رنگین ریشمی بادبان لہرا رہے ہیں اور ارد گرد جو پانی کی خندق ہے اس پر پل بنے ہوتے ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ خشکی کی تہائی ختم ہونے کے بعد انسان کو لامحالہ تری کی دو تہائی

میں مصنوعی جزیرے بنانے پڑیں گے ۔ اس پویلین کے بادبانوں کا رُخ ہوا کے ساتھ بدلتا رہتا ہے ۔ اس معاملہ میں بادبانوں اور انسانوں میں کوئی فرق نہیں ۔ برما مستقبل کو ماضی کا عکس قرار دیتا ہے ۔ اس کا پویلین چوڑے پیندے والی دو منزلہ منقش سنہری کشتی ہے جس کے دونوں سرے آبی پرندوں کی صورت گھڑے ہوئے ہیں ۔ ایسی آرائشی کشتیاں زرم رد ندیوں اور سست رو صدیوں میں چلا کرتی تھیں ۔ جنوبی کوریا کا پویلین بھی کشتی کی شکل کا ہے مگر اس کشتی اور برما کی کشتی میں وہی فرق ہے جو بغیر سمندر دیکھے ہوئے اور سمندر پار سے آتے ہوئے شخص میں ہوتا ہے ۔ یہ تجریدی آرٹ کا نمونہ ہے ۔ عمارت کا نقشہ کشتی کی شکل سے ملتا جلتا ہے ۔ دونوں جانب دیواروں پر لوہے کے فلس ماہی مختلف سطح پر آگے پیچھے سہ جہتی ترتیب سے لگے ہوئے ہیں ۔ ان دیواروں سے چند چپو باہر نکلے ہوئے ہوا میں معلق ہیں ۔ عمارت کے پس منظر میں کئی بلند و بالا کالی چمنیاں بنی ہوئی ہیں ۔ پیغام کچھ یوں بنتا ہے ۔ ہم کبھی غریب ماہی گیر اور محنتی ملاح ہوا کرتے تھے ۔ ہم نے محنت اور علم کے ساجھے سے زمانہ پر اپنا جال پھینکا ہے ۔ یہ بلند کالی چمنیاں ہماری نئی مچھلیاں ہیں ۔ ہماری کشتی کے چپو اب خلا میں چلتے ہیں ۔ ماضی سے ہمارا معنوی رشتہ قائم ہے اور ہم اسے مستقبل میں بھی یاد رکھیں گے ۔ ماضی سے تعلق قائم رکھنے کی ایک غیر ارادی کوشش آسٹریلیا کے پویلین میں نظر آتی ہے ۔ اس کا بڑا ہال جس کی چھت سرپوش کی طرح ہے ایک طرف واقع ہے اور دوسری طرف کچھ فاصلہ پر سیمنٹ کا ایک مضبوط پشتہ ہے جس سے ایک کنڈا ہوا میں ہاتھ کی طرح بلند ہوتا ہے ۔ اس ہاتھ نے بڑھ کر چھت کے ڈھکن کو تھاما ہوا ہے ۔ اس علامتی طرز تعمیر میں آسٹریلیا اور برطانیہ کے محل وقوع، تعلقات اور تاریخ کا سراغ ملتا ہے ڈومینین سٹیٹس کی اس سے بہتر تعریف اینٹ گارے میں اور اس سے واضح تشریح ہو ہی

سیمنٹ میں نہیں ہو سکتی۔

آئیوری کوسٹ کے پویلین کی شکل ہاتھی دانت جیسی ہے۔ ان کی نظر میں دنیا ایک فیل خانہ ہے جہاں چھوٹے جانوروں اور چھوٹے ملکوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ مجمع الجزائر ہوائی کے پویلین کی صورت آتش فشاں پہاڑ کی سی ہے اور مستقبل کی اس امکانی شکل سے بہت سے لوگوں کو اتفاق ہے۔ فیوجی کمپنی کا بڑا ہال پہلو بہ پہلو پہیہ نما شہتیر جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ یہ ربڑ اور کپڑے کے دیو قامت شہتیر ہیں جن میں ہوا بھری ہے اور جن کے دونوں سرے زمین پر ذرا فاصلہ سے باندھ کر ایک بلند قوس بنائی ہوئی ہے۔ ایسے سولہ شہتیروں کے نیچے تین چار ہزار آدمیوں کی جگہ ہے۔ وہ کہتے ہیں مستقبل اس سے زیادہ پائیدار نہیں ہو سکتا۔ شاعر اتفاق کرتا ہے۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا۔ ایک پویلین ان نرم و نازک ہوا بھرے گل تکیوں سے یکسر مختلف ہے۔ یہ لوہے اور فولاد کی سنعت کا پویلین ہے۔ اس میں ہر شے لوہے اور فولاد کی ہے اور بڑی مضبوط اور محکم ہے۔ یہاں تک کہ اس میں جو موسیقی بج رہی ہے اس کے ذریعہ بھی قوت کا احساس پیدا کرنے کے لئے اسے ایک ہزار لاؤڈ سپیکر نشر کر رہے ہیں۔ اس کا نام ہے "ترانۂ فولادی۔" مسافر سے مشورہ لیتے تو وہ اس موسیقی کا نام غوغائے آہن رکھتا اور گانے کے لیے یہ شعر تجویز کرتا۔ غوغائے کارخانۂ آہن گری زمن۔ گلبانگ ارغنونِ کلیسا ازان تو۔

متحرک فٹ پاتھ اب مسافر کو وہاں لے آیا ہے جہاں سربلند سرخ فولادی درانتی جیسے پویلین کے برعکس ایک سرنگوں ماہی پشت پویلین رضائی اوڑھے پڑا ہے۔ اس پویلین کی وسیع چھت دیکھنے میں یوں لگتی ہے جیسے نگندے ڈالنے والوں نے گلکاری کی ہو۔ یہ چھت شیشہ کے کپڑے سے بنی ہے اور اس کی دوہری تہ میں روئی کی جگہ ہوا

بھری ہے۔ اس چھت کے نیچے طرح طرح کی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ سوائے ایک چیز کے باقی سب کا تعلق اس زمین سے ہے۔ وہ شے جو آسمان سے آئی ہے ایک چھوٹا سا پتھر ہے۔ گہرا ابھورا، کھردرا، سنگلاخ۔ یہ چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس ذرا سے پتھر کو حاصل کرنے کے لئے انسان نے ہزاروں سال صرف کئے ہیں۔ سنگ آمد و سخت آمد۔

چاند مسافر کو بہت بھاتا ہے۔ اب تو اس کے ساتھ تعلقات استوار کئے

ہوئے بہت مدت ہو چکی ہے۔ وہ دن گئے جب دونوں ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے تھے۔ نصابی تعلیم کے دوران مسافر کی ساری توجہ کتابوں، مباحثوں، کھیلوں اور تحریکوں پر لگی ہوئی تھی۔ سر کھجانے کی مہلت نہ تھی، سر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھنے کی فرصت کہاں سے ملتی۔ بارے یونیورسٹی کے سالِ آخر کا امتحان ختم ہوا۔ گرمی کی چھٹیاں اور آم کا موسم آگیا۔ نتیجہ کا انتظار شروع ہو گیا۔ سارے ہوسٹل سونے ہو گئے۔ عملہ چھٹ گیا، دکانیں بند ہو گئیں، گھروں پر تالے پڑ گئے۔ طلبا جاتے ہوئے ساری رونق اپنے ہمراہ لے گئے۔ یونیورسٹی کے علاقہ پر ایک وسیع خاموشی اور کشادہ تنہائی کا قبضہ ہو گیا۔ چار دوست جو عملی زندگی میں داخل ہونے کا انتظار کر رہے تھے انہیں یہ ماحول مستقبل کے منصوبے بنانے کے لئے بڑا سازگار آیا۔ وہ شام کو دیر تک باغ کی سیر کرتے جس کی دھول سے اٹی روشیں، بے رونق کیاریاں اور مرجھائی ہوئی گھاس انہیں اپنی جوانی کے طفیل اور فراغت کے صدقہ بے حد حسین تفریح گاہ نظر آتی۔ ان چار میں سے ایک کی کیفیت باقی تین سے مختلف تھی۔ جب اس نے ایک چاندنی شب باغ میں دوسرے دوستوں سے کہا دیکھو چاند کتنا خوبصورت لگ رہا ہے تو ایک نے جل کر جواب دیا۔ مجاز پاگل تھا اس لئے یہ "پیلا مہتاب" اسے "مفلس کی جوانی"، "بیوہ کا شباب" اور "بنئے کی کتاب" نظر آیا اگر وہ نواب ڈھاکہ کے گھرانے کا فرد ہوتا اور امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی برٹش سسٹم

شپ نیویگیشن کمپنی اسے ہزار روپیہ کی نوکری کا پروانہ بھیج دیتی اور وہ ایک معروف مزاح نگار استاد کی منجھلی لڑکی کے لئے پیغام دے کر اس باغ کی سیر کو آتا تو چاند اسے بھی خوبصورت لگتا۔

مسافر نے سوچا یہ دونوں نوک جھوک میں مصروف ہیں میں خود یہ فیصلہ کیوں نہ کر دوں کہ چاند کیسا لگتا ہے۔ اس نے ایک ایک کر کے اچکن کے ساتوں بٹن کھولے۔ ہر دو تعلیمی سالوں کے بدلے ایک بٹن کی بندش سے چھٹکارا ملا تھا۔ پھر کمر سے حلقہ جدا کیا۔ یہ اختیار ایم۔ اے کے دو سالوں کے عوض حاصل ہوا تھا۔ اچکن اتار کر اس کا تکیہ بنایا اور فوارے کی ٹھنڈی منڈیر پر لیٹ گیا۔ طالب علمی کی بندا بندی سے یوں آزاد ہو کر اس نے آسمان پر فیصلہ کن نظر ڈالی۔ وہاں چودھویں کا چاند ایک روشن ہالے میں تیر رہا تھا۔ مسافر اس کی آب و تاب دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کچھ دیر حیرت سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد نظریں آسمان سے زمین کی طرف لوٹیں اور مسافر نے دیکھا کہ چاند اس کے سرہانے حوض میں تیر رہا ہے۔ اس شب کے بعد چاند کبھی مسافر سے جدا نہیں ہوا۔ وہ ملکوں ملکوں قریہ قریہ ہر سفر میں اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ مسافر کے ساتھ سوچوں میں ڈوبتا تجربوں میں جلتا اور امیدوں میں دمکتا ہے۔ ہر نئی جگہ وہ نئے روپ میں نظر آتا ہے اور ہر پرانی جگہ بار بار نیا بہروپ بدل لیتا ہے۔ مشرق میں پیتل کا تھال، مشرق بعید میں سرمنڈا بھکشو، مشرق وسطےٰ میں پہلے چاہِ نخشب سے اور اب چاہِ نفت سے ابھرنے والا، مغرب میں محض ایک نئی نو آبادی، صحرا میں نخلستان، بحرالکاہل میں جزیرہ، حافظیہ میں لبریز جامِ سعدیہ میں دستارِ فضیلت، شہرِ شکسپیئر میں تھیٹر ہال میں لٹکی ہوئی ایک روشنی، فلسطین میں ایک داخلی سمندر ایسا ہے جس کے بھاری پانی میں آدمی کا جسم نہیں ڈوبتا لیکن چاند اس میں آج کل ڈوبا ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان میں مسافر نے پہلی بار چاند کو بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا تو وہ ایک معصوم بچہ نظر آیا۔ دوسری بار دیکھا تو بادل گھیرے اور سیاہ ہو چکے تھے اور اسے نکلنے کا موقع بہت

کم ملتا تھا۔ تیسری بار ڈھاکہ کے ہوائی اڈہ پر اس وقت دیکھا جب مشرقی اور مغربی پاکستان کا رابطہ منقطع ہونے میں چند گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ آسمان پر چاند دونیم نظر آیا۔

چاند سے مسافر کے کچھ محرمانہ تعلقات بھی ہیں۔ وہ چمکتا سب پر ہے مگر مخاطب کسی کسی سے ہوتا ہے۔ وہ رازو نیاز میں مسافر کا راز دار ہے اور اس کی اجازت سے صرف ایک راز سے پردہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ جب لکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو مسافر نے قلم تراشا اور دوات بنائی مگر ایک حرف لکھے بغیر انہیں واپس رکھ دیا۔ بارہا ایسا ہوا۔ دل کی دل میں رہی اور ورق سادہ کا سادہ رہا۔ ایک مدت گذر گئی۔ یہاں تک کہ ایک روز پھر ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیاہی کی سطح پر چاند تیر رہا ہے۔ مسافر نے قلم اس روشنائی میں ڈبویا اور لکھنا شروع کر دیا۔ چاند نے چپکے سے کہا اب تمہیں سادہ کاری کی اجازت ہے۔

ادسا کا کی نمائش میں چاند کا ٹکڑا رکھا ہوا ہے۔ یہ ایک بدوضع اور بدرنگ پتھر ہے۔ اس پتھر کو مسافر کے اس چاند سے کوئی نسبت نہیں جو زندگی میں چاندنی بھر دیتا ہے۔ اس نمائش میں ایک سورج بھی ہے اور اس کو مسافر کے اس سورج سے کوئی نسبت نہیں جو چاند سے کہیں زیادہ حسین ہے مگر ایک خاص وقت کے ایک خاص لمحہ کے لئے۔ ایکسپو نمائش کا سورج لوہے کا بڑا سا دائرہ ہے جس کے گرد چھوٹی بڑی شعاعیں مکڑی کے ادھورے جالے کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ دائرہ کے اندر ایک صورت بنی ہے۔ بڑی بدصورت اور بھیانک، بالکل بھتنوں جیسی۔ ممکن ہے یہ بات بے ادبی کی ہو کیوں کہ میزبانوں کے نزدیک سورج ایک دیوتا ہے۔ مسافر مصر ہے کہ بے ادبی صورت گر دل نے کی ہے۔ مسافر اپنے سورج کو یاد کرنے سے پہلے ایک تعارف کو یاد کرتا ہے۔ مغرب کے ایک ملک کی کھلی تماشہ گاہ میں ہزاروں نوجوان جمع ہیں۔ رات بھر ناچ گانے کا ایک مشہور طائفہ اپنا کمال دکھائیگا

مگر منتظمین اور فنکاروں میں جھگڑا ہو گیا۔ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ مگر وہ اٹھنے میں نہیں آتا۔
بہلاوے کے لئے امید افزا اعلانات ہوتے رہے۔ دکھاوے کے لئے گانے کے ریکارڈ بجتے رہے۔
بغیر پروگرام شروع کئے وقفہ کر دیا گیا سیٹیوں اور ٹماٹروں سے معاملہ ہاتھا پائی اور بوتلوں
تک پہنچا۔ دو چار بار باقاعدہ بلوہ ہوا مگر خود ہی فرو ہو گیا۔ تماشائی ناچنے گانے میں مصروف
ہو گئے۔ ہر گروہ مستقل مزاج تھا اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ فنکار انکار کرتے رہے، منتظمین اصرار کرتے رہے،
شائقین انتظار کرتے رہے۔ رات اسی میں گذر گئی۔ بالآخر ایک اعلان ہوا۔ خواتین و حضرات
طویل انتظار کی معافی چاہتے ہوئے اور اتنی دیر کی تلافی کرتے ہوئے ہمیں اس امر کی بڑی
خوشی ہے کہ بالآخر آپ ذرا سی دیر میں دنیا کا عظیم ترین تماشہ دیکھنے والے ہیں۔ نہ اس کا
بدل نہ اس کا مقابل۔ لاثانی تماشہ لافانی لمحہ۔ یعنی طلوعِ آفتاب کا منظر۔

مسافر کی جیپ شہر سے چلی۔ شاہراہ نے ساتھ چھوڑا، گنجان محلے ختم ہوئے پھر
اکا دکا تنہا عمارتیں بھی پیچھے رہ گئیں۔ چند میل تک کاشتکاری نے ساتھ دیا پھر نہر کے موڑ کے
ساتھ وہ بھی منہ موڑ گئی۔ ٹیل کے راج بہے بے آب ہوئے اور کھیت پہلے بنجر جدید بنے پھر
بنجر قدیم۔ نصف گھنٹہ کے بعد ریگستان شروع ہو گیا۔ ریت کے ڈھیر اور ریت کے ٹیلے۔ کہیں
چھوٹے کہیں بڑے اور کہیں بہت بڑے۔ جیپ بڑے ٹیلوں سے بچ کر اور چھوٹوں کے درمیان
نشیب میں راستہ بناتی جا رہی ہے۔ کبھی بھولے سے کسی ٹیلہ پر چڑھ جاتی ہے تو صحرا بے کنار
لگتا ہے۔ اس صحرا میں نہ کھجور کا وہ درخت جو ریگزار کی ہر تصویر میں نظر آتا ہے نہ جھاڑی نہ
گھاس۔ ہوا چل رہی ہے اور ٹیلوں کی سطح کسی بیمار کھال کی طرح مسلسل اترتی چلی جاتی ہے۔
جہاں جا کر ہوا آہستہ ہو جاتی ہے اور ریت کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہتی وہاں کے ذرے
ہوا سے جدا ہو کر ٹیلوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ نئی تہ جمتی چلی جاتی ہے اور چھوٹے ٹیلے بڑے ہوتے

چلے جاتے ہیں۔ جب سے ریگزار کا یہ حصہ شروع ہوا ہے جیپ کا انجن چھوٹے چرخ دندانہ دار کے سہارے سارے زور اور پورے شور کے ساتھ چل رہا ہے۔ رفتار البتہ جوں کی چال سے ذرا آہستہ ہے۔ اب یہ ٹکڑا ختم ہونے کو ہے۔ ٹیلوں کے بعد میدان نظر آ رہا ہے اور ریت کے ساتھ کہیں کہیں مٹی بھی ملی ہوئی ہے۔ اکا دکا درخت بھی موجود ہے۔ دس بیس مویشی بھی آوارہ پھر رہے ہیں۔ دو چار گھر بھی بنے ہوئے ہیں۔ اس نشیب میں ٹیلوں سے بہہ کر اور ریت میں جذب ہونے سے بچ کر پانی کے چند قطرے جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ٹوبہ ہے۔ جیپ اس کے کنارے کھڑی کی، انجن کا سرپوش اٹھایا اور اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ مسافر نے گدلے پانی سے منہ پر چھینٹے مارے۔ منہ پر ریت اور مٹی کی تہ گارا بن گئی۔ بے شک آدمی کھنکھناتے ہوئے گارے سے بنا ہے۔

سفر پھر شروع ہوا۔ جیپ جھاڑیوں میں راستہ تلاش کر رہی ہے۔ کھار کی جھاڑیاں میلوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی وجہ سے جھٹکے زیادہ لگتے ہیں مگر جیپ کو تیز چلانا بھی ممکن ہو گیا ہے۔ دور تک اور دیر تک میدان ناہموار رہا۔ اب منظر بدل گیا ہے جیسے کسی نے لکیر کھینچ دی ہو۔ پھر صحرا شروع ہو گیا۔ ٹیلے بہت کم ہیں اور چھوٹے ہیں۔ گھنٹہ بھر سے منظر کی یکسانیت نے آنکھوں کو تھکا دیا ہے۔ منزل ابھی بہت دور ہے۔ افق پر ایک سایہ ابھرا۔ معلوم نہیں جنگل ہے کہ آندھی۔ یہ معاملہ تو بعد میں طے ہو گا پہلا سوال یہ ہے کہ سامنے جو زمین کا قطعہ ہے وہ کیوں داغدار نظر آ رہا ہے۔ جیپ پہلے داغ کے پاس پہنچی۔ یہ ایک ڈھکن اور گردن ہے۔ مٹکا زمین کے اندر ہے۔ جا بجا مٹکے دفن ہیں اور گردنوں پر ڈھکن لگے ہوئے ہیں۔ ان میں پانی جمع کرتے ہیں اور سردیوں میں کام میں لاتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ مٹکے آثار قدیمہ کا کام دیتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کبھی آدمی رہتے تھے۔ سایہ اب نزدیک آ گیا ہے

اور ایک بڑی سی بستی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس ویرانہ میں اتنی بڑی بستی؟ یقین نہیں آتا۔ چند گھنٹے شہری آسائشوں سے دور رہیں تو کئی باتوں سے یقین اٹھ جاتا ہے۔ بہرحال خوشی ہوئی کہ تھوڑا سا وقت اس لق و دق صحرا میں رہنے والوں کے ساتھ گذرے گا۔ ان کی صورت دیکھیں گے، ان سے صورت حال سنیں گے۔ زاد راہ میں چنے گڑ اور ستو کا اضافہ کرینگے۔ کوئی بیمار ملا تو اسے اسپرو کی گولیاں دے کر اس کے لئے حکیم اجمل خاں بن جائیں گے نمبردار سے پوچھیں گے کہ حدی چوکی رکھنی اب کتنی دور رہ گئی ہے۔ بستی میں داخل ہوئے تو خوشی حیرت میں بدل گئی۔ یہ بستی گاؤں کے طرز پر نہیں بلکہ قصبہ کی صورت بنی ہوئی ہے چھوٹا سا شہر ہے جس کے وسط میں کشادہ اگرچہ کچی مال روڈ ہے۔ دو رویہ دو منزلہ سہ منزلہ مکانات بنے ہوئے ہیں۔ مکانوں پر سفیدی اور رنگ کیا ہوا ہے۔ گلیاں صاف ستھری ہیں۔ دکانیں بہت سی ہیں۔ ہر مکان اور ہر دکان کا دروازہ بند ہے۔ بیشتر پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ بعض کنڈیوں میں لوہے کے تار کا پیچ پڑا ہے یا لکڑی کھونس رکھی ہے۔ سارا شہر سونا ہے ساری بستی سنسان۔ آدم نہ آدم زاد، بندہ نہ بندہ نواز۔ حد تو یہ ہے کہ بستیوں کے اجڑنے کی بد دعا دینے والی اور ان کی ویران گلیوں میں پھرنے کی خواہش کا ایک گیت میں اظہار کرنے والی صاحباں اور اس کا مرزا یار بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ یہاں آسیب کا سایہ ہے اور ہُو کا عالم۔ مسافر کی حیرت ہول میں بدل گئی۔ یہ رکن پور ہے۔ صحرائے چولستان کے وسط میں پانی اور آبادی اور دریا دوں سے بہت دور۔ سنا ہے سردیوں میں شہر آباد ہوتا ہے اور گرمیوں میں خانہ خالی را دیو می گیرد۔ شہر کے چوک میں کھڑا مسافر، اس منظر کا حصہ بن گیا ہے۔ کوئی ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ نہ صدائے بازگشت اور نہ مسافر کے قدموں کی چاپ۔ یہ ہے نام اللہ کا۔ ایک کمرہ ذرا سے دالان کی مسجد کا خشتی فرش اکھڑا ہوا ہے۔ اس پر ریت کی تہ جمی ہے اور کچھ سوکھے پتّے پڑے ہیں

لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ پتوں پر پیر رکھا تو چرمر کی آواز آئی۔ یہ آواز ساری خاموش بستی میں گونجی۔ جب سے رکن پور میں داخل ہوئے ہیں زندگی کے آثار صرف اس آواز سے پیدا ہوئے ہیں۔ زندگی یہاں موجود ہے۔ اگر آواز ہے تو حرکت بھی ہوگی۔ شاید کوئی کیڑا چلتا ہوا نظر آجائے جو اس خالی بستی کی رکھوالی کر رہا ہو۔ بہت ڈھونڈا مگر کوئی ذی حیات نظر نہ آیا۔ نہ کونے کھدروں میں کوئی مکوڑا نہ جالوں میں کوئی مکڑی۔ جب حرکت کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو قافلہ خود حرکت میں آگیا۔

ویرانی کا رنگ ایک ہوتا ہے مگر ویرانہ کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ چٹیل ویرانہ آگیا ہے جسے ڈاہر کہتے ہیں۔ جیپ نے ہرنوں کی ایک ڈار کو چونکا دیا ہے۔ جیپ کو ان کی طرف موڑا تو ڈار کلانچیں بھرتی تتر بتر ہوگئی۔ فرض شناس کالا ہرن ڈار کو بھاگنے کا موقع دے رہا ہے اور خود آہستہ بھاگ رہا ہے۔ تو نے دیکھا ہی نہیں صحرا میں آہو کا خرام۔ چلو آج دیکھ لیتے ہیں جیپ اس کے پیچھے ڈال دی۔ اس نے جست لگائی اور ہوا ہو گیا۔ میدان ہوائی اڈہ کی پٹی کی طرح سپاٹ اور سخت ہے۔ جیپ کو اس کی پوری رفتار سے بھگانا شروع کیا اور میل بھر مقابلہ کے بعد ہرن کو آن لیا۔ جیپ سے ہاتھ نکال کر اس کے سینگ چھو سکتے ہیں مگر اس کی آنکھیں دیکھی نہیں جاتیں۔ لگتا ہے خوف بھرے ڈھیلے ابھی خانوں سے نکل کر ریت پر گر پڑینگے اور جیپ کے پہیوں کے نیچے آجائیں گے۔ سبکتگین نے ترس کھایا اور جیپ آہستہ کرلی۔ ہرن دائیں کو مڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ڈاہر ختم ہوئی اور ریگزار پھر شروع ہوگیا۔ انجن زور لگا رہا ہے شور مچا رہا ہے مگر آگے بڑھنے کی رفتار سست سے سست تر ہوتی جارہی ہے۔

شام ہوئی تو چولستان کی مشرقی سرحد آگئی۔ یہ سرحدی محافظوں کی چوکی

رکھنی ہے۔ لہریا زمین ہے جس کی سطح پر بہت سی ریت اور تھوڑی بہت مٹی ہے۔ دو چار کنوئیں ہیں جن کے اندر بہت سی ریت اور تھوڑا بہت پانی ہے۔ سوکھی گھاس اور خشک سرکنڈوں کی بنی ہوئی چند جھونپڑیاں ہیں، چھوٹی اور گول اور نیچی۔ مرغیوں کے ڈاپے کی طرح اور اس سے ذرا سی بڑی۔ ان کو گوپھ کہتے ہیں۔ ایک گوپھ مسافر کو مل گئی۔ جھک کر اندر داخل ہوا اور چونکہ سیدھا کھڑا ہونے کی جگہ نہ ملی اس لئے وہ سفری تخت خواب پر لیٹ گیا۔ گرمیوں کے دن بھر کے صحرائی سفر کے بعد اس جھونپڑی کی ٹھنڈک نے بڑا مزہ دیا۔ یہ پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس کی آنکھ لگ گئی اور کب ہمراہیوں نے لکڑی کا تختہ گوپھ کے منہ پر رکھ کر اس کے آگے ایک پتھر لگا دی تاکہ رات میں کوئی جنگلی جانور اندر نہ گھس آئے آنکھ کھلی تو رات کا آخری پہر تھا۔ اس نے اٹھ کر تختہ ہٹایا یا شگاف سے ٹھنڈی اور نکھری ہوا کا جھونکا آیا۔ اس جھونپڑی کے چاروں طرف سینکڑوں مربع میل تک کوئی چیز ہوا کو باسی اور آلودہ کرنے والی نہیں۔ سانس لیا تو نس نس میں تازگی دوڑ گئی۔ مسافر بستر پر لیٹا ہے اس کے پاؤں اس چھوٹی کھڑکی جتنے شگاف کی طرف ہیں جس سے گوپھ میں اندر داخل ہوتے ہیں۔ اس نے تکیہ دوہرا کیا اور لیٹے لیٹے شگاف سے باہر دیکھنے لگا۔ اندھیرا ہے مگر شفاف اور دھلا ہوا۔ کوئی اسے دھوئے جا رہا ہے اور وہ اجلا ہوتا جا رہا ہے۔ افق پر اجالے کی ایک لکیر نمودار ہوئی اور اس نے زمین اور آسمان کو جو تاریکی میں یکجا تھے جدا کر دیا۔ یہ لکیر اب اجالے کی قوس بن گئی ہے اور آسمان کے باقی اندھیرے حصے سے بالکل علیحدہ نظر آتی ہے یہ قوس تیزی سے روشن ہونے لگی اور اس کا عکس دور دور تک اندھیرے کو کم کرنے لگا۔ یکایک سورج نے اس قوس کے اندر افق کی منڈیر سے شریر بچے کی طرح پیشانی اور آنکھیں اوپر کر کے یہ دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ لوگوں کو محوِ خواب پایا تو فوراً منڈیر پر چڑھ گیا۔ مسافر

نے ایسا سورج پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ سوا نیزے والا جلالی بابا نہیں کہ اس سے آنکھیں بھی چار نہ کر سکیں۔ یہ شہر میں عمارتوں کے پیچھے سے بلند ہونے والا قرص آفتاب بھی نہیں جو صرف اسی وقت تک اچھا لگتا ہے جب تک اوٹ میں ہو۔ یہ سورج انڈہ کی زردی کی طرح کچا اور نارس ہے۔ یہ نام کا سورج ہے اگرچہ چاند کی سی سورت ہے اور اس سے کئی گنا بڑا اور کئی گنا خوبصورت۔ مسافر نے تکیہ ذرا اور اونچا کیا۔ دونوں ایڑیاں ملا کر اور پاؤں کھول کر فارسی کا اوپر کھلنے والا سات کا ہندسہ بنایا۔ نظریں اس ہندسہ کے کھلے منہ سے گذر کر گوچھ کے شگاف سے باہر نکلتی ہیں اور میلوں دور سپاٹ ویرانہ کے افق تک پہنچ جاتی ہیں۔ پگھلتے سونے کا کچا سورج لحہ بہ لحہ بلند ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سات کے ہندسہ کی دونوں دیواروں کے درمیان آ کر رک گیا۔ پھر وہ یکدم افق سے ٹوٹ کر گوچھ کے شگاف تک آیا اور بڑھ کر مسافر کے قدم چوم لئے۔ سورج نے چپکے سے کہا" اب تمہیں سفر کی اجازت ہے۔ اس کے بعد دونوں اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے" سورج آسمان کی جانب اور مسافر جاپان کی طرف۔

مسافر اوکاسا کی ایکسپو نمائش میں رواں روش پر دیر سے کھڑا ہے" نہ اسے یہ پرواہ کہ راستہ کہاں سے آیا ہے نہ یہ فکر کہ وہ کہاں لے جائے گا۔ اس تماشہ گاہ میں راستہ کی کوئی اہمیت نہیں۔ راستہ صرف وہ ہے جو صدر دروازہ تک لے کر آتا ہے۔ اندر داخل ہونے کے بعد سارے راستے محض بہانے ہیں جو کسی نہ کسی تماشے تک لے جاتے ہیں۔ اس وقت نظروں کے سامنے برٹش کولمبیا کا پویلین ہے۔ اس ریاست کے گھنے جنگلوں میں اگنے والے بڑے گھیر کے آٹھ دس درختوں کے تنے کاٹ کر ایک قد آدم قطار میں گاڑ دیئے ہیں۔ اس کے پیچھے صف بصف اسی جسامت کے تنے نصب ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہر صف کی بلندی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخری قطار میں جو تنے ہیں وہ کم و بیش ڈیڑھ سو فٹ

اونچے ہیں۔ چھوٹے سے درخت جتنی اونچی صف کے بعد بلند سے بلند تر درختوں کی درجہ بندی بالآخر بلند ترین درختوں کی قطار پر ختم ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے نوزائیدہ بچوں کی قطار سے لے کر سو برس کے بوڑھوں کی قطار کے درمیان صف بصف ہر سالگرہ کے ساتھی کھڑے ہوں۔ درختوں کی صف بندی اس مہارت سے کی ہے کہ ان کے نیچے چھپا ہوا میوزیم ہال نظر نہیں آتا۔ اس ہال کی چھت ایک طرف تماشائیوں کے سروں سے چھوتی ہے اور دوسری طرف آخری صف کے درختوں کی طرح بے حد بلند ہو جاتی ہے۔ اس بلند چھت کے ساتھ ایک چھوٹا سا پردہ ہے جس پر دستاویزی فلم دکھائی جاتی ہے۔ دیکھنے والے زرافہ کی طرح گردن بڑھا کر اور منہ اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ پہلے ریاست کا تعارف ہوتا ہے۔ کینیڈا کی ریاست۔ دس ہزار فٹ سے بلند دو سو چوٹیاں۔ دس مربع میل سے بڑی ایک سو جھیلیں۔ اخباری کاغذ کا سب سے بڑا کارخانہ۔ کارخانہ کی سالانہ پیداوار خط استوا کے گرد نو بار لپیٹی جا سکتی ہے۔ اس کے باشندوں کا تعارف ہوتا ہے۔ خوش حال اور خوش باش۔ ماحول سے مانوس، قانون طبیعی سے ہم آہنگ۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں بہت خوش۔ فلم میں ایک بچہ چھڑی سے پہیہ چلاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگتا ہے۔ ڈھلوان آ جاتی ہے۔ پہیہ تیزی سے نچان کی طرف لڑھکتا ہے۔ جب وہ تیز رفتار پہیہ چھت کے ساتھ لگے ہوئے پردہ کی نچلی حد سے باہر نکلنے لگتا ہے تو اس پردہ کے نیچے یکایک ایک اور پردہ نمودار ہو جاتا ہے۔ پہیہ لڑھکتا ہوا دوسرے پردہ کے زیریں کنارے تک پہنچتا ہے تو تیسرا پردہ کھل جاتا ہے۔ غرض پہیہ لڑھکتا جاتا ہے اور پردہ لپٹے ہوئے قالین کی طرح کھلتا جاتا ہے۔ ذرا سی دیر میں چھت سے لے کر زمین تک کوئی سو فٹ کی ایک روشن ڈھلان بن گئی۔ پہیہ تصویر میں زمین تک پہنچتا ہے تو ہال میں روشنی ہو جاتی ہے۔ فرش پر سچ مچ کا ایک پہیہ رکھا ہوا ہے جیسے وہ

دستاویزی فلم کے پرت پرت کھلنے والے پردہ سے نکل کر وہاں آن گرا ہو۔

اس عالمی نمائش میں کئی پویلین ایسے ہیں جہاں نت نئی تجرباتی فلمیں دکھائی جارہی ہیں۔ روشں ایک ایسے پویلین کے سامنے سے گذر رہی ہے جہاں تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ آزمائشی عکاسی کا تماشہ ہو رہا۔ ان کا دعوے ہے کہ ہم دور کو قریب کم کو بہت اور تنگ کو کھلا کرنے والی عکاسی کا ایسا کمال دکھاتے ہیں کہ جانی پہچانی چیزیں تو اب وخیال بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس پویلین کی بلند و بالا عمارت کی شکل لالٹین کی چمنی جیسی ہے۔ تماشائی اس کے بیچوں بیچ کھڑے ہو جاتے۔ فلم کی تصویریں عمارت کے اندر ساری سطح پر چھا جاتی ہیں۔ گول اور گاؤدم، نیچے سے اوپر تک، ہر طرف اور چہار سو۔ فلم میں ایک منظر جنگل کا ہے۔ تماشائی چاروں طرف سے گھنے درختوں میں گھر جاتے ہیں۔ درختوں کی جڑیں چمنی کے پیندے میں پیوست ہیں۔ تنے عمارت کی دیوار کو سہارا دیتے ہوئے اتنے بلند ہو جاتے ہیں کہ شاخوں سے پرے آسمان نظر آرہا ہے۔ تماشائی کی انا اس گھنے جنگل میں گم ہو جاتی ہے۔ منظر آہستہ آہستہ بدل رہا ہے۔ جنگل کے وسیع منظر کی جگہ اب اس کا صرف ایک حصہ دکھایا جارہا ہے۔ یہ جزو اتنی جگہ گھیرے ہوئے ہے جہاں ابھی کل کی تصویر دکھائی جارہی تھی۔ لہٰذا ہر شے کی جسامت بڑھتی جارہی ہے۔ جنگل کا جو حصہ دکھایا جارہا ہے وہ نصف ہو گیا ہے۔ اور اب چوتھائی رہ گیا ہے۔ منظر سکڑتا جارہا ہے، چیزیں پھیلتی جارہی ہیں۔ تصویر کا محیط برقرار اور بدستور ہے۔ جنگل کے بعد چند درخت اور ان کے بعد صرف ایک درخت۔ تنہا درخت کے بعد اس کے نیچے اگا ہوا ایک پودا۔ پھر اس پودے کی ایک شاخ اور بالآخر اس شاخ پر کھلا ہوا ایک پھول۔ یہ پھول پیندے کی فراخی سے لیکر چمنی کی بلندیوں تک ہر سو کھلا ہوا ہے۔ سینکڑوں تماشائیوں کا ہجوم اس کھلے ہوئے پھول کی تہ دار گہرائیوں کے اندر

ایک پنکھڑی پر شبنم کی طرح دھرا ہے۔ اور صد ہا پھول ہر تماشائی کے دل میں کھلے ہوئے ہیں

ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا۔

تماشائیوں کا انبوہ ہے اور تماشوں کی فراوانی۔ دل کش اور نظر فریب تماشے

چار سو بکھرے ہوئے ہیں۔ طبیعت نظارگی سے سیر نہیں ہوتی اور نگاہ بکھرتی جا رہی ہے۔

سبک خیالی اور خیال اندیشی نے کیا کیا سامان فراہم کیے ہیں۔ مسافر اپنی جگہ کھڑا ہے اور تماشے

اپنے اپنے مقام پر استادہ۔ اس کے باوجود منظر ہے کہ لحظہ بہ لحظہ بدلتا جا رہا ہے۔ جادۂ جادۂ پیمائی

کر رہا ہے۔ ڈگر ڈگ بھرنے میں مصروف ہے۔ روشِ رخشِ عمر کی طرح رو میں

ہے۔ جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو۔

حد آخر بالآخر آگئی اور روش رک گئی۔ مسافر قدم بڑھا کر روش سے نیچے

اترا۔ سامنے ایک درخت ہے۔ قدم خود بخود اس درخت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ روشنیوں

کا درخت ہے۔ نظر بھر کر دیکھیں تو اس کی جڑیں دل میں اترنے لگتی ہیں۔ آخر روشنی کو

نور سے کچھ نسبت ہے۔ مسافر ایک بار بڑے شوق کے ساتھ دنیا کا سب سے بڑا فانوس دیکھنے

گیا جو ایک ملکہ نے ایک خلیفہ کو تحفے میں دیا تھا۔ خلافت کے چراغ کو گل ہوئے نصف صدی

سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا اس لیے وہ دلما باگچہ محل کا فانوس بجھا ہوا پایا۔ یہ درخت البتہ

روشن ہے اور اتنی روشنی مسافر نے آج تک نہیں دیکھی۔ چوڑا اور چورس تنہ چاندی کا لگتا

ہے۔ شاخوں کی آب و تاب بھی نقرئی ہے۔ ساری شاخیں سیدھی اور متوازی ہیں۔ سارے

پتے سیدھے اور عمودی ہیں لیکن جو ڈھیر سارے پتے نظر آ رہے ہیں وہ پتے نہیں قمقمے ہیں ان

کی روشنی زرد بلکہ زریں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تنے کے اوپر بڑا سا چھتا لگا ہوا ہے جس میں

روشنی شہد کی طرح بھری ہوئی ہے۔ یہ جگمگ کرتے قمقمے تاروں کی طرح ان گنت ہیں لیکن

اسس درخشاں درخت کو جھیل کے کنارے کاشت کرنے والوں نے ان کا شمار اور حساب رکھا ہوا ہے۔ شمار میں نصف اور حساب میں دوگنا۔ اصفہان میں جو شاہی عمارت چہل ستون کے نام سے مشہور ہے اس کے چوبی ستونوں کی تعداد چالیس کے بجائے صرف بیس ہے۔ پانی میں ان کا عکس نظارہ کو دوبالا اور تعداد کو دوچند کر دیتا ہے۔ یہی خوشنمائی کا صحیح معیار اور ان ستونوں کا صحیح حساب ہے۔ اس رعایت سے روشنیوں کے درخت کے چراغوں کی تعداد ستر ہزار ہے۔ نصف اس درخت کی شاخوں پر جگمگا رہے ہیں اور نصف اس جھیل کی لہروں پر جھلملا رہے ہیں۔ نور اس درخت سے شاخ در شاخ اور چراغ در چراغ پھوٹتا اور ایک ہالا بناتا ہے جو آسمان کو چھو کر واپس اس جھیل میں اترتا ہے اور اس کی تہ سے پینتیس ہزار موتی نکال کر لہروں کی سطح پر سجا دیتا ہے۔

مسافر روشنیوں کے درخت کے نیچے نور کے ہالے میں تیر رہا ہے۔ چار سو روشنی ہی روشنی ہے۔ اتنی روشنی کہ اسے اپنے سائے کا سراغ بھی نہیں ملتا۔ کل جب وہ قراقرم کے برف کدہ پر پرواز کر رہا تھا تو سایہ پیچھے رہ گیا تھا۔ آج جب راستہ خود ایک شجر نور تک لے آیا ہے تو سایہ یکسر غائب ہو گیا جیسے وہ ایک وجود نہیں محض ایک وہم تھا۔ مسافر سائے سے سبکبار ہے۔ اس کے دل میں صدہا پھول کھلے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں روشنیاں روشن ہیں۔ وہ سوچتا ہے، صراط مستقیم بھی ایک خود کار روش ہو گی جو نور کی منزل پر پہنچ کر رک جائے گی۔ اس راستہ کو پانے اور اس منزل تک پہنچنے سے پہلے قیام کیسا اور توقف کیونکر۔ حکم ہے سیروا فی الارض اور تعمیل ہے قدم بقدم روش بہ روش منزل بہ منزل۔

نہ بہ جادہ قرارش نہ بہ منزلے مقامش

دل من مسافر من کہ خدائش یار بادا

مسافر کا سفر جاری ہے۔ آج وہ ایک شاہراہِ بزرگ پر گامزن ہے۔ راہ کشادہ اور روشن ہے۔ بیشمار پیش رو آگے جا چکے ہیں اور بے حساب ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ کوئی عام روش ہوتی تو اب تک پامال ہو کر دھول دھول ہو جاتی۔ یہ ایک خاص راستہ ہے جو اتنے بہت سے لوگوں کے استعمال میں آنے کی وجہ سے ہموار اور صیقل ہو گیا ہے۔ اس راہ میں جابجا سفر کرنے والوں کے قدموں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ ان نشانات سے یکسر مختلف ہیں جو ایک ایوانِ شہرت میں گیلے سیمنٹ پر ننگے پاؤں کھڑے ہو کر بنائے جاتے ہیں اور سوکھنے کے بعد بالکل بے جان اور بڑے بے حیثیت نظر آتے ہیں۔ جیسے ان اہلِ نشان کی بے مقصد زندگیوں میں روشنی اور حرارت کا کوئی دخل نہ تھا، بس پیالہ و ساغر بن کر جیئے اور سنگ و خشت ہو کر مرے۔ اس کے برعکس یہ نشان واضح اور روشن ہیں۔ اتنے تازہ اور شوخ جیسے ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے۔ مسافر ان نشانات کو غور سے دیکھتا ہے۔ ہر نقشِ پا کسی سیاح کا نام یا کسی سفرنامہ کا عنوان بن جاتا ہے۔ مشہور سیاح، معروف ادیب، مقبول سفرنامے۔ ایک نشان اور نظر آیا۔ یہ اس شخص کا نقشِ قدم

ہے جس نے خود کوئی سفرنامہ نہیں لکھا مگر ایک طالب علم کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ذرا سی دیر کے لئے داخل ہوا اور اسے صرف یہ مصرع پڑھ کر ایک ہلچل سے آشنا کر گیا۔ سب مسافر ہیں بظاہر نظر آتے ہیں مقیم۔ مسافر جب کسی سفر پر روانہ ہوتا ہے اس شخص کی یاد زادِ سفر کے طور پر اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ لکھنے والے نے مضمون لکھا اور اس یاد کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ عنوان ہے، زادِ سفر۔

۱۹۷۹-۸۰ء

زادِ سفر

آزادی سے پہلے مسلم ہند کے نشیب میں ایک دریا بہتا تھا جسے مسلم یونیورسٹی کہتے تھے۔ جونہی مانسون ختم ہوتی داخلہ کا موسم شروع ہو جاتا اور اس دریا میں طغیانی آجاتی۔ ہر طرف سے برساتی ندی نالے آکر اس میں گرنے لگتے۔ کچھ گہرے اکثر پایاب، کچھ سرکش اکثر نرم رو۔ آس پاس کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر بعض دور دراز بلکہ سمندر پار سے بھی بہہ کر آجاتے۔ چند ایسی مٹی سے اٹی راہوں سے ہو کر آتے کہ پانی ذرا گدلا ہوتا اور چند اتنے شفاف کہ نظر پانی میں ڈوب جائے۔ دریا انہی پانیوں سے مل کر بنتا اور اسی ذخیرہ سے اٹھ کر لہریں ہنستے کھیلتے ایک دوسرے کو کہنی مار کر اس کی سطح پر جگہ لینے کی کوشش کرتی رہتیں۔

ایک روز الفقرہ میں زبیر علی لہروں کو گننے لگے۔ چھا جانے والے مقرر اور انہیں پچھاڑ دینے والے فقرہ باز۔ الکشن کے امیدوار اور ورکر۔ ایگزیکیوٹی کے زخم خوردہ اور ہنگامہ پرور۔ رائڈنگ اسکول کے شہسوار اور ہوا کے گھوڑے پر سوار پیادے۔ سان پر جملے تیز کرنے والے خوش گپ اور ان کا تختہ مشق بننے والے بور بلکہ مہا بور اور ریلنڈر بور۔ باقاعدگی سے ہر سال اول آنے والے کرم کتابی اور اسی باقاعدگی سے سال بہ سال امتحان سے دستبردار ہونے والے سینئر جن پر سینیارٹی کی گرد تہ بہ تہ چڑھتی چلی جاتی۔ کچھ نام اُن

گن بھرے لڑکوں کے جو صلاحیت رکھتے تھے اور کچھ نام ان گمان بھرے لڑکوں کے جو شخصیت جتاتے تھے۔ الغرض کتنے ہی نام انہوں نے دہرائے ہونگے مگر وہ چمک جو ان کی توقع کے مطابق ان ناموں کو سن کر ایک ہم عصر علیگ کی آنکھوں میں پیدا ہونی چاہیئے انہیں نظر نہ آئی۔ ان کا خیال تھا کہ ہر نام پر بارود کا فیتلہ آگ پکڑلے گا اور وہ بھک سے اُڑ جائے گی۔ مگر یہ سارے نام رنجک چاٹ گئے اور کوئی دھماکہ نہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ انہیں رنج پہنچا اور وہ شاکی ہوئے۔ ان کی خواہش تو یہ تھی کہ میں ہر ایک پر مضمون لکھوں۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی اور سمجھایا کہ یادوں کی لذت میں برابر کا شریک ہوں مگر ان میں سے کسی شخص کا مجھ پر کوئی قرض واجب الادا نہیں۔ یوں بھی علی گڑھ اپنے نامور طلبا کا قرضہ مع سود بار بار اتار چکا ہے۔ نہ جانے اس ادارہ کے بے نام مگر باکمال طلبا کا ادھار کون چکائے گا۔ لہروں کو چھوڑ دکہ ان کی اٹکھیلیاں تو سب کو دکھائی دیتی ہیں۔ آؤ دریا کی سطح سے بہت نیچے تہ سے لگی ہوئی موجوں کا ذکر کریں۔ مجھے تو اس لمحہ وہ موج یاد آرہی ہے جو میرے طویل قیام میں ذرا سی دیر کے لئے' بس ایک تعلیمی سال کے لئے' اٹھی تھی اور میں آج بھی اس کے بہاؤ کے ساتھ بہتا جا رہا ہوں۔ یہ آج مجھے انقرہ لائی ہے' کل قونیہ لے جائے گی۔ اور پرسوں خلیج مرمرہ کے کنارے۔ اس موج کو یاد کرتا ہوں تو آنکھوں کے ساتھ زندگی کا پورا ایک رخ روشن ہو جاتا ہے۔

ہر سال گرمیوں میں ڈاکیہ کے پھیرے بڑھ جاتے۔ وہ روز بہت سے خط ڈال جاتا اور یہ سارے خط والدین کی طرف سے اولاد کی اعلےٰ تعلیم کے سلسلہ میں مشورہ طلبی اور رہنمائی کی درخواست یا مسلم یونیورسٹی کے داخلہ کی باضابطہ درخواست کی صورت ہوا کرتے۔ والدین فکر مند ہوتے تو خط رجسٹری کرا دیتے' امیر ہوتے تو تار پر تار دیتے۔ لڑکا پڑھائی میں

اچھا ہوتا تو اس کا ذکر مقابلہ کے امتحان پر ختم ہوتا، اور کمزور ہوتا تو بار بار ناکام ہو جانے کی ذمہ داری ممتحن کے فرقہ پرست کاندھوں پر ڈال دی جاتی۔ اس موسمی خط و کتابت کے نتیجہ میں ہر سال داخلہ کے دنوں میں چند لڑکوں کو اسٹیشن سے ہوسٹل پہنچانے اور دو چار کو چند دن گھر پر ٹھہرانے کا کام ایک معمول بن چکا تھا۔ ان دنوں چار پانچ سو میل کا سفر ایک معرکہ ہوا کرتا تھا جسے ریل گاڑی پر سوار ہو کر کئی دنوں میں بڑے جتن سے سر کرتے۔ اس معرکہ میں گھمسان کا رن اس جنکشن پر پڑتا تھا جہاں ریل گاڑی بدلنی ہوتی۔ پہلی بار تنہا سفر کرنیوالے نوجوان کی خاطر جو اپنے قصباتی گھر میں سر شام مرغیوں کی طرح گن کر دڑبے میں بند کر دیا جاتا تھا فکر مند والدین جنکشن پر رہنے والے کسی نہ کسی فرد کو ڈھونڈ نکالتے اور بالواسطہ تعلقات کو کھینچ تان کر قریبی بنا لیتے اور ان کا واسطہ دے کر خواہاں ہوتے کہ برخوردار کو صحیح گاڑی پر سوار کرا دیں۔ برخوردار ہمیشہ بخیریت علیگڑھ پہنچ جاتا جہاں اس پارسل کو ہم وصول کر لیتے۔ اس سالانہ ڈرامہ کی ہمیں پوری مشق تھی۔ استقبال کرنے والا بروقت اسٹیشن پہنچتا، گاڑی ہمیشہ وقت پر آیا کرتی۔ تیسرے درجہ سے ایک نوجوان مسافر طے شدہ نشانی کے طور پر دائیں ہاتھ میں سرخ رومال لئے یا بائیں ہاتھ میں ناشتہ دان لئے نیچے اترتا۔ اس کے سامان میں ایک بڑا ٹرنک اور ایک پھولا ہوا بستر ہوتا جس میں ٹرنک سے بچ رہنے والے جوتے کپڑے بھی لپٹے ہوتے۔ مسافر کو اس کے سامان سمیت یکّہ پر سوار کرا کے گھر لے آتے۔ وہ تھکن اور شرم کے دور ہونے کے بعد پہلا تبصرہ یکّہ پر کیا کرتا۔ کیا بے تکی اور خطرناک سواری ہے، نہ چڑھنے کے لئے پائدان نہ بیٹھنے کے لئے کرسی۔ آدمی کو سامان کی طرح لاد دیتے ہیں اور سامان کو آدمی پر لاد دیتے ہیں۔ سواری چلتی ہے تو وہ جھٹکے کھانے پڑتے ہیں کہ عمر بھر یاد رہیں۔ ہر ایک نووارد نوجوان اس تجربہ کو بیان کرنے کے بعد عہد کرتا کہ علیگڑھ کے پورے قیام کے دوران اگر وہ

کبھی یکہ پر بیٹھا دیکھا گیا تو جو چور کی سزا وہ اس کی سزا۔ چند دن مردانہ صحن میں ان مہمانوں کی چارپائیاں لگتیں، فرش پر دسترخوان بچھتا، قاب سے ڈھکے برتنوں میں کھانا چنا جاتا۔ فارم کی تصدیق، فیس داخلہ کی رسید، ہوسٹل کی عرضی وغیرہ کے مراحل سے گذر کر وہ نوجوان ایک دن ہمارے گھر سے ہوسٹل کے کمرے میں منتقل ہو جاتا۔ پھر باوجود نیک ارادوں کے وہ صرف چھوٹی بڑی عید پر نظر آتا۔ چار چھ عیدیں گذرتیں تو وہ تعلیم مکمل کر کے خدا حافظ کہنے آجاتا۔ اس روز وہ جس مہارت سے یکہ پر سواری کرتا اس سے پتہ چلتا کہ اس کا یونیورسٹی میں قیام کتنے برس کا اور کتنا مفید تھا۔ خدا حافظ کہنے کے بعد کئی برس گذر جاتے کہ اچانک ایک خط موصول ہوتا جس میں قبلہ و کعبہ جناب پروفیسر صاحب مدظلہ، کی خیریت کا طالب ہونے کے بعد درج ہوتا کہ چھوٹے بھائی یا بڑے لڑکے کو بھیج رہا ہوں، یہ داخلہ کے سلسلہ میں اسی شفقت کا مستحق ہے جو آپ نے میرے ساتھ روا رکھی تھی۔ اس معمول میں ایک برس ایسا آیا کہ ہمارے یہاں تین لڑکوں کی سواری اتری۔ امرتسر سے شیخ سرشار، سری نگر سے پنڈت رینہ اور کسی نامعلوم مقام سے فضل الرحمان۔ آخر الذکر نے داخلہ کی خط و کتابت خود کی تھی، والدین کا صرف حوالہ دیا تھا۔ استقبال کی فرمائش کے بجائے لکھا تھا کہ اسٹیشن پر کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں میں خود گھر پہنچ جاؤنگا۔ جب وہ آئے تو یکہ کے بجائے ایک تانگہ پر سوار تھے۔ دوسرا تانگہ سامان سے لدا ہوا پیچھے پیچھے آیا، سامان میں دو بڑے منقش چوبی افریقائی صندوق بھی شامل تھے۔ یہ سال اول میں داخلہ لینے آئے تھے مگر جس عمر میں لڑکے فرسٹ ایر فول کہلاتے ہیں اس سے کم از کم دس برس بڑے تھے۔

فضل الرحمان کے رنگ ڈھنگ اتنے نرالے تھے کہ ابھی انہوں نے دم بھی نہ لیا تھا کہ ان سے کئی کہانیاں منسوب ہوگئیں۔ دانستہ غلط بیانی تو کسی نے نہ کی مگر کردار اور

اس کے حالات کو دلچسپ پایا اس لیئے اپنی اپنی رائے اور تجزیہ کو کہانی کا حصہ بنا کر پیش کر دیا
واقعات کو بسا اوقات تاریخ اور سوانح میں دفن کرنے سے پہلے زیب داستاں کے تابوت میں
اتنا محکم بند کیا جاتا ہے کہ لوگ آخری بار ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہی حال ان واقعات کا ہوا
جو فضل الرحمان کی زندگی میں علیگڑھ آنے سے پہلے گذرے تھے۔ ایک روایت کے مطابق
فضل الرحمان دسویں کا امتحان دے کر اس ڈر کے مارے گھر سے فرار ہو گئے کہ فیل ہو جائینگے
مگر پاس ہو گئے۔ دوسری روایت کے مطابق وہ بڑا لڑکا ہونے کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے
لئے تلاش معاش کی خاطر گھر سے نکلے تھے۔ تیسری روایت کے مطابق وہ گھر سے اس لئے چلے گئے
تھے کہ گھر والوں پر ایک فرد کا بوجھ کم ہو جائے۔ ساری روائیتوں میں اس بات پر اتفاق ہے
کہ پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے کوئی دس برس گذرے ہونگے کہ ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا گجرات
شہر کے شاہدولہ دروازے سے نکلا اور برا عظم ہند اور بحر ہند کو عبور کرنے کے بعد افریقی
جزیرے زنجبار میں سلطان کے محل کے دروازے پر جا نکلا۔ کشتیاں جلا کر آیا تھا اس لیے محنت
مشقت کے لئے تیار اور ہر تکلیف اٹھانے پر آمادہ۔ وہ خوش شکل اور ہنس مکھ تھا، مہم جو
اور چاک و چوبند تھا۔ محل کی حفاظتی پولیس میں بھرتی ہو گیا اور جلد ہی ترقی پا کر سارجنٹ
بن گیا۔ پہلے وردی ملی پھر پیٹی اور پستول۔ کچھ عرصہ بعد موٹر سائیکل بھی مل گئی۔ قرب سلطانی
کی وجہ سے تعلقات بڑھے، عزت بڑھی، تنخواہ اور انعام میں اضافہ ہوا۔ کلف دار وردی میں
ٹھاٹھ سے اکڑے رہنے کے باوجود خوش مزاجی اور پس انداز دونوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا
گرم مصالحہ کے اس جزیرے میں فضل الرحمان کو زندگی کا بڑا چٹپٹا تجربہ ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے
ایک دہائی گذر گئی۔

کامیاب زندگی کی بنیادیں بھر چکی تھیں اب عمارت اٹھانے کی دیر تھی

فضل الرحمان عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے تھے جہاں ہر ایک ان سے گھر بسانے کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ ایک خوشحال عہدہ دار سے ہمیشہ یہی توقع کی جاتی ہے۔ فضل الرحمان ایک عام آدمی ہونے کے باوجود ایک سودائی مزاج رکھتے تھے جو معمولات کا باغی تھا۔ ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ زندگی از سر نو بسر کرنی چاہیئے۔ کوئی نیا تجربہ کرنا چاہیئے۔ کوئی نیا خطرہ مول لینا چاہیئے۔ یہ سلطان آف زنجبار کے محل کی نوکری کی آرام دہ مگر بے کیف یکسانیت کہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے تا بہ کے۔ کیوں نہ ان بھری بنیادوں کو اکھیڑ ڈالیں۔ زندگی کا حق صرف اسی صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ اسے پرویزی محلات تعمیر کرنے کے بجائے فرہادی نہریں کھودنے میں صرف کیا جائے۔ انہوں نے طے کیا کہ پہلے چھٹی لی جائے اور اس مدت میں یہ سوچا جائے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ چھٹی کے لئے جب وہ حکومت کے قوانین کا مطالعہ کر رہے تھے تو ان کی نظر ایک شق پر جم کر رہ گئی جس کی رو سے ہر سرکاری ملازم کو دس برس کی ملازمت کے بعد تاحیات پنشن کا حق حاصل تھا۔ فضل الرحمان کے لئے پچیس چھبیس برس کی عمر میں پنشن یافتہ ہو جانے کا تجربہ بڑی کشش رکھتا تھا۔ حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ایک شلنگ چھ پنس برابر ایک روپیہ کی شرح سے کوئی ستر روپیہ ماہانہ ملیں گے۔ ان دنوں یہ رقم بہت بڑی نہ سہی خاصی معقول ضرور تھی۔ فضل الرحمان چھٹی لے کر افریقہ اور یورپ کی سیر پر روانہ ہو گئے۔ سمندر کے سفر کے دوران ان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آنے لگے انسان کب تک سمندر کے کنارے سیپیاں جمع کرنے میں مشغول رہے گا۔ یہ کائنات کیا ہے۔ اس زندگی کا مقصد کیا ہے۔ یہ دونوں کیوں ہیں۔ نوجوان سارجنٹ پر یہ خیال حاوی ہوتا جا رہا تھا کہ دنیا کی سیر کے ساتھ ساتھ فلسفہ کی دنیا کی سیر بھی کرنی چاہیئے لیکن اس کے لئے تو میٹرک سے چھوڑی ہوئی تعلیم کے سلسلہ کو دوبارہ جوڑنا ہوگا۔ ان کا جہاز نہر سویز میں داخل

ہوا اور دو چار دن بعد پورٹ سعید پہنچا۔ یہ اس اثنا میں اہرام مصر دیکھ آئے۔ دنیا مردہ اور فرسودہ لگی۔ لیکن جب جہاز پہلی یورپی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دنیا دوبارہ زندہ ہو گئی اور دلچسپ لگی۔ معلوم نہیں وہ بندرگاہ وینس تھی یا مارسیلز جہاں فضل الرحمان جہاز سے اتر گئے اور باقی سفر ریل سڑک اور فیری سے طے کیا۔ فضل الرحمان کی آنکھیں قدم قدم پر روشن ہوتی چلی گئیں۔ اب وہ دور تک دیکھنے لگے۔ اس ایک پرانی دنیا میں کتنی ہی دوسری نئی دنیائیں آباد ہیں۔ ہر ممکن ایک نئی دنیا ہے اور ہر موجود ایک پرانی دنیا۔ جس نے ان کو نہ دیکھا وہ نابینا، جس نے ان کو نہ سمجھا وہ نادان۔ سفر اور علم یہ دو حقیقتیں ہیں، لازم اور ملزوم، لازم ان کو اتفاقاً گھر سے بھاگنے کی بدولت میسر آیا، ملزوم کے لئے انہوں نے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ان کے اختیاری مضامین میں فلسفہ بھی شامل تھا۔

داخلہ کے دنوں کی گہما گہمی اس سال بہت زوروں پر تھی۔ فضل الرحمان کی وجہ سے ہمارے گھر میں رونق لگی ہوئی تھی۔ سرِ شام بہت سے لوگ جمع ہو جاتے۔ چھڑکاؤ کئے ہوئے کچے صحن میں کرسیوں اور چارپائیوں پر اتنی دیر تک محفل جمتی کہ رات کی رانی کی خوشبو فضل الرحمان کی خوش کلامیوں میں گھل جاتی۔ فضل الرحمٰن افریقہ کی ملازمت اور یورپ کی سیاحت سے واپس آئے تھے۔ ان کے راہ آورد میں ہر ایک کی دلچسپی کا سامان تھا۔ عمر ایسی کہ طلبا سے دس برس بڑے اور اساتذہ سے دس برس چھوٹے تھے۔ بیان ایسا میٹھا کہ چھوٹے اس کی چاشنی میں چپک کر رہ جائیں اور بڑے اس کی گرمی میں ہاتھ تاپنے لگیں۔ سفر کی داستان کا جال اس انداز سے پھینکتے کہ چھوٹی بڑی دونوں طرح کی مچھلیاں اس میں پھنس جاتیں۔ میں داستان سننے والوں میں سب سے کم عمر تھا۔ اس کا سب سے زیادہ اثر شاید مجھ پر ہوا۔

ہفتہ بھر گذرا ہوگا کہ میرے کانوں میں دخانی جہازوں کی سیٹیاں گونجنے لگیں۔ یوں لگتا تھا
جیسے میں نے زمیں دوز ریل، آب دوز کشتی، اور ہوا میں اڑنے مگر پانی پر اترنے والے مرغابی جہاز
میں سفر کیا ہو۔ علیگڑھ کی اچکن کبھی عربی جبہ لگتی کبھی فرنگی ٹیل کوٹ۔ خواب میں کالے
گورے لوگوں کے ہجوم دکھائی دینے لگے۔ میں نے فضل الرحمان سے فرمائش کر کے کئی
بار پیرس کی اس نمائش اور کانفرنس کا حال سنا جس میں شرکت کی شرط یہ تھی کہ عمر کم از کم تیس سن اور
قد زیادہ سے زیادہ چار فٹ چار انچ ہو۔ یہ بونوں کا عالمی میلہ تھا۔ فضل الرحمان جب اس میلہ
کا حال مزے لے لے کر سناتے تو سننے والے پہلے تو خاموشی سے سنتے رہتے اور بعد میں
جرح شروع کر دیتے۔ اس کانفرنس کا مقصد کیا تھا۔ جواب ملتا سوشیالوجی اور نفسیات
کے ماہرین کے لئے ایک موقع فراہم کرنا۔ سوال ہوتا کہ ایسی علمی کانفرنس میں میلے ٹھیلے والی
بات کہاں سے آ گئی۔ جواب ملتا، کانفرنس عالموں کے لئے تھی اور نمائش لوگوں کے
لئے۔ میلہ کا مقصد یہ تھا کہ بونوں میں زندگی کو معمول کے مطابق بسر کرنے کے عزم کو مضبوط
کیا جائے۔ پھر کوئی پوچھ لیتا کہ اس کے اخراجات کہاں سے آتے تھے، کیا حکومت
فرانس نے برداشت کئے تھے۔ جواب ملتا جی نہیں۔ حکومت نے نہیں دیئے۔ کچھ آمدنی ہم
آپ جیسے تماشبین لوگوں پر ٹکٹ لگانے سے ہو گئی اور باقی خرچہ ایک بے اولاد دولتمند
کی وصیت کے مطابق اس کی جائداد سے پورا ہوا۔ اس بات پر سب ہنس دیتے اور کوئی
بے یقین بول اٹھتا، فضل الرحمان کیوں گپ مار رہے ہو۔ سعدی نے سچ کہا تھا۔ جہاں دیدہ
بسیار گوید دروغ۔ فضل بھی ہنسی میں شریک ہو جاتے۔ کہتے میں تو آپ کا امتحان لے رہا تھا۔
یہ براعظم توہمات کے خط استوا پر واقع ہے یہاں ہر بعید از قیاس بات کو بلا چون و چرا مان
لیتے ہیں۔ یہ نہ ہوتا تو پیری فقیری اور اشتہاری ڈاکٹری اور نیم حکیمی کا یہ عالم کیسے ہوتا۔

میں خوش ہوں کہ آپ کیوں اور کیسے کا استعمال جانتے ہیں، یہی بات علیگڑھ کو دوسروں سے ممتاز رکھنے کے لئے کافی ہے۔ علیگڑھ والے اس تعریف کو خراج سمجھ کر وصول کرتے اس کا البتہ ملال رہتا کہ وہ بونوں کی کانفرنس کا دلچسپ واقعہ محض گپ بازی نکلا فضل الرحمان ذرا سی دیر کے لئے اندر جاتے۔ ایک افریقائی چوبی ٹرنک کھولتے اور چند تصویریں نکال کر سب کے سامنے پھیلا دیتے۔ یہ تصویریں بونوں کی عالمی کانفرنس کی تھیں۔ ان میں ایک بڑا گروپ فوٹو ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر حیرت اور بے یقینی بڑھ جاتی۔ ہر رنگ و نسل کے بونے اور ہر صورت و ساخت کے بونے، یہاں تک کہ ملے بونے اور ٹھگنے بونے اس میں قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ فضل الرحمن کو گپ باز کہنے والے خاموش ہو جاتے۔ فضل الرحمان کہتے، میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ میری ہر بات آنکھیں بند کر کے درست مان لیں۔ میں تو صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ جن باتوں کی طرف ہمارے دھیان کو جانے کی جرأت نہیں ہوتی وہ وہاں کا روزمرّہ ہیں۔ وہ بھی انسان اور ہم بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے آدمی۔ ہم نے اپنی محصور ذات پر بے حد اور بے جا پابندیاں لگا رکھی ہیں اور انہوں نے اپنی بے لگام ذات کو بالکل کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ہم نے سوچ کی تمام راہیں یہ بورڈ لگا کر بند کر دی ہیں کہ یہ شارع عام نہیں۔ وہ ان راہوں پر بگٹٹ دوڑے جا رہے ہیں۔ وہ بھی غلط ہم بھی غلط، مگر وہ باعمل ہونے کے باوجود غلط اور ہم بے عمل ہونے کے باعث بالکل غلط۔ ان سے اور کچھ لیں یا نہ لیں راہ عمل کا پتہ تو پوچھ لیں۔ آپ بھی جرات پیدا کیجئے، عقل اور دل دونوں کو تنہا چھوڑ دیجئے۔ یہ صورت حال کہ دل پر بے دلی کا پہرہ دار اور عقل پر بے شوری کا پاسبان بیٹھا ہے، آپ کو صرف اس لئے بھلی لگتی ہے کہ نہ اس میں کوہکنی کا پسینہ نہ جنوں کا لہو، نہ تخلیق کا درد بس خود فریبی کی افیون کی ترنگ، شعر کا سرور اور

مشاعرہ کی واہ واہ۔

سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فضل الرحمان کہتے، چھوڑیئے ان باتوں کو
میں آپ کو بتا رہا تھا کہ بونوں کے میلے میں ناچ گانے کے مقابلے بھی ہوتے۔ پہلا انعام
اس بونے کو ملا جو ناک سے پورے آرکسٹرا کی آوازیں نکالتا تھا۔ فضل الرحمان دو انگلیوں
کی مدد سے ناک کو ساز میں بدلنے کی کوشش میں لگ گئے۔ پھر یکایک یہ مشغلہ ادھورا چھوڑ
کر بولے، پنڈت رینہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، آپ کی ناک میں بائیں جانب خفیف سا جھکاؤ
کیوں ہے۔ ہاں یاد آیا آپ ہر صبح ایک ہاتھ سے لٹیا تھامے دوسرے ہاتھ سے منہ دھوتے
ہیں۔ اتنے برس مسلسل ایک ہاتھ سے ایک ہی طرف سے منہ دھونے کی وجہ سے تمہاری
ناک دوسری طرف جھک گئی ہے۔ کل سے بھگوان کے دیئے ہوئے دونوں ہاتھ استعمال
کرو، آدھا چہرہ ایک ہاتھ سے دھویا کرو اور آدھا دوسرے ہاتھ سے۔ دن میں چند بار ناک کی
نوک پر انگلی رکھ کر اسے دائیں طرف جھکایا کرو بس علیگڑھ سے رخصت ہونے تک ناک
سیدھی ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ علیگڑھ سے کیا چاہتے ہو تمہیں بھی سیدھا کر دے گا اور
تمہاری ناک کو بھی۔ سب پنڈت رینہ کی ناک کی طرف دیکھنے لگے۔ رینہ گھبرا گئے۔ فضل
کھلکھلا اٹھے۔ دراصل سنجیدگی اور بے ضرر غیر سنجیدگی کے درمیان وہ اتنی قلابازیاں لگاتے
تھے کہ جو شخص ان کی پینترہ بازی سے ناواقف ہو اسے پتہ ہی نہ چلتا کہ کب فضل الرحمان سر
کے بل کھڑے ہیں اور کب ناک کی سیدھ میں چل رہے ہیں۔

ایک شام گھر سے ملحق کھیت سے گیدڑ کی آواز آئی۔ کسی نے صفائی
پیش کرتے ہوئے کہا کہ سرسید بہت دوراندیش تھے، مسلم یونیورسٹی کے لئے غیر آباد علاقہ
اس لئے منتخب کیا تھا کہ جب یونیورسٹی پاؤں پھیلائے تو چادر کم نہ پڑ جائے۔ فضل الرحمان بولے

افریقہ میں تو کوئی شیر کی آواز پر کان نہیں دھرتا اور آپ ہیں کہ گیدڑ کی آواز سن کر فرفر تاریخ کا سبق سنانے لگتے ہیں۔ آپ کے یہاں جنگلی جانوروں اور انسانوں میں کوئی مفاہمت نہیں ہے۔ افریقہ میں دونوں ایک دوسرے کا حق تسلیم کرتے ہیں اور مزے میں رہتے ہیں۔ وہاں اکثر ایسا ہوا کہ درندے گھومتے پھرتے میرے گھر میں گھس آتے۔ برآمدے میں وہ پڑے رہتے اور کمرے میں میں سوتا رہتا۔ صبح اٹھ کر وہ جنگل چلے جاتے اور میں دفتر۔ کبھی کبھی جنگلی بلے کی خرخر سے رات کھوٹی ہو جاتی جیسے کل رات شیخ سرشار کے خراٹوں نے سونے نہیں دیا۔ یہ اگر تکیہ اونچا کر لیں تو ان کے خراٹوں کو باہر نکلنے میں دشواری ہو گی اور ہمسائے میں پروفیسر عنایت علی خاں کے گھر لوگ آرام سے سو سکیں گے۔ سرشار بحث میں الجھ گئے۔ وہ مُصر کہ میں خراٹے نہیں لیتا اور واقعہ بھی یہ تھا مگر فضل الرحمان کا اصرار کہ سونے والا اپنے خراٹوں کا گواہ کیسے بن سکتا ہے۔ شیخ سرشار کو فکر لاحق ہو گیا۔ فضل الرحمان نے بات بدلی۔ کہنے لگے تم نے گینڈے کے خراٹے نہیں سنے یوں لگتا ہے جیسے لوہار کی دکان پر بیٹھے ہوں۔ سب چوکنے ہو گئے کہ اب فضل الرحمان کوئی دور کی کوڑی لائیں گے۔ گینڈا کوئی ایسا موضوع نہ تھا کہ بال کی کھال کھینچنے میں دیر لگتی۔ سننے والوں اور سنانے والے میں اس بات پر تکرار ہو گئی کہ گینڈے کی کھال کیسی ہوتی ہے۔ فضل الرحمٰن کہنے لگے گینڈے کی کھال نہیں ہوتی وہ تو خول میں رہتا ہے۔ اچھا اگر آپ خول والی بات نہیں مانتے تو کم از کم یہ مان لیں کہ اس کی کھال لکڑی کی موٹی چھال کی طرح ہوتی ہے۔ سامعین کہنے لگے ہم ہاتھی کی کھال سے ذرا زیادہ موٹی اور کھردری کھال ماننے کو تیار ہیں مگر اتنے بدھو نہیں ہیں کہ تم گینڈے پر کبھی خول چڑھا دو کبھی چھال اگا دو اور ہم محض اس لئے مان جائیں کہ تم افریقہ ہو آئے ہو۔ فضل الرحمان کہنے لگے کہ جس جانور کی جلد سے چمڑا بنے وہ کھال جس سے لکڑی کی طرح دستکار چیزیں بنائیں وہ

چھال۔ گینڈے کی چھال سے ہاتھ میں لینے کی چھڑی بناتے ہیں۔ وہی لکڑی کا رنگ اور اور عام چھڑی کی موٹائی مگر پلاسٹک کی سی لچک ہوتی ہے۔ سامعین نے شور مچایا، پھر ہانک رہے ہو، پھر کھینچ رہے ہو، سعدی نے سچ کہا تھا، جہاندیدہ بسیار گوید دروغ۔ فضل الرحمان ہنسی میں شریک ہو گئے۔ پھر افریقائی مہاگنی کا ایک ٹرنک کھلا اس میں سے گینڈے کی کھال کی ایک چھڑی نکلی۔ یہ گویا جادو کی چھڑی تھی۔ عامل نے جس کسی کو اس چھڑی سے چھو دیا وہ معمول بن گیا۔ اس واقعہ کے بعد کئی دن تک کسی نے فضل الرحمٰن کو نہیں ٹوکا۔

میں پہلے دن سے فضل الرحمٰن کا طرفدار تھا۔ جب دوسرے بحث میں مار کھاتے اور معلومات میں بہت پیچھے رہ جاتے تو میرا سر اونچا ہو جاتا۔ فضل الرحمٰن سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے، مسعود میاں پڑھنے کے لئے تمہیں سب کہیں گے مگر سیر و سیاحت کے لئے کہنے والا شاید تمہیں میرے سوا کوئی نہیں ملے گا۔ سیر و سیاحت کے بغیر زندگی بسر کرنا نباتات کی مجبوری ہے مگر اشرف المخلوقات کا شیوہ نہیں۔ سفر اور علم دو حقیقتیں ہیں، لازم و ملزوم۔ اس کے بعد وہ اپنے سفر کی داستان شروع کر دیتے۔ ٹانگانیکا اور نیاسا لینڈ کے خوبصورت جنگلوں کا حال سناتے، پیرس اور وینس کے خوبصورت شہروں کا ذکر کرتے، نئے کارخانوں اور پرانی درسگاہوں کے گن گاتے۔ قوموں کی خوشحالی اور کالے گورے انسانوں کی خوبیاں بیان کرتے۔ میں آنکھیں بند کرتا اور کبھی صحرا میں ابوالہول کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور کبھی شانزے لیزے کے فٹ پاتھ پر بیٹھ جاتا۔

ایک دن ہم لوگ تانگہ میں بیٹھ کر رسل گنج گئے۔ فضل الرحمٰن نے گرم جلیبیاں خریدیں اور حلوائی کی دکان پر بیٹھ کر کھانی شروع کر دیں۔ پہلی جلیبی منہ میں ڈالی ہو گی کہ

تانگہ میں سے کسی نے کھنکھارنا شروع کیا۔ وہ اس اشارے کو گول کر گئے۔ سب نے شور مچایا
کہ یوں برسرِ عام کھانا علیگڑھ کی روایات کے خلاف ہے۔ یہ غیر مہذب اور جانگلو ہونے کی
نشانی ہے۔ بہتیرا سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے۔ کہنے لگے، اس وقت بھوک لگی ہے اس لئے کھا
رہا ہوں۔ کھانے کا تعلق بھوک سے ہے۔ بھوک کے اپنے اصول ہوتے ہیں
جو روایات بھوک کا خیال نہ رکھیں گی وہ مٹ جائیں گی۔ انصاف سے کام لو کچھ تقاضے
اور آداب اس مٹھائی کے بھی ہیں۔ اسے گرم گرم کھانا چاہیئے۔ بازار سے یونیورسٹی تک
پہنچتے ہوئے اس گرم جلیبی پر ایک سرد گھنٹہ گذر چکا ہوگا۔ اس کی لذت کم ہو جائے گی
آپ نہ بھوک کا لحاظ کرتے ہیں نہ لذت کا خیال رکھتے ہیں۔ پاس ہے تو صرف فرسودہ
روایات کا۔ یاد رکھیے جیت ہمیشہ گرم جلیبی کی ہوگی یعنی وہ بات جو عملی ہو اور وہ عمل جو
فطری ہو۔ اس کے سامنے نہ روایت ٹھہر سکے گی نہ ریاست۔ جہاں تک برسرِ عام کھانے کو
غیر مہذب سمجھنے کا تعلق ہے اگر آپ ایسی باتوں کو اہم سمجھ کر ان کی فکر میں گھلتے رہے تو وقت
آپ کو بہت پیچھے چھوڑ جائے گا۔ پیرس جو فیشن کے لئے سند ہے وہاں مہذب لوگ شاہراہوں
کے فٹ پاتھی ریستورانوں میں کیا مزے اور بے فکری سے کھاتے پیتے ہیں۔

فضل الرحمان سے بحث کرنے والوں نے زِچ ہو کر آخری حربہ استعمال کیا
طے پایا کہ ایک دن فضل الرحمان کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ کوئی ان کی بات
نہ سنے اور جب وہ بولنا چاہیں تو سب مل کر کورس گائیں، یورپ میں یہ ہوتا ہے افریقہ
میں وہ ہوتا ہے۔ فضل الرحمان نے منہ دھویا تو کورس، کپڑے پہنے تو کورس اور ناشتہ پر
بیٹھے تو کورس۔ اس کے بعد دن بھر جب بھی کورس گایا گیا فضل الرحمان اس میں خود شریک
ہو گئے۔ رات کی محفل برخاست ہونے کا وقت آگیا مگر فضل الرحمن نے یورپ اور

افریقہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ ان کی گفتگو گجرات اور شاہدولہ کے چوہوں سے آگے نہیں بڑھی سونے کا وقت آگیا سب اپنی اپنی مسہریاں درست کرنے لگے۔ کورس گانے والے اپنی کامیابی پر اداس تھے، کہنے لگے آج رونق نہیں لگی۔ فضل الرحمان نے یکایک قلابازی لگائی، بولے جہاں رات کو اتنے مچھر ہو نگے اور دن میں اتنی مکھیاں وہاں رونق نہ چہروں پر ہوگی اور نہ گفتگو میں۔ رونق کے لئے صحت شرط ہے اور صحت کے لئے حفظان صحت۔ آپ کورس شروع کریں۔ میں یورپ کی مثال لا رہا ہوں۔ یقین جانیے میری دلی خواہش یہ ہے کہ لوگ ہماری مثال دیا کریں مگر جب تک وہ دن نہیں آتا میں سچ بولنا کیوں چھوڑ دوں مغرب ہم سے زیادہ صحتمند، ہم سے زیادہ صفائی پسند بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم سے زیادہ حق پسند ہے۔ وہ زیادہ علم دوست، زیادہ انسان دوست بلکہ حد سے زیادہ حیوان دوست ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں وہاں کے لوگ محنت کرتے ہیں اور سوچ سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جب ان سے بہتر سوچ اور زیادہ محنت کرنے والے پیدا ہونگے تو مغرب خاموشی سے اس ریلے ریس کی ڈنڈی انہیں پکڑا دے گا اور خود تاریخ کا ایک حوالہ بن کر رہ جائے گا۔ لیکن اس وقت کے آنے تک آپ کو مغرب سے بہت کچھ سیکھنا ہوگا بلکہ چھیننا ہوگا۔ برا نہ منائیں اور غلط نہ سمجھیں تو یہ کہنے کی جرات کروں گا کہ مجھے کالی اچکنوں میں ملبوس علیگڑھ کے طلبا مستقبل کے معمار لگنے کے بجائے تاریخ کے گذرے ہوئے دور کا چلتا پھرتا حوالہ نظر آتے ہیں۔ چوغے، جبے، فرغل اور انگرکھے سے اچکن تک ذرا سا سفر آپ نے سو برس میں کیا ہے۔ اچکن میں آپ نہ امن کے دنوں میں ورزش کے دوران سر کے بل کھڑے ہو سکتے ہیں نہ جنگ کے میدان میں سر دھڑ کی بازی لگا سکتے ہیں۔ یہ نہ کارخانہ کے مزدور کا لباس ہے نہ کھیت میں کام کرنے والے کسان کے لئے کارآمد۔ آپ اس لباس میں دوڑ کر بس بھی

نہیں پکڑ سکتے زمانہ کو کیسے پکڑیں گے۔ یہ لباس دیدہ زیب اور پروقار ہے آپ اس میں بہت
اچھے لگتے ہیں مگر یہ پریکٹیکل نہیں۔ وہی گرم جلیبی والی بات ہے۔ اچکن بھی ایک دن ہار
جائے گی۔ وقت کیوں ضائع کرتے ہو، اچکن کے بٹن کھولو، تمہاری شرح صدر کے لیے
یہ بہت ضروری ہے۔ خفا ہو کر کسی نے کہا، اچکن کی مٹی پلید کر چکے اب کچھ ترکی ٹوپی کے
بارے میں بھی ارشاد ہو۔ فضل الرحمان کہنے لگے، یہ ترکی ٹوپی جس کا استعمال ترکی میں قانوناً ممنوع
ہے آپ لوگ ہر وقت سر پر کیوں دھرے رہتے ہیں۔ ذرا تیز چلنا چاہیں تو اس کی وجہ سے
چل نہ سکیں۔ ذرا ہوا چلے تو پھندنا بکھر جائے، بادِ مخالف چلے تو ٹوپی اڑ جائے۔ آپ یونیورسٹی
کے سوئمنگ باتھ میں ترکی ٹوپی کے ساتھ کیوں نہیں نہاتے۔ دنیا تو ایک سمندر ہے اس میں
ٹوپی پھندنے کے ساتھ نہانے پر کیوں مصر ہیں۔ یہ ترکی ٹوپی تو اچکن سے بہت پہلے اتر جائے
گی۔ اصل شے ٹوپی نہیں اس سے ڈھکا ہوا سر ہے جس میں فرد اور قوم کی ترقی کے لیے
علم اور سیاحت کا سودا ہونا چاہیے۔

ایک دن فضل الرحمان مجھ سے پوچھنے لگے تمہارا شوق اور مشغلہ کیا ہے
میں نے کہا بہت سے ہیں مثلاً آٹوگراف لینا اور ٹکٹ جمع کرنا۔ کہنے لگے اپنے جمع کیے ہوئے
ٹکٹ دکھاؤ۔ میں نے ذخیرہ ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ ایک چھوٹی سی البم تھی جس میں
تھوڑے سے ٹکٹ لگے ہوئے تھے، باقی ٹکٹ جوتے کے ڈبے میں بھرے ہوئے تھے۔ بہت
سے ٹکٹوں کے نیچے لفافہ کا کاغذ لگا ہوا تھا۔ فضل الرحمان نے پانی کا کھلے منہ والا پیالہ منگایا
اور چند ٹکٹ جن کے ساتھ کاغذ اتنی مضبوطی سے چپکا ہوا تھا کہ اتارو تو ٹکٹ پھٹ جائے اس
پیالہ کی سطح پر تیرنے کے لیے چھوڑ دیئے۔ غور سے ٹکٹ کو دیکھتے رہتے پھر تنکے کی مدد سے اٹھا
لیتے اور چھلکے کی طرح کاغذ اتار دیتے۔ کہنے لگے کہ احتیاط یہ کرنا چاہیئے کہ ٹکٹ کے کاغذ

تک نمی نہ پہنچے۔ نمی ان ٹکٹوں کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ کاغذ باریک ہوتا ہے اس لئے فوراً گل جاتا ہے۔ میرے پاس بھی کچھ ٹکٹ ہیں جنہیں نمی سے بچانے کی خاطر مومی کاغذ کی تہوں میں رکھ کر واٹر پروف بنڈل بنایا اور پھر اس پر ایسی دھات کا ہوا بند غلاف چڑھایا جس کو زنگ نہیں لگتا۔ یہ کام ماہرین اور مشینوں کی مدد سے ٹامس ڈی لارو کمپنی نے مکمل کیا تھا جو نوٹ اور ٹکٹ چھاپنے کے لئے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ بات ان سننے والوں کے لئے انوکھی تھی جو ٹکٹ کو البم میں لگانے کے علاوہ کسی اور طرح محفوظ رکھنے کے طریقہ سے ناواقف تھے چہ جائیکہ دھات کے ہوا بند ڈبے۔ سب نے بے یقین حیرت کا اظہار کیا۔ فضل الرحمان بولے ٹکٹ جمع کرنا مشغلہ بھی ہے اور سرمایہ کاری بھی۔ میں نے شغل کے طور پر سرمایہ کاری کا نیا تجربہ کیا ہے۔ جن دنوں زنجبار سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا ان دنوں وہاں کے سلطان نے اپنی تاج پوشی کی خوشی میں چار خصوصی ٹکٹ چھپوائے تھے۔ میں نے کل چھپنے والے ٹکٹوں میں سے ایک چوتھائی ٹکٹ یک مشت خرید لئے اور ٹکٹ چھاپنے والی برٹش کمپنی سے دو ڈبوں میں محفوظ کرا لئے۔ یہ خرید میرے لئے ایسی ہے، جیسے انشورنس پالیسی لے لی جائے۔ محتاط اندازہ یہ ہے کہ بیس برس کے بعد ان کی مالیت بیس گنا ہو جائے گی۔ اور اگر اتنی نہ بھی ہو تو کیا حرج ہے۔ یہ تجربہ خود کتنا بیش قیمت ہے کہ سونے چاندی اور زمین مکان کی حدود پھلانگ کر آدمی اس دنیا کا باشندہ ہو جائے جہاں پرانے ٹکٹوں اور پرانی تصویروں کی قدر و قیمت ان اشیائے سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ زنجباری ٹکٹوں کی قیمت کیا ہے۔ جواب صحیح یاد نہیں غالباً اس زمانہ کے دس پندرہ ہزار روپیہ بتاتے تھے۔ اس اطلاع کے ملنے کے بعد کسی نے دریافت کیا کہ وہ دونوں ڈبے کس ملک اور کس بنک میں محفوظ ہیں۔ فضل الرحمان اٹھ کر اندر

گئے مہاگنی کے دونوں افریقائی ٹرنک کھولے اور ان میں سے ایک ایک ڈبہ نکال لائے۔ دونوں ڈبے اٹھارہ انچ ضرب چوبیس انچ مستطیل اور تین انچ موٹے تھے۔ دھات کے خول کے اوپر کپڑے کا غلاف چڑھا ہوا تھا اور اس پر کمپنی کا سرٹیفکیٹ اور نمونے کے ٹکٹ لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک نے باری باری ان ڈبوں کو ہاتھ میں لے کر دیکھا، وزن اور قیمت کا اندازہ لگایا، ہاتھ سے دبا کر دھات کی آواز سنی اور خاموش حیرت سے انہیں فضل الرحمان کو واپس کر دیا۔ محفل پر خاموشی طاری تھی۔ فضل الرحمان کچھ کہنے سے بغیر انہیں ٹرنک میں بند کرنے چلے گئے۔ واپس آئے تو بولے، میں نہ کہتا تھا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ جب تک آپ ان جہانوں کے سفر پر نہ نکلیں گے آپ کا علم اور تجربہ نامکمل رہے گا۔

ہفتہ دس دن فضل الرحمان آتش بازی چھوڑتے رہے۔ سننے والے مانوس ہو چکے تھے۔ کبھی شوق سے سنا کبھی مذاق میں اڑا دیا۔ بہت زچ ہوتے تو دھمکی جاری کرتی ٹھہر جاؤ، تمہیں علیگڑھ ٹھیک کر دے گا۔ انٹروڈکشن نائٹ میں وہ گت بنے گی کہ چوکڑی بھول جاؤ گے۔ فضل الرحمان کے ہوسٹل چلے جانے اور شب تعارف کی واردات سے پہلے شب برات آگئی۔ وہ بچوں کی طرح مچل گئے۔ بازار میں فٹ پاتھ پر سجے خوانچوں اور ریڑھی پر لگے شبراتی سامان میں سے ڈھیر ساری چیزیں خریدنے کے بعد وہ اڑنے والی روشن قندیلوں اور دور مار راکٹوں کی تلاش میں آتش بازوں کے محلہ میں جا نکلے۔ کبھی چرخی فانوس مانگتے اور کبھی فانوس خیال پر تبادلہ خیال شروع کر دیتے۔ جب وہ بازار میں آتش بازی کا سامان خرید رہے تھے تو ان کی باتوں اور حرکتوں کی وجہ سے جمگھٹا لگ گیا۔ وہ دکانداروں میں مقابلہ کرا دیتے جس کا مچھر دیر تک پٹپٹاتے اور جس کا چکر دیر تک گھومے اس سے بہت

سا سامان خرید لیتے۔ کہتے تھے اس طرح مصنوعات کا معیار بلند ہوتا ہے۔ سامان کا ٹوکرا تانگہ کے پچھلے پائدان پر رکھا تو پیر رکھنے کی جگہ نہ بچی۔ شب برات آئی تو کوئی بوڑھا نہ بچا جس نے عمر رفتہ کو آواز نہ دی ہو۔ پٹاخے اور قہقہے' پھلجھڑیاں اور لطیفے' انار اور شوخیاں۔ جب آخری قندیل ہوا میں بلند ہوئی تو آتش بازی کا سامان ختم ہو گیا سب خوشی سے نڈھال تھے' رات بھی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ صبحدم دیکھا تو پنڈت رینہ کے بال ذرا سے جھلسے ہوئے تھے اور ایک بستر کی چادر میں مچھر بھر سوراخ ہو گیا تھا۔

مسلم یونیورسٹی کی دو روایات بڑی ہنگامہ پرور اور جو انکا نشانہ بنے اس کے لئے بڑی کٹھن ہوتی تھیں۔ ایک نئے طلبا کی انٹروڈکشن نائٹ اور دوسری الکشن ہارنے والے کا جنازہ۔ پہلی تقریب میں خامیوں پر اور دوسری میں ناکامیوں پر ہنسنا سکھایا جاتا۔ شب تعارف نئے اور ناواقف لڑکوں کی شامت آجاتی' جو بوکھلا جاتا وہ مارا جاتا۔ اس ہنگامہ کا مقصد یہ ہوتا کہ خود رو پودوں کی تراش خراش کرکے انہیں باغ کی زینت بنالیں۔ فضل الرحمٰن کو سمجھایا گیا کہ تمہاری عمر کا مذاق اڑایا جائیگا۔ سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کا طعنہ دیا جائے گا۔ پھر عمر اور علاقہ کی نسبت سے تمہیں پنجابی ڈھگے کا خطاب ملیگا تمہاری شان میں فی البدیہہ مزاحیہ سجع کہا جائے گا، ممکن ہے رباعی یا قطعہ بھی ہو جائے۔ نہ پھبتی کا برا ماننا نہ ریختی کا۔ تم سے فرمائشیں بھی کی جائیں گی۔ اگر بے سُرے ہو تو بار بار گانا سنانا ہوگا۔ سر کے پیچھے سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑنی ہوگی اور اپنے خلاف تقریر کرنی ہوگی۔ بس مسکراتے رہنا اور بحث میں نہ الجھنا۔ فضل الرحمان کی شب تعارف آئی۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا۔ آدھی رات لڑکوں نے ڈھول اور دروازہ پیٹا۔ اندر سے مندی آنکھوں اور شب خوابی کے لباس میں ہڑبڑا کر اٹھنے والے لڑکے کی جگہ فضل الرحمٰن برآمد

ہوئے۔ استری کیے ہوئے کپڑے، تازہ شیو کیا ہوا دمکتا کشمیری چہرہ، ہاتھ میں ایک کتاب
السلام علیکم، آپ لوگوں نے آنے میں بہت دیر کی۔ میں تو کب سے آپ کی راہ دیکھ رہا تھا
آپ سے کہیں زیادہ جلدی مجھے ہے۔ چاہتا ہوں کہ یہ رسم تعارف ختم ہو اور میں فوراً اپنی
تعلیم کی طرف توجہ کروں۔ آپ دیکھ رہے ہونگے کہ میں نے تعلیم مکمل کرنے میں کتنی دیر لگادی
ہے۔ اب ذرا سا وقت بھی ضائع ہو تو گراں گذرتا ہے۔ لیجئے اس سٹول پر میں کھڑا ہو جاتا
ہوں، یہ مسخروں کی ٹوپی اور گھنٹی مجھے دے دیجئے۔ میں خوشی خوشی ٹوپی پہن لیتا ہوں اور اپنے
سر پر اپنے ہاتھ سے گھنٹی بجا دیتا ہوں تو پچھلے سال کرسمس میں طرح طرح کی رنگ برنگ
ٹوپیاں دیکھی تھیں، ہر شخص کی مسخرہ ٹوپی دوسرے سے مختلف تھی۔ یہ آپ اتنے بہت سے
لڑکوں کے لیے صرف ایک ٹوپی لئے پھر رہے ہیں۔ خوش مذاقی اور جدت میں کسی سے
پیچھے رہ جانے کا کیا جواز ہے۔ اور یہ بات بھی بے جواز نظر آتی ہے کہ آپ ترکی ٹوپی کی
درگت بنا کر اسے مسخروں کی ٹوپی بنا دیں۔ جب تک یہ آپ کا سمبل ہے اس کی حفاظت
اور عزت آپ پر لازم ہے۔ ہنسی مذاق کے لیے فیلٹ ہیٹ سے کام لیں۔ اس طرح انگریز
کا رعب کم ہوگا اور آزادی کی تاریخ نزدیک تر آجائے گی۔ اچھا آپ شیرینی کے لئے چندہ
مانگتے ہیں، دوسروں سے آٹھ آنے اور مجھے عمر میں بڑا ہونے کا جرمانہ ایک روپیہ۔ جناب
میں نے طے کیا تھا کہ آپ میری جو قیمت لگائیں گے میں اس ارزاں قیمت پر فروخت
ہونے سے انکار کرتے ہوئے اس سے دگنی رقم پیش کروں گا۔ یہ لیجئے دو روپیہ۔ نام رکھنا
چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے رکھیں، صرف یہ یاد رہے کہ زندہ قومیں اپنی سرحدوں کے ساتھ
ساتھ اپنے مذاق کی حفاظت بھی کرتی ہیں۔ میں نے آپ کے اتنے نعرے اور شعر سنے
ہیں اگر جان کی امان پاؤں تو ایک مشورہ پیش کروں۔ یہ آپ کی رسم تعارف مجھے ایک

سفر کی مانند لگ رہی ہے۔ آپ ایک کمرے سے دوسرے کمرے اور ایک ہوسٹل سے دوسرے ہوسٹل تک سفر کر رہے ہیں۔ آپ کی مسافت بہت کم ہے۔ سفر کے فاصلہ کا دارومدار مسافر کے حوصلہ پر ہوتا ہے۔ ہمت کیجئے اور کمروں کے بجائے ملکوں کے سفر پر روانہ ہو جائیے نئے لڑکوں کے بجائے نئی قدروں سے تعارف حاصل کیجئے۔ جس مسافر کے سفر کا ہر لمحہ ایک نئی رسم تعارف کی طرح ہو اس کے لئے سفر ہمیشہ وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک لڑکے نے بے اختیار نعرہ لگایا' افلاطون کا بیٹا۔ ہجوم نے جواب دیا' ہائے ہائے دوسرا لڑکا بولا کشمیری سیب۔ باقی بولے' دو روپیہ سیر۔ اس کے بعد ہجوم شور مچاتا گھنٹی بجاتا آگے بڑھ گیا۔

سالوں میں تعلیمی سال سب سے کم عمر ہوتا ہے۔ اول تو یہ قمری سال سے بھی ڈھائی مہینے چھوٹا ہوتا ہے پھر ہفتہ وار اور تہوار کی چھٹیاں' بڑے دنوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی چھٹیاں۔ داخلہ اور امتحان کی مدت نکال دیں تو یہ سال سکڑ کر چار یا پانچ مہینہ کا رہ جاتا ہے اور کسی سال اس میں سے بھی کچھ وقت ہڑتال یا تالہ بندی کی نذر ہو جاتا ہے دیکھتے ہی دیکھتے ۳۹-۱۹۳۸ء کے تعلیمی سال کی آخری گھنٹی بج گئی۔ امتحانات شروع ہو گئے سال اول کا امتحان داخلی ہوتا ہے اور آخری پرچہ ختم ہونے سے پہلے دوسرے پرچوں کے نمبر ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ امتحان کو ہفتہ بھر نہیں گذرتا کہ نتیجہ مکمل ہو جاتا ہے۔ نتیجہ نکلا تو فضل الرحمن ہمارے گھر آئے۔ بہت فکر مند تھے۔ پوچھا پرچے کیسے ہوئے۔ کہنے لگے نتیجہ نکل آیا ہے اور میں ایک سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ سننے والوں نے کہا' فکر کی کوئی بات نہیں۔ اتنے برس پڑھنا لکھنا چھوڑا ہوا تھا ایک برس اور سہی۔ جہاں اتنی ہمت کی ہے تھوڑی سی اور سہی۔ فضل الرحمان بولے' میں جماعت میں اوّل آگیا ہوں۔ میری ذمہ داریوں

میں اضافہ ہوگیا ہے۔ سوچتا ہوں تھوڑی سی ہمت اور کروں اور تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے انگلستان کیوں نہ چلا جاؤں۔ فضل الرحمان نے پھر ایک بار لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ لوگوں نے اندیشہ ہائے دورو دراز کی فہرست بنائی۔ یہاں کے سالِ اول کے بعد وہاں یونیورسٹی میں نہیں بلکہ اسکول میں داخلہ ملے گا۔ داخلہ اتنا آسان نہیں ہوتا بلکہ نام سال دو سال انتظاری فہرست پر چڑھا رہتا ہے۔ وہاں تعلیم اور رہائش بہت گراں ہے۔ گھر والوں سے مشورہ کیا ہے یا پھر گھر سے بھاگنے کا ارادہ ہے۔ فضل الرحمان دھن کے پکے تھے۔ ہمیشہ انوکھی سوجھتی اور اسے پورا کرتے۔ ایک دن وہ انگلستان روانہ ہوگئے۔ جاتے ہوئے گینڈے کی چھڑی ابا جان کو دے گئے اور بجو کے بالوں والا شیو کا برش شیخ سرشار کے حصہ میں آیا۔ دونوں افریقائی مہاگنی کے منقش صندوق ہمارے گھر امانت رکھ گئے۔ ان میں زنجباری ٹکٹوں کے پیکیٹ بھی بند تھے۔ ٹکٹوں کی وجہ سے ان صندوقوں کی بڑی حفاظت کرنا پڑتی حالانکہ وہ چور کے لئے کسی کام کے نہ تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں یونیورسٹی سونی ہو جاتی اور چوری چکاری کی وارداتیں میں اضافہ ہو جاتا۔ ان دنوں ہمارا گھر ان صندوقوں کے لئے بڑا غیر محفوظ تھا۔ گھر والے بارِ امانت کے نیچے دبے جا رہے تھے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کمروں کے تالے دیکھے جاتے۔ گھر والے کہتے تھے جوں توں کر کے سال دو سال گذار لیں گے اور جونہی فضل الرحمان پہلی بار چھٹیوں میں یورپ سے واپس آئے تو ان کی امانت لوٹا دیں گے کہ ساتھ لے جائیں یا کہیں اور رکھ جائیں۔ غیب کی خبر کسے ہوتی ہے، سب اندازے لگاتے ہیں، اور یہ سال دو سال کا اندازہ بالکل غلط نکلا۔

فضل الرحمان انگلستان پہنچے۔ آکسفورڈ سے پہلا خط آیا، اپنی ابتدائی تعلیم کا منصوبہ درج تھا۔ دوسرا خط ملنے سے پہلے دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی، رابطہ کم ہوتا چلا

گیا اور پھر بالکل ٹوٹ گیا۔ ایک مدت گذر گئی اور یہ بھی پتہ نہ چلا کہ کہاں اور کس حال میں ہیں اور ہیں بھی کہ نہیں۔ سارجنٹ کی وردی میں ان کی ایک خوبصورت تصویر ہمارے یہاں رکھی ہوئی تھی۔ اکثر خیال آیا کہ وردی کی کشش اور مہم جوئی کا نشہ ان کو فوج میں لے گیا ہوگا اس صورت میں تین امکانات تھے، پہلا یہ کہ محاذ پر ہوں دوسرا یہ کہ جنگی قیدی بن گئے ہوں تیسری صورت پر کبھی گفتگو نہیں ہوئی۔ کبھی خیال آتا کہ وہ جنگ کی وجہ سے انگلستان میں تعلیم سے مایوس ہو کر واپس وطن آنے کی سوچ رہے ہوں گے۔ اگر وہ بحری جہاز پر سوار ہو گئے اور اسے راستہ میں جرمن آبدوز مل گئی تو کیا ہوگا۔ ممکن ہے فضل الرحمان نے حالات سے مجبور ہو کر سول ملازمت اور سول میرج کر لی ہو۔ یہ سب محض امکانات تھے لہٰذا اختلافات کا باعث۔ البتہ اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ اس کشت و خون میں تعلیم کا جاری رکھنا ناممکن ہوگا کیونکہ ان کی تعلیم کا پہلا حصہ محض جی سی ای کے معیار کا تھا اور جنگ کا پہلا حصہ قیامت کے معیار پر پورا اترتا تھا جنگ کے زور شور اور فضل الرحمان کی طویل خاموشی کی وجہ سے وہ دونوں چوبی منقش صندوق اور ان میں رکھے ہوئے زنجباری ٹکٹ ہر روز ایک سوال بن کر سامنے آجاتے۔ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بات فضل الرحمان کی شگفتہ یادوں پر ختم ہو جاتی۔ بالآخر ایک دن فضل الرحمان کا خط آگیا۔ اس میں لکھا تھا کہ بیرونی طلبا کو نسبتاً محفوظ علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور انہیں ریڈنگ کے قصبہ میں بھیج دیا گیا ہے۔ جنگ کا کوئی بھروسہ نہیں البتہ موت کا بھروسہ ہے کیونکہ اس کا ایک دن معین ہے لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ وہ جس تجربہ سے گذر رہے ہیں وہ بیان میں نہیں آسکتا۔ ان کی دو تین رہائشی عمارتیں بمباری سے منہدم ہو چکی ہیں۔ سردیوں کی برفانی راتیں کبھی جھاڑیوں میں دبک کر گذاری ہیں کبھی پبلک عمارتوں کے برآمدے میں فرش پر سوتے رہے ہیں۔ اس خط کے

بعد پھر طویل خاموشی کا وقفہ آ گیا۔ جنگ جاری تھی، بم بارش کے قطروں کی طرح آسمان سے گرتے اور آتش فشاں کی طرح زمین پر پھٹتے رہے۔ جنگ عظیم اور عالمی تھی اس لئے لوگ ملکوں ملکوں علی الحساب مرتے رہے۔ رونے والے کس کو میسر، نوحہ گر کس کا مقدور، لاشیں اٹھانے بلکہ گننے والے بھی نہیں ملتے تھے۔

جنگ کا زور ٹوٹا، جیتنے والے جیت گئے، ہارنے والے ہار گئے، مرنے والے مرکھپ گئے۔ جو ملک جنگ میں شریک تھے یا اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے وہاں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہو جس نے زندگی معمول کے مطابق بسر کی ہو۔ زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا تھا اس لئے معمول پر رہنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ فضل الرحمان تنہا اور بے یار و مددگار تھے۔ پنشن قلیل تھی اور جنگ کے دوران اس کا ہر ماہ زنجبار سے انگلستان پہنچنا ناممکن تھا۔ جو رقم لے کر گئے تھے وہ امن کے سستے دنوں کے حساب سے کافی تھی مگر ایک طویل جنگ اور اس کی لائی ہوئی مہنگائی کے سامنے آخر کتنی دیر ٹھہر سکتی تھی۔ جنگ کی وجہ سے عام شہری کی حیثیت سے کام ملنا بہت دشوار تھا اور اگر لام پر چلے جائیں تو انگلستان آنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا تھا۔ ان دشواریوں کے باوجود فضل الرحمان نے اپنی زندگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ سال بہ سال تعلیم جاری رہی، درجہ بدرجہ اگلی جماعتوں میں داخلہ ملتا رہا، سرٹیفکیٹ سے ڈپلومہ اور ڈپلومہ سے ڈگری تک پہنچ گئے۔ جن دنوں جاپانیوں نے ہتھیار ڈالے اور جنگ دونوں محاذوں پر اپنے انجام کو پہنچی فضل الرحمان ان دنوں ریڈنگ یونیورسٹی میں فلسفہ کے مضمون میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ یہ خبر علیگڑھ پہنچی۔ وہاں فضل الرحمان کو جاننے والے صرف پانچ چھ اشخاص رہ گئے تھے۔ ہر ایک نے آفرین بھیجی۔ سب متفق کہ وہ اپنی ذات میں فضل الرحمان کی طرح زندگی بسر کرنے کی جرات نہیں پاتے۔ ایسی زندگی

تو صرف وہ لوگ بسر کر سکتے ہیں جو اسے بار بار داؤ پر لگانے کے لئے تیار ہوں خواہ ہر بار عمر بھر کی کمائی کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو یا جان سے جانے کا خطرہ۔ یہ بات عام آدمی کے بس کی نہیں۔

فضل الرحمان کے صندوق اور ان کے ٹکٹ کب سے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ دو سال کے لئے امانت رکھ گئے تھے اور اب آٹھواں سال شروع ہو چکا تھا۔ آزادی کا دن نزدیک آ چکا تھا مگر ہندو مسلم فسادات کی شدت کی وجہ سے وہ اب بھی بہت دور لگتا۔ بدامنی کے دن تھے، سامان سے بھرا گھر کاٹنے کو دوڑتا اس لئے ہر ایک اپنا بوجھ ہلکا کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ہم سب فضل الرحمان کی واپسی کے لئے چشم براہ تھے۔ بالآخر ایک دن ان کا تار ملا وہ بمبئی پہنچ چکے تھے۔ دو چار دن بعد خط ملا کہ وہ دہلی سے گاڑی بدل کر سیدھے لاہور جا رہے ہیں۔ میں اور شیخ امتیاز ان سے ملنے کے لئے دہلی گئے۔ اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں ہم نے کتنی بار فضل الرحمان کے بے محابا قہقہے، چہار درویش قصے، سند بادی سفر اور بے تکان باتوں کو یاد کیا۔ فضل الرحمان کی بلند اور باریک آواز انجن کی سیٹی کی طرح ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ گاڑی اسٹیشن میں داخل ہو چکی تھی۔ اس وقت یہ خیال آیا کہ فضل الرحمان مجھے کتنا بدلا ہوا پائیں گے۔ جب وہ علیگڑھ میں داخلہ لینے آئے تو میں چھٹی جماعت میں تھا، اب میں ایم اے کا طالب علم ہوں۔

گاڑی رکی، بھیڑ چھٹی، گلے ملے اور دیر تک دونوں طرف خوشی کا اظہار خاموشی سے ہوتا رہا۔ پھر ڈاکٹر فضل الرحمان نے اپنا مختصر سامان خود اٹھایا اور مسافر خانہ کی طرف چل دیئے وہی روشن آنکھیں، وہی مسکراتا چہرہ، وہی گورے رنگ پر سرخی کی کشمیری لکیر۔ اس کے علاوہ سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ شوخی نہ طراری، نہ قصے نہ قہقہے، نہ شور و غل نہ بحث مباحثہ۔

بس مختصر جملے اور نرم مسکراہٹ۔ فرداً فرداً ہر ایک کی خیریت بظاہر اسی لاتعلقی سے دریافت کی جیسے کسی ناخواندہ کا خط لکھنے والا منشی سب کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہے۔ شیخ امتیاز سے نہ رہا گیا، بے اختیار ہو کر بولے، فضل الرحمان یہ تم کو کیا ہو گیا ہے، تھکے ہوئے ہو یا بدل گئے ہو۔ چھوڑو اس رسمی انداز کو اور اپنے اصلی رنگ میں آ جاؤ۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کہنے لگے، یہ جو آپ دیکھ رہے ہیں یہی میرا اصلی رنگ ہے۔ خوشنما اور دلفریب رنگ سب نظر کا دھوکہ ہے۔ رنگینیاں سب جعلی اور نقلی ہوتی ہیں۔ رنگ صرف دو ہیں، ایک سفید دوسرا سیاہ۔ ایک آسانی سے اترتا نہیں اور دوسرا آسانی سے چڑھتا نہیں۔ آپ مجھ سے مل کر مایوس تو نہیں ہوئے۔ میں وہی فضل الرحمان ہوں صرف رنگ کی تیزی لے کر واپس آیا ہوں۔ اگر جنگ نہ ہوتی تو ممکن ہے یہ فرق میری سمجھ میں نہ آتا۔ میں نے تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کو کئی برس بہت قریب سے دیکھا ہے۔ جتنی سیاہی جنگ کے بادلوں میں ہوتی ہے آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ جنگ کے اندھیرے گھپ اندھیرے ہوتے ہیں۔ لیکن جتنی تیز اور خیرہ کرنے والی سفید روشنی سخت آزمائش کے دنوں میں زندہ قوموں اور باکردار افراد کے طرزِ عمل سے پیدا ہوتی ہے آپ اس کی طرف آنکھ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ روشنی جب اتنی روشن ہو جاتی ہے کہ آپ اسے دیکھ بھی نہ سکیں تو اسے نور کہتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے، کہیں آپ مجھ سے مل کر صرف اس لئے مایوس تو نہیں ہوئے کہ میں اب کہکشاں کے رنگین جھولے پر جھولنے کو زندگی کا مقصد سمجھنے کے بجائے اس کا زیاں سمجھتا ہوں۔ بے مقصد زندگی ناشکری ہے، زندگی کا زیاں گناہ ہے میں گناہ سے بچنا چاہتا ہوں۔

ہم تینوں نے اسٹیشن پر اس کمرے میں کھانا کھایا جس کے باہر مسلم شرفا کی

طعام گاہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ کھانے کے دوران باتیں جنگ کے بارے میں ہوتی رہیں اور ڈاکٹر فضل الرحمان آہستہ آہستہ کھلتے گئے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ آپ بیتی اور آنکھوں دیکھا حال سنائیں مگر وہ تجربات کا ذکر کرنے کے بجائے ان کے تجزیہ میں مصروف رہے۔ ہم ان سے داستان گوئی اور قصہ خوانی کے خواہاں تھے مگر وہ تاریخ اور فلسفہ کی دنیا سے باہر نکلنے کے لئے تیار نہ تھے۔ کہنے لگے' میں نے قوموں کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا دیکھا ہے۔ مرگ انبوہ اور مرگ مفاجات کا منظر دیکھا ہے۔ ضروریات زندگی کا دن بدن کم ہونا اور نایاب جرأت کا روز بروز فراواں ہونا دیکھا ہے۔ میں نے جو خوبیاں دوسری قوموں میں دیکھی ہیں وہ اپنی قوم میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ خوبیاں راتوں رات پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کے لئے کئی نسلوں تک مسلسل کام کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے' مزید غور کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ جتنا سوچتا ہوں ہنسی اتنی کم ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ اونچا بولنا قوت کا اور بے مصرف بولنا مہلت کا غلط استعمال ہے۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ اب تو آپ ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہیں۔ مسعود میاں وہ جو میں آپ کو علم اور سفر کے بارے میں کہا کرتا تھا وہ نصیحت اب زیادہ اصرار کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دنیا جو میں نے تیسری دہائی میں پہلی بار دیکھی تھی وہ جنگ میں کھیت رہی۔ اب ایک نئی دنیا کی تعمیر کی امید ہے اور پرانی دنیا کے کھنڈر۔ ان کھنڈرات کی سیر کرو اور اس تعمیر میں حصہ لو۔ یہ اتفاق تو خوش نصیب نسلوں کو میسر آتا ہے۔

اس روز ریلوے اسٹیشن پر ہماری راہیں جدا ہو گئیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمان کی گاڑی ایک سمت روانہ ہوئی اور ہم دوسری سمت جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

اس کے بعد ان سے ملاقات بہت کم ہوئی اور جب ہوئی تو سرسری اور تشنہ۔ انہوں نے کئی برس فلسفہ پڑھایا اور پھر دوسری بار قبل از وقت پنشن لے لی۔ کراچی سے گجرات واپس آ گئے۔ اسی شاہدولہ کے محلہ میں جسے چالیس برس پہلے ایک جزیرہ کے سفر کے شوق میں چھوڑا تھا واپس آ کر بے سفر اور بے سیاحت لوگوں سے یوں گھل مل گئے کہ انہوں نے ڈاکٹر فضل الرحمان کو محلہ مسجد کمیٹی کا صدر چن لیا۔ نائب صدر شاہدولہ دروازے کے باہر عطاری کی دکان کرتے تھے اور جنرل سیکرٹری کی جوتوں کی دکان اندرون مسلم بازار واقع تھی۔ ڈاکٹر صاحب مسجد میں وعظ دینے لگے۔ ایک بار ملے تو کہنے لگے میں قوم کے لئے ایک اہم کام کرنا چاہتا ہوں آج کل اس کی تیاری کر رہا ہوں تفصیل پوچھی تو انتظار کرنے کے لئے کہا۔ سب انتظار کرتے رہ گئے اور سیلانی اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ اب کون اسے خبر کرے کہ جس چھوٹے سے بچے کے دل میں اس نے برسوں پہلے شوق کی آگ بھڑکائی تھی وہ خوش نصیب اور سفر نصیب نکلا۔ وہ آج بھی سفر میں ہے اور بہت خوش ہے۔ ایک صاحب السیر کی یاد آتی ہے تو مسافر یہ شعر پڑھتا اور سر دھنتا ہے

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

الحمدللہ